سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 1 شمارہ 3و4

جولائی تا دسمبر 2016

مدیر

فیضان حیدر

ادارہ تحقیقات اردو فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

سہ ماہی فیضانِ ادب جولائی تا دسمبر 2016 فیضان حیدر

ISSN 2456-4001

RNI No. UP/URD/05372

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. 1, Issue: III & IV, July to December 2016



سہ ماہی جریدے "فیضان ادب" کی رونمائی کے موقع کی ایک یادگاری تصویر ——— تصویر میں داہنے سے: ڈاکٹر قمر شعبان، پروفیسر اشفاق احمد، پروفیسر سید وزیر حسن، پروفیسر سید حسن عباس، پروفیسر نسیم احمد، ڈاکٹر محمد عقیل اور رسالے کے مدیر فیضان حیدر



تقریب کے موقع پر حاضرین کا ایک منظر

Editor

FAIZAN HAIDER

Printed, Published and owned by FAIZAN HAIDER and printed at Roshan Printers Delhi 110006, and Published at Purana Pura, Pura Maroof, Kurthijafar Pur Dist. Mau U.P. 275305

سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 1 شمارہ 3و4

جولائی تا دسمبر 2016

مدیر

فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو وفارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. I Issue: III & IV

July to December 2016

ISSN: 2456-4001

اس شمارے کی قیمت: 100روپے

زر سالانہ: 200روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے: 300روپے

خط وکتابت کا پتہ: ادارۂ تحقیقات اردو وفارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، یوپی 275305

موبائل نمبر (مدیر): +919455341072, +917388886628

ای۔میل: *faizaneadab@gmail.com, faizanhaider40@gmail.com*

Account No. 33588077649
IFSC: SBIN 0001671
Name: Faizan Haider
State Bank of India Branch: Maunath Bhanjan

چک یا ڈرافٹ پر صرف فیضان حیدر لکھیں۔

ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر فیضان حیدر نے روشان پرنٹرس لال کنواں، دہلی 110006 سے چھپوا کر ادارۂ تحقیقات اردو وفارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، یوپی 275305 سے شائع کیا۔

فہرست

تحقیق وتنقید

نقش ہائے رنگارنگ

قند مکرر

(اردو)

(فارسی)

تبصرہ وتعارف

مدیر کے قلم سے

آبروئے ابر یاں منظور ہے
آہ میں دامن نچوڑوں کس طرح

ہندوستان میں گزشتہ برسوں میں اردو کے سلسلے میں کچھ حالات سازگار ہوئے ہیں، اس لیے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے عام کیا جائے۔ ابتدائی اور ثانوی درجات تک اس کی تعلیم کو یقینی بنایا جائے اور اس کے لیے ادارے قائم کیے جائیں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کی تشکیل اور ترویج و ترقی انسانی ضروریات کے پیش نظر ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف زبان کی نشوونما ہوتی ہے بلکہ وہ قوم وملت اور سماج کی تعمیر و ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے ساتھ ہی اگر اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوجائے تو مخالفین کی تمام تر مخالفتوں اور حملوں کے باوجود شاہراہ ترقی پر گامزن نظر آتی ہے۔

اردو زبان جسے ہندوستان میں کبھی سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور روز بروز ترقی کے منازل طے کر کے بام عروج پر پہنچ گئی تھی آج آخری سانسیں لے رہی ہے۔ لکھنو، دہلی، عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدرآباد جو اردو کے گہوارے اور اسکول کہے جاتے تھے آج یہاں اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بعض اداروں میں اردو کے طلبہ تو درکنار اساتذہ کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کا املا اور تلفظ تک درست نہیں، لیکن ہمہ دانی کا تمغہ لیے پھرتے ہیں اور مٹھی بھر حوالیوں اور موالیوں میں اپنی قصیدہ خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔

کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ ایک پروفیسر یا استاد جس نے اپنی پوری عمر اردو کی روزی روٹی کھائی ہو وہ روزمرّہ اور عام بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ کے تلفظ سے ناآشنا ہو اور اس کی صحت پر توجہ نہ دے۔ اب وقت آچکا ہے کہ اردو دوست افراد ان کے خلاف آواز بلند کریں تاکہ حکومت کے عہدوں پر اہل افراد کی تقرری عمل میں آئے اور ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کو اردو کے عصری تقاضوں کی طرف مبذول کرایا جائے اور ان کی تکمیل کے لیے حکومتوں سے ممکن اقدامات کی درخواست کی جائے۔

ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ آج بھی ایسے اساتذہ، شعرا اور ادبا موجود ہیں جو دل و جان سے ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز ہو کر پرورش لوح و قلم، تخلیق اور تحقیق وتنقید میں مصروف ہیں۔ وہ اردو کی ترقی کے لیے ہمہ تن کوشاں ہیں اور اپنے خون جگر سے اسے سینچتے ہیں۔ ہم ان کی بے لوث خدمات کو سراہتے ہیں اور انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی امید بھی رکھتے ہیں کہ وہ اس شمع کو روشن رکھیں گے اور اس کی روشنی کو ماند نہیں پڑنے دیں گے۔

قارئین کرام! فیضان ادب کا یہ تیسرا اور چوتھا مشترک شمارہ ہے۔ اس شمارے میں اردو، فارسی اور عربی

زبان و ادب کے متعلق تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ تنوع اور ہمہ گیری بھی ہے۔ یہ شمارہ اپنے دامن میں درخشاں اقدار اور مضبوط و مستحکم روایات کا گنج گراں مایہ لیے ہوئے ہے۔ اس کی ترتیب بھی گزشتہ شمارے کی طرح ہے۔ اس میں پہلے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے بعد ''نقش ہائے رنگارنگ'' کے تحت ایک افسانہ، ایک طنزیہ تحریر، نفسیات کے متعلق ایک مضمون اور کملؔ سیتاپوری کی ایک نظم اور چند غزلیں شامل ہیں۔

اس کے بعد ''قندِ مکرر'' کے تحت اردو کے دو شعرا نوحؔ ناروی کی غزلیں اور عامرؔ عثمانی کی ایک نظم ''خواب جو بکھر گئے'' شامل ہیں اور فارسی کے تحت بیدلؔ دہلوی کی چار غزلیں اور عرفیؔ شیرازی کا ایک بلند آہنگ قصیدہ جریدے کی زینت ہیں۔ اس کا آخری حصہ کتابوں پر تبصرہ وتعارف سے مخصوص ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس جریدے نے اسی سال اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی سفر کا آغاز کیا اور آپ کی دعاؤں، نیک خواہشات اور نظرِ عنایت سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اس نے علم و ادب کے فروغ، قارئین کی آگہی اور تخلیق کاروں کی حریت فکر کا خاص خیال رکھا ہے لہٰذا آپ اپنے علمی و ادبی مضامین اور دیگر تخلیقات عنایت فرما کر اسے خوب سے خوب تر بنانے اور رفعت و اعتبار بخشنے میں تعاون فرمائیں۔

اچھے اور پرمغز مقالات کی ضرورت اور گنجائش ہمیشہ رہے گی۔ گزشتہ شمارے میں عرض کیا گیا تھا کہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین میں حوالوں کا خاص دھیان رکھا جائے۔ امید ہے کہ اس شمارے کے مضامین اور تخلیقات بھی باذوق قارئین کی توجہ کا مرکز قرار پائیں گے، ساتھ ہی ان کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کریں گے۔

فیضان حیدر

صفیر بلگرامی اور ان کا تذکرہ جلوۂ خضر

سید حسن عباس

قصبہ بلگرام اپنی قدامت اور علمی، ادبی اور تاریخی عظمت کے سبب برصغیر کی علمی دنیا میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور ہر دور میں نمایاں رہا ہے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (وفات ۲۴ ذی قعدہ/ ۱۲۰۰ھ) نے اسے ''دارالسلام'' (☆ سروِ آزاد، ص: ۲۶۵) کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں اور سید مرتضیٰ حسین زبیدی بلگرامی نے ''حدیقۃ الاقالیم'' میں اسے ''بلگرانو'' لکھا ہے۔ ''آرایش محفل'' میں، بلگرام کے بارے میں ''آئین اکبری'' کی عبارت جوں کی توں نقل کردی گئی ہے۔ ''صحف ابراہیم''، کے مولف علی ابراہیم خان خلیل نے لکھا ہے کہ ''وآن قصبہ رجال خیز است اکثر اربابِ کمال از آن جا برخاستہ اند'' (صحف، قلمی، ورق ۶۴)، مولانا آزاد بلگرامی نے بھی ملا نظام الدین سہالوی کے ترجمے میں ''مآثر الکرام'' میں اپنے وطن کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صوبہ اودھ محروسہ بلگرام از قدیم منشائے فضلائے کرام و مظہر علمای عظام است وفراوان دانشمند از این شہر برخاستہ و مجلس افادہ و استفادہ بہ کمالِ خوبی آراستہ''۔ (ص، ۲۲۳)

یہاں کے علما و ساداتِ کرام کی بزرگی کا اعتراف عالمگیر کے حاکم بلگرام کے نام کے فرمان میں بھی ہوا ہے۔ جسے صفیر بلگرامی نے ''تاریخ بلگرام'' (ص، ۳۳) میں یوں نقل کیا ہے:

''سادات کرام ذوی الاحترام چون چوب مسجد و ورقِ مصحف ناطق، نہ قابل سوختن نہ لائق فروختن''

میر عبدالجلیل بلگرامی (وفات ۱۱۳۸ھ) نے ''مثنوی امواج الخیال'' (سال تالیف ۱۰۹۳ھ) بلگرام کی تعریف میں کہی تھی جسے وہ مکمل نہ کرسکے تھے۔ ان کے بعد میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ''معراج الکمال'' (سال تالیف ۱۱۵۱ھ) کے نام سے اس کا تکملہ لکھا۔ صفیر بلگرامی نے میر عبدالجلیل بلگرامی کی مثنوی ''امواج الخیال'' کی تشریح اور تتبع میں ۱۱۴۱ اشعار کی مثنوی ''معراج الخیال'' لکھی۔ جس میں اپنے خاندان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۰۰ھ میں کہی گئی اور ''معراج خیال مجلس آرای'' اور ''مثنوی تفرید'' سے سال تالیف برآمد ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بلگرام کے کئی شعرا نے اپنے وطن کی تعریف میں غزلیں بھی کہی ہیں جن میں سے کچھ ''تاریخ بلگرام'' میں نقل ہوئی ہیں۔

بلگرام کے کچھ باکمال حضرات کے نام بغیر کسی ترتیب کے لکھے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے علمی کارناموں سے اس کی شہرت میں چار چاند لگائے ہیں۔ ایسے لوگوں میں میر عبدالجلیل بلگرامی، میر سید محمد شاعر بلگرامی، میر سید عبدالواحد بلگرامی، میر طفیل محمد بلگرامی، میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی، میر نوازش علی فقیر بلگرامی،

شیخ نظام الدین احمد صانع بلگرامی، محمد صدیق سخنور بلگرامی، میر محمد اولاد ذکآ بلگرامی، منشی ظہیر بلگرامی، سید امیر حیدر بلگرامی، سید برکت اللہ عشقی بلگرامی، سید غلام حسنین قدر بلگرامی (شاگرد غالب)، شاداں بلگرامی اور سید فرزند احمد صفیر بلگرامی وغیرہ۔

آزاد بلگرامی کے بقول، جس کی تائید صفیر بلگرامی نے بھی کی ہے، ساداتِ بلگرام کے مورث اعلی سید محمد صغریٰ (وفات ۱۴/ شعبان ۶۴۵ھ) نے سلطان شمس الدین التمش (وفات ۶۳۳ھ) کے زمانے میں بلگرام کو فتح کرکے یہاں بود و باش اختیار کی۔ فتح بلگرام کی تاریخ ''خداداد'' ہے۔ جس سے ۶۱۴ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ (☆صفیر بلگرامی نے سہواً جلوہ خضر ۲ میں ۱۶۶ھ لکھ دیا ہے) میر عبدالجلیل بلگرامی نے اپنے ایک قصیدے میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں:

ماییم نخلِ سبز ریاض پیمبری　　احسان ماست برہمہ از سایہ گستری
جد کان محمد صغریٰ کہ تیغ او (کذا)　　بر بلگرام یافتہ فتح و مظفری
مفتوح گشت در زمن سلطان التمش　　تاریخ آن ز لفظ 'خدا داد' بشمری
در سال شش صدو چھل و پنج فوت کرد　　آسود بر بساطِ معلای عبقری
شد بہ بلگرام مزارِ مبارکش　　بر مرقدش کنند ملایک مجاوری

جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کردوں کہ آزاد بلگرامی نے بھی اس زمین میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

مرحبا ای کعبۂ اشرف چہ والا گوہری
قیمتی داری کہ قربانِ تو گردد مشتری

اور صفیر بلگرامی کا بھی اسی زمین میں ایک قصیدہ ہے جس میں انھوں نے اپنے استادوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

ہستم صفیر گوہر بحرین عقل و دین　　و از سلسلہ مسلسل نسل پیمبری
زیبد مرا کہ ناز کنم بر عطای حق　　کو تا کجا رساند ز پاکیزہ گوہری
اوستادِ من بہ شیوہ اردو بُود سحرؔ　　کز ناسخؔ است یافتہ تمغای شاعری
در مرثیہ دبیرؔ بُود اوستادِ من　　مقبول کبریا شدہ از مدح حیدری
غالبؔ بُود ہنرور شعرم بہ پارسی　　کو ہست در زمانہ علم با ہنروری
از نثر و ہم ز نظم بسی قسم قسم را　　دادم ز کلکِ خویش نگارش بہ زیوری

(میلاد معصومینؑ، ص الف؛ دبستان دبیر، ص، ۲۰۲؛ دربار حسین، ص، ۶۱)

لیکن غلام حسین صدیقی ثمین بلگرامی نے ''شرایف عثمانی'' میں دعوا کیا ہے کہ بلگرام کو ان کے اسلاف نے ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴ء میں آباد کیا تھا جو محمود غزنوی کی رفاقت و ہم رکابی میں یہاں آئے تھے اور اس کا نام ''سری

نگر'' سے تبدیل کر کے جو راجا سری رام کے نام پر تھا، بلگرام رکھا۔

مسلمان رسیدہ بہ ہندوستان ز قومان ہمی بود صدیقیان
ز چار صد و خمس ہجری تمام سری نگر را نام شد، بلگرام

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی بھی جن کا تاریخی نام غلام حسنین، ان کے نانا نے رکھا تھا (جلوہ ۲/ ۳۲۶) اپنے عہد کی نامور ادبی شخصیت کے طور پر تاریخ ادب اردو میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ وہ صاحب دیوان تھے۔ ان کا شمار استاد شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ کثیر التصانیف تو تھے ہی، شاگردوں کی بھی کثیر تعداد ان سے فیض یاب ہوتی تھی۔ ان کے شاگردوں کا ایک تذکرہ ''مرقع فیض'' مشہور ہے۔ جس میں ۶۱/ شاگردوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی شاگرد تھے، خاص کر فخر الدین سخنؔ اور سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی جیسے صف اول کے شعرا بھی صفیر کے دامن فیض سے مستفید ہونے کے بعد صفیر کی شاگردی سے انکار کر بیٹھے، ان کے انکار نے ادبی دنیا میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ جس کی تفصیل اس عہد کے اخبارات و رسائل میں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں وصی احمد بلگرامی نبیرہ صفیر بلگرامی کا مشہور مقالہ، س، ش، ص، اور اس کے جواب میں حمیدؔ عظیم آبادی شاگرد شادؔ اور دیگر حضرات کی تحریریں قابل مطالعہ ہیں۔ صفیرؔ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ دہلی جا کر انھوں نے مرزا غالبؔ سے ملاقات کی تھی اور دونوں کے درمیان مراسلت بھی تھی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا صفیر کا شمار اپنے وقت کے استاد شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ اردو اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کی تصانیف میں ''تذکرہ جلوہ خضر'' اور ''تاریخ بلگرام'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ادب و تاریخ میں خاص اہمیت کی حامل ہیں لیکن وہ جس مقام و مرتبے کے مستحق تھے، حق تو یہ ہے کہ وہ اس سے محروم ہی رہے۔

صفیرؔ احمد بلگرامی ایک علمی خانوادے میں ۲۷/ ذیقعدہ ۱۲۴۹ھ/ ۷/ اپریل ۱۸۳۴ء کو اپنی ننیہال مارہرہ میں پیدا ہوئے، لیکن نقل مکانی کر کے آرہ (بہار) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''۱۲۴۹ھ میں میری ولادت مقام مارہرہ ضلع ایٹہ میں ہوئی اور پانچ برس کی عمر میں بلگرام ہوتا ہوا والدین کے ساتھ قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد میں آیا اور چودہ برس کی عمر میں مجھے شعر و سخن کا شوق ہوا''۔ (جلوہ خضر، حصہ اول، ص، ۲)

لیکن لالہ سری رام مولف ''خمخانۂ جاوید'' (۵/ ۲۳۹) نے صفیرؔ کی شعر گوئی کے شوق کی بابت لکھا ہے کہ پندرہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق دامن گیر ہوا۔ اسی طرح لالہ جی نے صفیرؔ کے معروف تذکرے ''جلوہ خضر'' کا نام نادرست، ''جلوہ اختران'' درج کیا ہے۔

صفیرؔ کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جہاں شعر و ادب کا چرچا عام تھا اور اکثر افراد خانوادہ شاعر و ادیب بھی تھے۔ صفیرؔ نے اپنے خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میرا خاندان سلسلہ وار صاحب علم و شاعر گذرا ہے۔ سید خورشید علی خورشید تخلص میرے پردادا کے والد اور سید بندہ علی بندہؔ میرے پردادا، سید غلام یحییٰ یحییٰ تخلص میرے دادا، حضرت صاحب عالم میرے نانا، یہ سب کے سب فارسی کہنے والے اور بڑے بلند خیال تھے''۔ (جلوہ ۱/ ۲۱۹)

سید خورشید علی بلگرامی (۱۱۵۹۔۱۲۰۱ھ) نے میر عبدالجلیل بلگرامی (وفات ۱۱۳۸ھ) کے فرزند اور میر غلام علی آزادؔ بلگرامی کے ماموں سید محمد شاعر بلگرامی (وفات ۱۱۸۵ھ) صاحب ''تبصرۃ الناظرین'' سے تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں پہلے صانعؔ بلگرامی اور سخنورؔ بلگرامی سے مشورہ سخن کیا۔ اس وقت فصاحت تخلص تھا۔ جب بذریعہ خط و کتابت آزادؔ بلگرامی سے جو اورنگ آباد میں مقیم تھے، شرف تلمذ حاصل کیا تو انھوں نے تخلص بدل کر خورشیدؔ کر دیا۔ خورشید نے شیخ علی حزیں لاہیجانی (وفات ۱۱۸۰ھ) سے بھی اکتساب معنوی کیا تھا۔ درج ذیل اشعار میں اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

واجب و فرض بُود مدح جناب شاعرؔ ‏ ‏ ‏ ‏ که بُود قبله و اوستاد همه دان مارا
هم حق تربیت حضرت صانعؔ، خورشیدؔ ‏ ‏ ‏ ‏ هست بسیار که او کرد سخندان مارا
مستفیض ار چه ز هر بزم سخنور گشتم ‏ ‏ ‏ ‏ زین دو اوستاد بُود فیض فراوان مارا

☆☆☆

سیر دیوان حزیںؔ طاب ثراه ای خورشیدؔ ‏ ‏ ‏ ‏ بی سخن دان که سخن گوی و سخندان کردم

(جلوہ/ ۱۵۴)

سید بندہ علی بندہؔ بلگرامی (وفات ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۸ء) بھی شاعر اور نثر نویس تھے۔ ۱۲۲۳ھ میں حیدر آباد جا کر سرکار نظام کے سفیر اور فوج شاہی کے میر بخشی ہوئے۔ صفیر لکھتے ہیں کہ جناب ممدوح کو نثر میں ید طولی حاصل تھا۔ بڑے بڑے مطالب کو روز مرّہ میں اس طرح لکھتے تھے کہ انکشاف حال بخوبی ہو جاتا تھا، صفیر نے ان کے چند فارسی اشعار بھی درج کیے ہیں۔ (جلوہ ۱/ ۱۰۵ حاشیہ)

صفیر کے دادا سید غلام یحییٰ بھی ملک دکن گئے تھے۔ لیکن جس وقت ان کے والد سید بندہ علی نے حیدر آباد میں وفات پائی، وہ آرہ میں تھے اور صفیر کی عمر پانچ برس کی تھی۔ یہ بھی شاعر اور نثر عاری میں مہارت رکھتے تھے۔ میر امامیؔ بلگرامی کے ہم عمر اور چچا زاد بھائی تھے۔ صفیرؔ نے ان کا نمونہ کلام بھی دیا ہے۔ (جلوہ ۱، ۱۰۶ حاشیہ) ان کے والد سید احمد بھی دکن گئے تھے اور وہاں برسوں مقیم رہے اور مناصب عالی سے سرفراز رہے۔ (جلوہ ۱/ ۱۰۶)

ان تفصیلات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ صفیر بلگرامی کا تعلق ایک ذی علم خانوادے سے تھا، جس کے افراد علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے لہذا ایسے علمی گھرانے کا پروردہ فطری طور پر علم و ادب کا شائق ہوگا۔ صفیر کا یہ بیان قابل توجہ ہے:

> ''میرے گھر عربی، فارسی، اردو سب کا ذخیرہ موجود تھا اور میرے بزرگ سب اپنے زمانے کے یکتا تصور کیے جاتے تھے۔ ان کی صحبت اور ذخیرہ کی کثرت نے مجھے اچھی طرح اس راہ کے چلنے میں مدد دی اور بہت جلد منزل مقصود تک پہنچایا''۔ (جلوہ ۱/ ۲)

کثرت مطالعہ سے ان میں دو ایسی صفات پیدا ہو گئیں جن کی مدد سے وہ علم و ادب کے وسیع و عریض

میدان میں تحقیق وتفتیش کے نت نئے پہلوؤں پر توجہ دینے لگے۔اس سلسلے میں ان کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

''دو باتیں مجھ میں ایسی آ گئیں یا یہ میری جبلت تھی کہ کسی کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھنا اور حتیٰ الوسع تحقیق میں کوشش کرنا۔ ان دونوں باتوں نے آنکھوں کے آگے سے پردے اٹھا دیئے یعنی پہلی بات کے سبب ہر ایک کا کلام بہ نظرِ عظمت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کیوں کہ میں (نے اپنے) آپ کو ہر ایک کا زلہ ربا سمجھا''۔

دوسری بات میں نے ان کے کلام سے جو کچھ حاصل کیا اس کو حافظہ میں محفوظ رکھا اور جس میں شک ہوا اس نے دوسری کتابوں کے دیکھنے کی طرف متوجہ کر دیا جس کے سبب سے شوق کا درجہ ایسا بڑھا کہ جمیع علوم و فنون کی کتابوں کے مطالعہ پر آمادہ کر دیا۔آخر:

تمتع ز ہر گوشہ ای یافتم   ز ہر خرمنی خوشہ ای یافتم

(جلوہ ۱/ ۳)

صفیؔر اپنے فن کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا اصل فن، شاعری ہے لیکن غیر شاعر سے انھیں کوئی تعرض نہیں لیکن اپنوں سے ضرور شکایت تھی۔ لکھتے ہیں:

''میرا فن اگرچہ شاعری ہے مگر کسی غیر شاعر سے مجھ سے لڑائی نہیں ہوئی اور ہوئی تو اپنوں سے۔آخر یہ سمجھ کر چپ رہنا پڑا کہ نہ ہو جس کو علاقہ کچھ تو پھر اس کی عداوت کیا:

''ہمیشہ دشمن جاں آشنا ہوتے ہوئے دیکھا''

میرا خیال ہے کہ یہ اشارہ سخنؔ اور شادؔ کی طرف ہوگا جنھوں نے صفیؔر کی شاگردی سے انکار کر دیا تھا۔

صفیر نے شاعری میں چار اساتذہ سے مشورہ سخن کیا تھا جن کے مختصر احوال انھوں نے جلوۂ خضر (۲/ ۲۱۲) میں لکھے ہیں۔ان اساتذہ کے طریق اصلاح کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۱) **خبر بلگرامی:** سید محمد مہدی ولد سید محمد عسکری خبرؔ بلگرامی، صفیؔر کے پھوپھا تھے۔ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ ابتدائی زمانے کی شاعری میں صفیر نے ان ہی سے مشورہ کیا تھا۔ جب وہ ملازمت کے سلسلے میں بھاگلپور چلے گئے تو پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔خبر نے بھاگلپور میں ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۲) صفیر کے دوسرے استاد شیخ امان علی **سحر لکھنوی** شاگرد ناسخؔ تھے۔صفیر نے وہ غزلیں بھی درج کی ہیں جن پر سحر کی اصلاح تھی۔ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اکثر اپنی زمینوں پر غزلیں کہلواتے تھے اور شاگرد کو ہر مقام اور موقع پر ساتھ رکھتے تھے۔آدمی بے تکلف تھے۔شاگرد کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے تھے۔خدا مغفرت کرے بہت شفقت سے میری تعلیم کی''۔(جلوہ ۲/ ۲۱۵)

(۳) تیسرے استاد مشہور مرثیہ گو مرزا سلامت علی **دبیر لکھنوی** تھے۔صفیر نے مرثیہ اور رباعی پر ان سے اصلاح لی اور ان سے ملاقات نیز اصلاح کے طریقے کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔وہ مرزا دبیرؔ کی شاگردی کو اپنے لیے

مایہ افتخار سمجھتے تھے۔مرزا صاحب کی وسعت معلومات پر تبصرہ کرتے ہوئے صفیؔر نے لکھا ہے کہ میں نے اس پائے کا حاضر جواب شاعر نہیں دیکھا۔ان کے مرثیوں کو آنکھ والا دیکھے کہ جواہرات کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ میں کیا ہوں جو ان کی قدر کروں گا۔اہل علم سے داد ملتی ہے۔مگر ہاں! ان کی تقلید کے لیے علم درکار ہے۔

(جلوہ ۲/ ۲۱۵۔۲۱۶)

(۴) صفیر کے چوتھے استاد، نادرۂ روزگار شاعر و نثار مرزا **غالبؔ** دہلوی تھے۔جن سے شرفِ تلمذ کا حال صفیر نے جلوۂ خضر (جلد اول، ص، ۲۲۱) میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔مرزا صاحب سے صفیؔر نے اپنے رسالہ ''فیض صفیر'' (دربارۂ تذکیر و تانیث) پر بھی اصلاح لی تھی اور غالبؔ نے اس کی تقریظ بھی لکھی تھی جو 'عود ہندی' میں شامل ہے۔ غالبؔ اور صفیؔر کے درمیان مراسلت بھی تھی۔ اپنے خطوط، صفیؔر نے جلوہ خضر میں نقل کر دیئے ہیں۔مرزا غالبؔ کے بارے میں صفیؔر کی رائے بہت متوازن ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ وہ خوش مذاق شخص گذرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا۔میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا۔اول: امیر خسرؔو، دوم: حسنؔ دہلوی، سوم: مرزا بیدلؔ، چہارم: مرزا غالبؔ۔اگرچہ ناصر علی سرہندؔی اور مرزا جانجاناں مظہر اور غنیؔ کشمیری اور غنیمت اور خان آرزؔو، آزادؔ بلگرامی اور میر امامیؔ بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد یہ سب کے سب خوشگو اور شاعر بے بدل تھے۔مگر جامہ ایجاد جو خداداد ہے، انھیں چاروں کے راست قامت پر راست آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں ان پر ہی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں، مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تو خدا کی دین ہے ..... غرض میرے نزدیک آغاز امیر خسرؔو سے ہوا اور انجام غالبؔ دہلوی پر ہوا۔ ہندوستان کی فارسی کا کہ شمس الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرز خاص سلاست آمیز شروع ہوا تھا، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی ہمت کر کے فارسی کو پھر ولایت کی کرسی پر بٹھایا۔ان کے کلام سے ظاہر ہے اور نظم بھی ایک طور خاص کی کہی۔اس میں بھی ایجاد خاص ہے''۔(جلوہ ۱/ ۲۱۸)

صفیؔر فن شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ہر صنف سخن میں کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کی پرگوئی اور زودگوئی اظہر من الشّمس ہے۔فن شاعری کے تمام اسرار و رموز پر حاوی تھے اور یہ ان کی اپنی محنت، مطالعہ نیز ان کے بزرگوں اور اساتذہ کے فیوض و برکات کا نتیجہ اور مبدا فیاض کی نعمتوں کی ارزانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔وہ کس بلا کے ذہین شاعر تھے اور ان کی طبیعت میں کیسی روانی اور بیان میں کیسی سلالت پائی جاتی ہے، وہ ان کے کلام کے مطالعہ سے روشن ہے۔اس کا احساس انھیں بھی تھا جب ہی تو ایک مسدس میں جس کا مطلع ہی یہ ہے:

''کہاں ہیں آفاق کے سخنور سخن طرازی کا ڈھنگ دیکھیں''

اپنی بے مثال سخن طرازی کو ثنائے آل عبا کے سبب سرمایہ افتخار بتایا ہے۔

یہ نعمت بے مثال مجھ کو اگرچہ رب ہدیٰ نے بخشی
مگر جِلا اس کو ہر طرح سے ثنائے آل عبا نے بخشی
ملا یہ درجہ تو اور طاقت عروجِ ذہن و ذکا نے بخشی
مگر اسی کے لیے طبیعت مجھے تھی ایسی خدا نے بخشی
جِلا لیا صورت مسیحا بہ فضل حق اس جِلا نے مجھ کو
کہاں پہ پہنچا دیا ہے آخر عروجِ طبع رسا نے مجھ کو

افسوس کہ ان کا سارا سرمایہ علم و ادب انتشار و پراگندگی کا شکار ہو گیا اور جو کچھ باقی بچا ہے وہ ایک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ سب بھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ اگر ان کا تمام سرمایۂ شعر و ادب یکجا ہو جاتا تو اردو کا شاید ہی کوئی ادیب و شاعر ان کی برابری کر سکتا۔

تذکرۂ جلوہ خضر

یہ صفیرؔ بلگرامی کی سب سے اہم کتاب ہے۔ یہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو محمد حسین آزاد کی تالیف ''آب حیات'' (سال تکمیل و طبع اول ۱۸۸۰ء) کے بعد تالیف ہوا ہے۔ جس طرح بہت سی اصناف شعر و ادب فارسی سے اردو میں رائج ہوئی ہیں، اسی طرح تذکرہ نویسی کا فن بھی اردو میں فارسی کے زیر اثر وجود میں آیا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شعرا کے اکثر و بیشتر قدیم تذکرے نہ صرف یہ کہ فارسی زبان میں لکھے گئے بلکہ ان کا طرز و طریقہ بھی فارسی تذکروں جیسا ہی ہے جن میں سیرت اور سوانح پر تو کافی کچھ مواد مل جاتا ہے لیکن شعرا کے کلام پر نقد و نظر کی کمی نظر آتی ہے اور اگر کہیں تنقیدی عناصر ہیں بھی تو انھیں تذکرہ نویس کی ذاتی پسند و ناپسند، رشک و رقابت، معاصرانہ و معاندانہ چشمکوں کے نتائج قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی حال انتخابِ اشعار کا بھی ہے جس میں تذکرہ نویس کی اپنی پسند و ناپسند کا دخل ہوتا ہے۔

''آب حیات'' کو اردو کا سب سے جامع اور کامیاب تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ مصنف کی وسعت معلومات، مخصوص انشا پردازی اور ناقدانہ شعور و اسلوب ہے جس نے اس کتاب کو جداگانہ شناخت عطا کی ہے۔ صفیرؔ بلگرامی نے بھی اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے اور اپنے تذکرے کے لیے اسے ماڈل بھی بنایا ہے۔ اپنی کتاب ''جلوۂ خضر'' کے سبب تالیف میں سب سے پہلے انھوں نے فن تذکرہ نویسی سے اپنے شوق اور اس باب میں اپنی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سید فرزند احمد صفیر حسینی واسطیؔ بلگرامی شاگرد سحرؔ لکھنوی و دبیرؔ لکھنوی و غالبؔ دہلوی عرض کرتا ہے کہ ابتدائے شعور سے عاصی کو شوقِ شعر و سخن ایسا دامن گیر ہوا کہ آج تک (۱۳۰۱ھ۔ ۱۸۸۸ء)، اسی کام میں عمر عزیز کو صرف کیا۔ شعرا کے تذکرے بھی میں نے کئی شروع کئے، مگر ناتمام رہے۔ (جلوۂ خضر ۱/ ۳)

صفیرؔ کے پیش نظر قدیم تذکرے بھی تھے جن کا طور انھیں پسند نہیں تھا لیکن جب منشی کریم الدین دہلوی کا تذکرہ دیکھا تو اس کا طرز انھیں پسند آیا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ابتدائی تذکرے تو ایشیائی ڈھنگ کے تھے مگر پندرہ برس کے زمانے سے بطور یورپ تذکرہ لکھنے کا ارادہ ہوا کیوں کہ منشی کریم دہلوی کا تذکرہ اردو جس کو ڈاکٹر فیلن صاحب بہادر کی فرمائش سے انھوں نے لکھا تھا، جب میں نے دیکھا تو اپنے ایشیائی تذکروں کی وضع سے فرق پایا اور اس تذکرے کا ڈھنگ پسند آیا۔ یعنی منشی کریم الدین نے ابتدا تحریر اردو سے اپنے وقت تک پانچ طبقوں پر اس کو تقسیم کیا ہے اور ہر طبقے سے دوسرے کی زبان کا فرق دکھایا ہے۔ میں نے چاہا کہ پانچویں طبقہ کے بعد جو تبدیلیاں زبان اور کلام شعرا میں واقع ہوئی ہیں اس کو اپنے وقت تک لکھ کر دکھا دوں۔'' (ص، ۳)

اسی طرح جب مولانا محمد حسین آزادؔ کا تذکرہ ''آب حیات'' شائع ہو کر آیا اور صفیرؔ نے جب اسے ملاحظہ کیا تو اسے منشی کریم الدین کے تذکرے کے طرز کا پایا۔ آزاد نے بھی ''آب حیات'' میں پانچ حصے رکھے ہیں جسے انھوں نے دور قرار دیا ہے۔ لیکن صفیر کے خیال میں:

> ''انکشاف حالات و واقعات و کیفیات شعرا میں اور بہت سی باتوں میں جدت کی ہے۔ جس کی وضع مجھے کیا سب کو مطبوع اور پسند ہوئی۔ مگر وہی پانچ طبقوں پر اختتام ہو جانے کے سبب سے بعد کے شعرا کی حق تلفی پائی گئی''۔ (جلوہ ۱/ ۴)

صفیرؔ کو مذکورہ دونوں تذکروں میں پانچ طبقات ادوار کے بعد کے شعرا کے احوال اور زبان اردو کی روز بہ روز ترقی اور تبدیلیوں کا ذکر نہ ہونا، ان شعرا کی حق تلفی کے مترادف نظر آیا۔ اس بارے میں ان کا یہ خیال ملاحظہ ہو:

> ''میں نے چاہا کہ پانچویں طبقے کے بعد جو تبدیلیاں زبان اور کلام شعرا میں واقع ہوئی ہیں اس کو اپنے وقت تک میں لکھ کر دکھا دوں۔ چنانچہ ایک تذکرہ میں نے شروع کیا مگر وہ بھی ناتمام رہا۔ آخر ایک مرتبہ جی میں آیا کہ جن شعرا سے ملاقات ہے ان کا تذکرہ لکھا جائے اور اس میں القاب و آداب کے طریق سے جو مروجۂ زمانہ ہے، انحراف کر کے ان کے پورے حال اور اپنی ملاقات کی کیفیت کو لکھ کر وسعت دی جائے اور اس تذکرہ کا نام ''مردم دیدہ'' رکھا جائے چنانچہ وہ تذکرہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن رہ گیا..... آج پانچواں برس ہے کہ تذکرہ آب حیات مولفہ مولوی محمد حسین آزاد۔۔۔پہلی بار چھپ کر شائع ہوا اور میرے ایک عزیز نے لا کر مجھے دیا۔۔۔دیکھا تو وہی منشی کریم الدین کے تذکرے کا پرتو ہے..... میری طبیعت نے پھر جوش کیا اور چاہا کہ ان کے آغاز کو اپنے وقت تک انجام کو پہنچا دوں۔ آخر اس ارادے نے استحکام پیدا کیا اور ایک تذکرہ پانچویں دور کے بعد کے شعرا کا لکھنا شروع کیا اور جلوہ خضر اس کا نام رکھا''۔ (جلوہ ۱/ ۴)

صفیرؔ نے آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب جلوہ خضر کو دوبارہ ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ تا صفر ۱۳۰۱ھ میں مکمل کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ پہلے اس تذکرے کو دو حصوں، حصہ اول نظم اور حصہ دوم نثر کے لیے مخصوص کیا گیا تھا لیکن جب

دہلی کی زبان کی بحث بہت طویل ہوگئی تو حصہ اول کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصہ زبان دہلی کے سلسلے میں اور دوسرا حصہ زبان لکھنؤ کی بحث میں۔ یہاں پھر مواد و مطالب کی زیادتی کے سبب دقت پیش آئی تو پہلی جلد میں پانچ اور دوسری جلد میں تین جلوے رکھے اور تیسری جلد خاتمے کے لیے مخصوص کی گئی۔ جلوہ خضر جلد اول نظم اردو کا حصہ اول متعلق کیفیتِ زبانِ شعرائے زبان دہلی، مطبع نور الانوار، آرہ (بہار) سے سید محمد ہاشم کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۳۰۲/ ۱۸۸۵ء میں ڈھائی سو کی تعداد میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کے شروع میں دو صفحات میں قطعات تاریخی ہیں۔ چھ صفحات میں غلط نامہ ہے۔ بارہ صفحات میں فہرست مضامین جلد اول ہے۔ دیباچہ میں کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے پھر لکھتے ہیں:

''چوں کہ یہ تذکرہ زبان اردو کی تاریخ ہے اس لیے خاص اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ اردو کی حقیقت بدون اس کے کہ سلاطین غیر ملک کے آنے کی کیفیت لکھی جائی اور جس جس ملک کی زبان آکر اس میں ملی ہے اس کے آنے کا سنہ اور زمانہ بتایا جائے اور پھر ان کی زبانوں کے میل جول نے زبان ہندی پر کیا اثر پیدا کیا اور ان سے یہ زبان اردو جو پیدا ہوگئی اس نے آج تک کتنی شکلیں بدلیں اس کی تمیز کے لیے الفاظ نہ لکھے جائیں تب تک پوری حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں نے اس میں بہت اہتمام کیا اور طرز دلچسپ میں اس کو لکھنا شروع کیا اور بہت مختصر طور پر تمام کیا اور اس کے دو حصے کیے **حصہ اول:** اردو زبان کی نظم کی حقیقت میں۔ **حصہ دُوم:** زبان نثر کی کیفیت میں''۔ (جلوہ ۱/ ۵ دیباچہ)

صفیرؔ بلگرامی نے ''آب حیات'' کے تتبع میں ''جلوہ خضر'' لکھنا شروع کیا۔ جس طرح آزاد نے ''آب حیات'' میں پانچ ادوار قائم کیے ہیں اسی طرح صفیر نے بھی پانچ جلوے اور پانچویں جلوے میں آٹھ کمیٹیاں قائم کر کے ہر دور کی زبان اور شاعری کا ذکر کیا ہے۔ وہ آزاد سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں، جب ہی انھوں نے لکھا ہے کہ آزادؔ نے تذکرہ نہیں لکھا ہے مورخی کی داد دی ہے (جلوہ ۲/ ۳۴)۔ خود اپنے بارے میں بھی اسی قسم کا جملہ لکھتے ہیں:

''میں اردو کی تاریخ لکھتا ہوں، خالی تذکرہ نہیں ہے کہ معمولی طور سے شعرا کی مجلس جا بہ جا جمادوں اور ان کا کچھ حال جھوٹ سچ بنا کر شعروں کی بھر مار کردوں''۔ (جلوہ ۲/ ۲۲۶)

قدیم تذکروں کی مانند صفیرؔ نے بھی اپنے منابع اور مصادر کا ذکر جا بہ جا کیا ہے جسے یہاں یکجا طور پر درج کیا جا رہا ہے۔

آب حیات ...... آداب انگلستان (مولوی اولاد علی لندنی) ...... آئین اکبری .. آئینہ تاریخ نما ...... انشائے جلیل ...... بیاض پارینہ ...... بیاض کاظم بلگرامی ...... تبصرۃ الناظرین ...... تذکرۂ حب الوطن ...... تذکرہ طور کلیم ...... تذکرہ قدرت اللہ قاسم ،تزک جہانگیری ...... دریائے لطافت ...... دھرم شاستر ...... دہ مجلس فضلی ...... رسالہ صرف ونحو اردو (صہبائی) ...... رسالہ لغت اردو (خان آرزو) ...... سخن شعرا ...... سرو آزاد .... سفرنامہ فج ...... ظہیر الانشا ...... قیصر التواریخ ...... کچھ بیاں

اپنی زبان کا (راجہ شیو پرشاد) ...... گلستان سخن ...... گلشن بے خار ...... محشرستان خیال ...... منتخب التواریخ .. مینا بازار ...... نشتر عشق ...... نکات الشعرا ...... وقایع نعمت خان عالی ...... مختلف شعرا کے دواوین۔

انقلاب زمان وزبان کے باب میں اردو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عرب وعجم کے اختلاط سے جو زبان پیدا ہوئی اس کا نام پہلے ریختہ، پھر اردو اور آخر میں ہندوستانی قرار پایا۔

زبان اردو کے اقبال وادبار کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سرکار نے تو اردو کی قدردانی کی مگر ہم نے خود کھو دیا۔ انگریزوں کی جانب سے اردو کی طرف توجہ اور جان گل کرائسٹ کی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی توجہ سے اردو قواعد تیار ہوئی۔ لیکن انشا اللہ خان انشا کی ''دریائے لطافت'' کو اول جلول بتایا ہے لکھتے ہیں:

''جیسے وہ خود اول جلول تھے کتاب بھی ویسی ہی اول جلول ہے۔ دلی کو مختلف زبانوں کا ایک مجموعہ ثابت کیا ہے۔ ہر محلہ کی ایک زبان خاص ہے اور محاورات کا اختلاف اب کوئی کس زبان کو دلی کی خاص زبان سمجھے اور کس کی تقلید کرے اور کس کو سیکھے''۔ (ص،۱۰)

آگے چل کر ہندوستان کی اصلی زبان کا حال بیان کیا ہے اور سنسکرت کو یہاں کی اصل زبان بتایا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی زبانوں کی ایک فہرست بھی دے دی ہے اور اس خیال کی تردید کی ہے کہ ہندوستان کی سب زبانیں جن میں اردو کو بھی شامل کیا گیا ہے، سنسکرت سے نکلتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''مولف کہتا ہے کہ اہل تحقیق نے ان سب زبانوں کی جو تحقیق کی تو سنسکرت سے نکلی ہوں گی مگر نمبر دوم کی زبان یعنی اردو کو (مذکورہ فہرست میں اردو کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے) جو اس میں شامل کیا یہ بے اصل ہے۔ کیوں کہ اردو وہ زبان ہے جو مسلمانوں کی آمد سے ہر جگہ کی زبان میں مسلمانوں کے الفاظ عربی، فارسی، ترکی کے ملنے سے خود بہ خود پیدا ہوئی۔ بیشک یہ زبان خودرو ہے۔ کسی زبان سے نکلی نہیں، بلکہ جس طرح چار رنگ پانی میں ملا کر ایک خاص رنگ پیدا کر لیتے ہیں اسی طرح جس جگہ مسلمانوں کا لشکر گیا وہاں کی جو زبان تھی اس میں اس لشکر کی خاص بولی کے الفاظ مل گئے اور اس سے ایک بولی واسطے رفع ضرورت کے، پیدا ہوگئی جس کا کوئی نام اس وقت نہ کسی نے تجویز کیا اور نہ رکھا.... الغرض مدت کے بعد اس کا نام ریختہ ہوا۔ اس کے بعد اردو پایا ہے''۔ (جلوہ ۱/ ۱۶)

صفیرؔ بلگرامی نے جلوہ خضر میں نہ صرف یہ کہ اردو کی پیدائش کے سلسلے میں لسانی بحث کی ہے، بلکہ وہ ہندوستان کی ابتدائی حکومتوں کے احوال بھی بیان کرتے ہیں۔ جلد اول میں مختلف حکمرانوں کی شبیہیں بھی شامل کی ہیں درحالیکہ وہ تذکرہ لکھ رہے تھے۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ صراحتاً لکھا ہے:

''میں اردو کی تاریخ لکھتا ہوں خالی تذکرہ نہیں''۔ (ص،۳۸)

لیکن یہ تاریخ کاملاً حقائق پر استوار نہ ہو کر مصنف کے مزعومہ نظریات کی مظہر ہے۔ اسی طرح مصنف نے امیر خسروؔ کے نام سے یہ غزل ''زحال مسکیں مکن تغافل'' ...... نقل کی ہے جب کہ یہ خسروؔ کی نہیں بلکہ ان

سے منسوب کی گئی ہے۔ البتہ صفیرؔ کے علاوہ بھی لوگوں نے مثلاً مولانا حسین آزاد نے اسے امیر خسروؔ سے نسبت دی ہے اور شاید صفیر نے انہی کا تتبع کیا ہے۔ اکبر بادشاہ کی رباعی، نور جہاں اور زیب النسا کے اردو اشعار، شاہ جہاں کا داراشکوہ کے نام اردو کی تحریر کا ذکر بغیر کسی تحقیق کے نقل در نقل کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنی کتاب کا جزو بنایا ہے۔ ’’تزک جہاں گیری‘‘ کے بارے میں یہ کہنا کہ جہاں گیر نے اسے ترکی زبان میں لکھا تھا حقیقت کے برعکس ہے:

’’جہاں گیر نے اپنا حال خود ترکی میں تحریر کیا ہے اور اس کا نام تزک جہاں گیری رکھا ہے‘‘۔ (جلوہ ۱/ ۴۸)

بابر نے اپنی تزک ترکی زبان میں لکھی تھی جسے عبدالرحیم خان خاناں نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ جہاں گیر نے اپنی تزک فارسی میں ہی لکھی تھی۔ غالبؔ کے باب میں بھی صفیر نے بہت کچھ لکھا ہے جس کا مقصد اپنی اہمیت جتانا ہے، اسی وجہ سے اکثر محققین نے ان کے بیانات کو مشکوک سمجھ لیا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی باتوں اور طرح طرح کے قصے کہانیوں کے سبب صفیر کی کتاب ’’جلوہ خضر‘‘ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ مگر اتنی بات طے ہے کہ صفیر نے آب حیات کے تتبع میں جلوہ خضر لکھی اور پانچویں دور کے بعد کے شعرا کے احوال و انتخاب کلام کے ساتھ اردو زبان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرنا، ان کا اصلی مقصد تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب کو اتنا پھیلا دیا جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آب حیات کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مختلف مقامات پر آب حیات کے بیانات سے نہ صرف اختلاف کیا ہے، بلکہ ان پر تنقید بھی کی ہے۔ یہ تنقید و تبصرہ خاص کر ناسخؔ کی اصلاح زبان کی تحریک سے متعلق ہے۔ ناسخ پر جو نو اعتراضات کیے گئے ہیں صفیرؔ نے ان کا بھی مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

ہر عہد کے آغاز میں اس دور کے ان فارسی گو شعرا کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے تفنن طبع کے لیے اردو میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں۔ ولیؔ دکنی کے باب میں بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں تازگی یا نیا پن نہیں لیکن قابل مطالعہ ضرور ہے۔ ولیؔ کے مختلف النوع اشعار کی درجہ بندی اور ان کا انتخاب رائج و متروک الفاظ کی فہرست وغیرہ قابل تعریف ہیں۔ ہر عہد کی زبان میں رائج الفاظ اور ان میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی نشان دہی بھی صفیر نے جس دقت نظری سے کی ہے، وہ کسی وسیع النظر مصنف سے ہی ممکن ہے۔

اس کتاب کی جلد دوم میں صفیر نے جس طرح فارسی کی مختلف کتابوں سے نثر اور مختلف رقعات یکجا کر دیئے ہیں، ان کے پیش نظر بھی صفیر کی وسعت نظر کی داد دینی پڑتی ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے کہ اصول پر عمل کرتے ہوئے صفیر نے ایسے بہت سے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کر دی ہے جن کا خیال شاید مصنف کو پہلے نہ رہا ہو، مثلاً پسند ہونے کا اصول (۲/ ۵۸) بیان کرتے وقت ہر چیز کی درجہ بندی کر دی ہے۔ اعلی، اوسط اور ادنی۔ اسی طرح جب یہ اصول شاعری اور مذاق شعر کے باب میں لاگو ہوگا تو وہاں بھی اس کی تین قسمیں بنا دی ہیں۔ عالمانہ، شاعرانہ، اور عاشقانہ۔ اسی طرح متفرق علوم و فنون کے باب میں قواعد زبان اردو و فارسی پر

بہت تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ جس طرح جلد اول میں عہد بہ عہد کے الفاظ کی فہرست شامل کی ہے، اسی طرح جلد دوم میں بھی اس پہلو پر نظر رکھی گئی ہے اور مختلف مانوس و غیر مانوس، فصیح و غیر فصیح، روزمرہ، محاورہ اور مثل وغیرہ پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ صفیر نے کتاب کے اس حصے میں اپنے وقت کے مشاہیر وقت کے مکتوبات بھی درج کر دیئے ہیں۔ جن میں کچھ شاید اسی کتاب میں ملیں۔ ان مکتوبات میں مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر اظہار خیال بھی ہوا ہے۔ لیکن ان سب سے قطع نظر کتاب کی اہمیت دور پنجم کے بعد کے شعرا کے تذکرے میں مضمر ہے۔ یعنی اگر جلوہ خضر میں ان کا تذکرہ نہ ہوتا تو شاید یہ گمنامی میں ہی رہ جاتے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر ظفر نوگانوی کی یہ رائے بہت صائب اور مناسب ہے جس سے مجھے اتفاق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’اگر ہم یہ اعتراف نہ کریں تو صفیر کے ساتھ ناانصافی ہوگی کہ اگر تذکرہ جلوہ خضر نہ ہوتا تو دور پنجم کے بعد کے شعرا کا تاریخی سراغ ہم پر گم ہو جاتا۔ یہ مسلم ہے کہ آب حیات نے جابہ جا صفیر کی رہبری کی ہے، پھر بھی کوئی انصاف پسند تنقید نگار جلوہ خضر کے ان تحقیقی، تنقیدی اور لسانی پہلوؤں کو فروگذاشت نہیں کر سکتا، جن میں جلوہ خضر کی اہمیت پنہاں ہے اور جن سے جلوہ خضر کی افادیت مسلم ہے اور انھیں (ان کی) گرانقدر کتاب کو ہم آزاد کی آب حیات پر ایک قیمتی اضافہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان اضافوں کی روشنی میں ہم صفیر کی علمی کاوشوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ (ص، ۳۱۴)

یہ بات بھی سب پر روشن ہے کہ صفیر خود بڑے شاعر و مصنف ہونے کے ساتھ بڑے شاعروں کے شاگرد بھی تھے اور ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی میں تو کوئی کلام ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے شعرا ان کے شاگرد بھی تھے۔ وسعت مطالعہ اور کثرت تالیف و تصنیف کے سبب ان میں تاریخی، لسانی، ادبی اور تنقیدی شعور کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر وہ جلوہ خضر کو منصوبہ بند طریقے سے لکھتے تو شاید کم ضخامت میں سلسلے وار نظم و ضبط کے ساتھ اپنا علمی کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔ مگر شاید ان کا وسیع علم اور اس کا بجا اور بے جا اظہار اور کتاب کی بے تحاشا ضخامت بھی اس کی نامقبولیت کا سبب بن گئی ہے۔ پھر بھی اس میں دو رائے نہیں کہ صفیر نے جن جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے قابل مطالعہ ضرور ہیں یہ اور بات ہے کہ مطالب کی پیش کش میں کوئی خاص ترتیب مدنظر نہیں رکھی گئی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ صفیر نے اپنی روز مرہ کی عام بول چال کی زبان ہی استعمال کی ہے یعنی زبان کی روانی کہیں مجروح نہیں ہوئی اور نہ ہی مطالب کی تفہیم میں کوئی دشواری پیش آئی ہے۔

☆☆☆☆☆

Prof. Syed Hasan Abbas,
Professor & Head Dept. of Persian,
Banaras Hindu University Varanasi-221005,
Mob. 9839337979,
E-Mail: shabbas_05@gmail.com

گذشتہ سے پیوستہ

امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان

ارشاد حسین

ان کے اندر کا محقق ابتدائے جوانی سے ہی ہر چیز کو بنظر غائر دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر علوم عقلیہ کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔ وہ ان علوم کے بعض مسائل کے حل میں پورا دن صرف کر دیتے تھے اور حل مسئلہ کے بعد ایک طرح کا کیف محسوس کرتے تھے۔ اس طرز مطالعہ سے ایسا ملکہ حاصل ہو گیا کہ خود صاحب نظر بن گئے۔

ان کی طبیعت فقط علوم متداولہ کے مطالعے سے کبھی سیر نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے فلاسفہ کا مطالعہ کیا اور مطالعے کے وقت ان کی کتابوں پر حواشی لکھے بلکہ بعض کتابوں کی شرحیں بھی لکھیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ وہ ان فلاسفہ کو پڑھ کر ان کی آرا سے قانع نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض مسائل و مباحث میں ان پر ایرادات و اعتراضات بھی کیے ہیں۔ خصوصاً فلسفۂ وحدت الوجود کے سلسلے میں انھوں نے صوفیہ، عرفا اور فلاسفہ کی آرا سے بڑے شد و مد کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ وہ فلسفے کو ایک علم کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے تمام اصول وضوابط پر عمل کرنے کو واجب و ضروری نہیں سمجھتے۔ بعض مقامات پر ان علوم کے اصول وضوابط کے ناقص ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جب کہ وہ اپنے ہم عصروں میں ایک بڑے فلسفی کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں:

با فلسفہ، رہ بہ سوی او نتوان یافت   با چشم علیل، کوی او نتوان یافت
این فلسفہ را بہل کہ بی شہپر عشق   اشراقِ جمیلِ رویِ او نتوان یافت

دوسری جگہ کہتے ہیں:

آنان کہ بہ علم فلسفہ می نازند   بر علم دگر بہ آشکارا تازند
ترسم کہ در این حجاب اکبر، آخر   سرگرم شوند و خویشتن را بازند

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کوئی شخص کسی کی شخصیت اور کارناموں سے صرف استفادے کی حد تک ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اگر حقیقتاً کوئی کسی سے متاثر ہوتا ہے تو ان امور کے علاوہ اس کی رفتار، گفتار وغیرہ سے بھی متاثر ہوتا ہے اور بعض مواقع میں اس کے تمام امور کو اپنانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ امام خمینی کی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی اس دور سے گزری لیکن انھوں نے شرق و غرب کے فلاسفہ اور عرفا کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے بل اسلامی جمہوریہ کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی عرفانی شاعری پر اگرچہ بظاہر ابن عربی کے عرفان کی جھلک دکھائی دیتی ہے جس سے بعض افراد یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ عرفان نظری میں ابن عربی کے مقلد اور پیرو

ہیں لیکن یہ ان کا زعم ناقص ہے۔ ان کا عرفان قرآن اور احادیث کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے موجودہ عرفان کی اصطلاحات کو نئے نئے معانی و مفاہیم سے روشناس کرایا اور جہاں کہیں بھی ان کو تنگ دامانی نظر آئی ان اصطلاحات کی قیود میں مقید نہیں رہے بلکہ قرآنی تعلیمات کو اپنے عرفان کا محور اصلی بنایا۔ ان کا ماننا ہے کہ عرفان نظری کے ذریعے انسان معرفت خداوندی تک نہیں پہنچ سکتا۔

آن کس کہ بہ زعم خویش عارف باشد   غواص بہ دریای معارف باشد
روزی اگر از حجاب آزاد شود   بیند کہ بہ لاک خویش واقف باشد

دوسری رباعی میں کہتے ہیں:

از صوفی ہا صفا ندیدم ہرگز   زین طایفہ من وفا ندیدم ہرگز
زین مدعیان کہ فاش اناالحق گویند   با خود بینی فنا ندیدم ہرگز

ہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ابن عربی کے افکار و نظریات سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن الہام کی حد تک نہیں۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں کمیونسٹوں کے ایک بڑے رہبر روس کے صدر گورباچیف کو کمیونسٹی نظام کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اگر جناب عالی میل داشتہ باشید در این زمینہ ہا تحقیق کنید۔ می توانید دستور دہید کہ صاحبان این گونہ علوم علاوہ بر کتب فلاسفۂ غرب در این زمینہ بہ نوشتہ ہای فارابی و بوعلی سینا (رحمۃ اللہ علیہما) در حکمت مشاء مراجعہ کنند تا۔۔۔ دیگر شما را خستہ نمی کنیم۔ (1)

مذکورہ عبارت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عرفانی مشرب اسلام ناب سے ماخوذ ہے جو قرآن کریم، احادیث اور سیرت معصومینؑ پر مبنی ہے۔ علاوہ بر ایں انھوں نے گزشتہ مشاہیر عرفائے اسلامی کے افکار و نظریات سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے۔ ہاں ان کے عرفان و تصوف سے صرف استفادے کی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔

ابن عربی عملی عرفان میں کافی دخیل تھے۔ انھوں نے آغاز جوانی سے ہی اپنی عمر کے بیشتر اوقات ریاضت، مجاہدہ اور وجدان و کشف میں گزارے، ساتھ ہی عرفانیات کے سلسلے میں بھی ان کی نظر کافی وقیع تھی۔ کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وحدت الوجود جو عرفانیات کا ایک اہم مسئلہ ہے، ابن عربی نے ہی بیان کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان سے قبل وحدت الوجود پر کوئی بحث ہی نہیں ہوتی تھی، یہ تو قرآن کے ساتھ احادیث وغیرہ میں بھی آغاز اسلام سے بیان ہوتا رہا ہے بلکہ تاریخ آغاز بشریت سے ہی اس پر بحث و مباحثے ہوتے رہے ہیں، البتہ بعد اسلام اسے تدوینی شکل میں پیش کرنے کا سہرا محی الدین ابن عربی ہی کے سر ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے علم منطق ارسطو سے قبل۔ ایسا نہیں ہے کہ ارسطو سے قبل لوگ قواعد منطقی کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے۔ لوگ عمل کرتے تھے لیکن یہ علم ایک مدون شکل میں موجود نہیں تھا۔

عرفان، امام خمینی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے جسے ہم ان کی شخصیت کا محور اصلی قرار دے سکتے ہیں اور دیگر جہات کو فرعی۔ محققین اور صاحبان نظر نے ان کے عرفان کی ایک نئی تعریف کی ہے جو صرف انھیں کی ذات سے مخصوص ہے۔ یہ ایک ہمہ جہت عرفان ہے جس کے ذریعہ انھوں نے مشرق و مغرب کی استعماری طاقتوں کا مقابلہ کیا اور ایک نیا نظام نافذ کیا۔

انھوں نے خراباتی، کوری، مہجوری، مست، شراب، اور صراحی جیسے الفاظ استعمال تو ضرور کیے ہیں لیکن ان کے پس پردہ بڑے بڑے سیاسی اور معاشرتی مسائل سلجھائے ہیں جن سے سربراہان مملکت چشم پوشی کر رہے تھے۔ ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی، ہر طرف لوٹ کھسوٹ مچی تھی، انسانیت اپنی آخری سانسیں لے کر دم توڑنے ہی والی تھی اور سربراہان اور عہدیداران مملکت عیش کوشی میں مصروف تھے۔ ان کی سردمہری اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ان سے کب برداشت ہوسکتی تھی، لہٰذا انھوں نے انھیں الفاظ وتراکیب کا سہارا لیا۔ اس پس منظر میں ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

من خراباتی ام از من سخن یار مخواه   گنگم، از گنگ پریشان شده، گفتار مخواه
من که با کوری و مهجوری خود سرگرمم   از چنین کور، تو بینایی و دیدار مخواه
چشم بیمار تو، بیمار نموده است مرا   غیر هذیان، سخنی از من بیمار مخواه
با قلندر منشین، گر که نشستی هرگز   حکمت و فلسفه و آیه و اخبار مخواه
مستم از بادهٔ عشق تو و از مستِ چنین   پند مردان جهان دیده و هشیار مخواه

اگر اس پوری غزل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ایک ایک لفظ کے پردے میں معانی کا موجیں مارتا ہوا دریا موجود ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ بعض افراد نے اس غزل کی تشریح میں دفتر کا دفتر لکھ ڈالا۔ کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ وقت اور موقع کی مناسبت سے اشعار کہتے تھے۔ جب ان پر عشقیہ اور رندیہ مضامین کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ مذکورہ مضامین اپنی غزل میں بیان کرتے اور جب الٰہیات کے مباحث میں غرق ہوتے تو عارفانہ اشعار کہتے، تو میں یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ان کا عرفان اور عشق دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان اشعار میں ہمیں عشق کے جو موارد نظر آتے ہیں وہ عرفان تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ خواجہ حافظؔ شیرازی کہتے ہیں:

هر که شد محرم دل در حرم یار بماند   و آن که این کار ندانست در انکار بماند

عشق ایک ایسا دریائے بے کراں ہے جس کی وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور جس شخص کا دل اس جذبے سے خالی ہوتا ہے وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتا کیونکہ وہ اس لذت سے ناآشنا ہے۔ اس حقیقت کا اقرار مولانا رومؔ نے بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

هرچه گویم عشق را شرح و بیان   چون به عشق آیم خجل باشم از آن

لوگوں نے عشق کو شدید محبت اور دلی لگاؤ سے تعبیر کیا ہے لیکن عرفا کی نگاہ میں عشق عین حقیقت کا نام

ہے جس کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ اس کی تعریف ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اسے معراج کمال کا نام دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں معشوق حقیقی اسی کمال مطلق کو کہا جائے گا جو تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ عشق کے مراتب اور درجات ہیں اور جب عشق اپنی معراج پر پہنچ جائے جہاں دنیاوی جھمیلوں سے نجات اور قید و بند سے رہائی مل جائے تو عشق حقیقی کہا جائے گا۔ امام خمینی کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔ یہ غزل عشق حقیقی کی بہترین مثال قرار دی جاسکتی ہے۔

من به خال لبت ای دوست گرفتار شدم   چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم
فارغ از خود شدم و کوس انا الحق بزدم   همچو منصور خریدار سر دار شدم
غم دلدار فکنده است به جانم، شرری   که به جان آمدم و شهرهٔ بازار شدم
جامهٔ زهد و ریا کندم و بر تن کردم   خرقهٔ پیر خراباتی و هشیار شدم
واعظ شهر که با پند خود آزارم داد   از دم رند می آلوده مددگار شدم
بگذارید که از بتکده یادی بکنم   من که با دستِ بتِ میکده، بیدار شدم

ایسی ہی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد روز※ ※※ ب※ عشق تو گرفتار شدم   از سر خویش گذر▪رد※، سو※ یار شدم
آرزو※ خم گیسو※ تو، خم▪رد قدم   باز، انگشت نما※ سر بازار شدم
طُرف※روز※※※شبش باتوب※پایان بردم   از پی حسرت آن مونس خمّار شدم
آن طرب را※※ ز بیمار※ چشمت دیدم   فارغ از کون وم※ان گشتم و بیمار شدم

دونوں غزلوں کے ایک ایک مصرعے میں معانی کا ایک سمندر ہے اور علامتی پیرایے میں عشق مجازی کی آنچ دے کر عشق حقیقی کی معراج دکھائی گئی ہے۔ وہ اپنی معروف کتاب ''رہ عشق'' میں عرفان اور عرفانیات کے سلسلے میں اپنے مطمح نظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''انکار مقامات عارفین و صالحین را نکنی و معاندت با آنان را از وظایف دینی نشمری۔۔۔ چون ما جاہلان از آن ہا محرومیم۔ با آن بہ معارضہ برخاستیم، نمی خواہیم مدعیان را تطہیر بکنیم کہ (ای بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد) می خواہم اصل معنی و معنویت را انکار نکنی'' (2)

ان کی شخصیت سیاست اور معنویت دونوں کو جامع تھی۔ انھوں نے ایک طرف عرفانیات کے دائرۂ کار کو اپنے نئے علامتی نظام کے تحت وسعت بخشی تو دوسری طرف اسے کسی ایک خاص طبقے تک محدود نہیں رہنے دیا کہ جنھیں اصطلاح میں اہل دل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بلکہ انھوں نے اس کے مفہوم کو عمومیت بخشی تا کہ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکے۔

وہ ہمیشہ عرفان ناب کے حامی رہے اور عرفان منفی کے جو نفس کشی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں، مخالف رہے اور بہیترے اشعار میں صوفی بے صفا، زاہد خشک اور واعظ تنگ نظر پر طنز کے نشتر کسے ہیں۔ وہ ایسے

عارف نہ تھے کہ عرفان کو دنیا کی ہر آفت و بلا سے محفوظ خیال کریں بلکہ ان کا ماننا ہے کہ موجودہ دور میں اس کے لیے آفات ہیں جو انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے اس کا نشانہ بنا رہی ہیں۔تکبر وخود پرستی، ذات باری تعالیٰ سے غفلت، اللہ کی رحمت سے مایوسی، گوشہ نشینی، ذمہ داریوں سے پہلو کشی، جھوٹ، غیبت، اتہام اور خلق خدا کی دل آزاری وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے عرفان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

انھوں نے اپنی شاعری میں انسان کامل کا تصور پیش کیا ہے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ خود بھی انسان کامل تھے۔ بقول شہید مطہری: ایک فلسفی انسان کو الگ زاویے سے دیکھتا ہے اور عارف دوسرے زاویے سے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی نگاہ سے انسان کامل کا تصور پیش کرتا ہے۔لیکن امام خمینی کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں انسان کامل مختلف الجہات شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک عارف بھی ہے اور صوفی بھی۔فلسفی بھی ہے اور فقیہ بھی، گویا وہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مظہر ہے۔

اگرچہ انھوں نے علوم کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور ان کے مسائل کے بیان میں اپنی رائے کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا ہے لیکن عرفانیات کے سلسلے میں جس بے باکی، شجاعت اور بہادری سے اپنے اعتقادات کا اظہار کیا ہے اس کی مثال کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب لوگ ان کے عرفانی اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت واستعجاب سے انگشت بہ دنداں ہو جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ استعمال کردہ الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات میں گم ہو جاتے ہیں۔ہاں جہاں کہیں طنزیہ انداز اختیار کیا ہے لہجہ خاصا سخت ہو گیا ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

خار راہ منی ای شیخ! ز گلزار برو — از سر راہ من ای رند تبہ کار، برو
تو و ارشاد من، ای مرشد بی رشد و تباہ؟! — از برِ رویِ من، ای صوفی غدار، برو
ای گرفتار ہواہای خود، ای دیر نشین — از صف شیفتگان رخ دلدار، برو
ای قلندر منش، ای بادہ بہ کف، خرقہ بہ دوش — خرقۂ شرک تہی کردہ و بگذار برو
خانۂ کعبہ کہ اکنون، تو شدی خادم آن — ای دغل! خادم شیطانی، از این دار برو
زین کلیسای کہ در خدمت جبّاران است — عیسیِ مریم از آن، خود شدہ بی زار، برو
ای قلم بر کفِ نقادِ تبہ کارِ پلید — بنہ این خامہ و مخلوق میازار، برو

اس پوری غزل میں وہ ایک مصلح کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں۔ اس میں ظاہردار اور مکار صوفیوں، عارفوں اور ملنگوں کا پردہ فاش کیا ہے۔تاہم انھوں نے اپنی ان غزلوں میں صدیوں سے چلی آ رہی روایت سے چشم پوشی نہیں کی لیکن دوسرے عارف شعرا کی طرح کبھی بے راہ روی کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ان کی بوستان غزل میں سنائی وعطار کی خوشبو، مولوی اور محی الدین ابن عربی اور دیگر مشاہیر کے نقوش جا بہ جا محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

بغیر تعصب اور جانبداری کے جب ہم ان کی ملکوتی، عرفانی، علمی اور ادبی شخصیت کا ان کے اشعار میں

مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عرفان دیگر عرفا سے قدرے مختلف ہے۔ اگرچہ دوسرے عارفوں نے بھی زمانے کے ساتھ ساتھ اس کے دامن کو وسیع کیا اور اسے آب وتاب بخشی لیکن امام خمینی نے اسے نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ عرفان وتصوف میں زمانے کے ساتھ ساتھ انحرافات بھی در آئے ہیں جن کی آلائش سے اسے منزہ اور پاک ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی عرفان اسلامی کا دفاع بھی کیا۔ اس عرفان اسلامی کا جس نے انانیت، کبر ونخوت اور جبر واستبداد کی بت شکنی کی اور ہمہ تن ذات باری تعالیٰ میں مصروف ہونے کا داعی ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

(1) آوای توحید، آیت اللہ جوادی آملی، ص 72

(2) رہ عشق، امام خمینی، سازمان چاپ وانتشارات وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، ص 35

☆☆☆☆☆

***Maulana Irshad Husain*,**
Pura Maroof, Post-Kurthijafar Pur,
Dist. Mau U.P -275305,
Mob. 08896740346

نثار احمد فاروقی بحیثیت شاعر

مصباح احمد صدیقی

پروفیسر نثار احمد فاروقی ابن تسلیم احمد مرحوم ساکن محلہ (جھنڈا) شہید امروہہ، پیدائش ۲۹/جون ۱۹۳۴ء/ ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ۔(اگرچہ سرکاری ریکارڈ اور تمام اسناد میں ۱۹۳۶ء درج ہے) نثار احمد فاروقی اردو، فارسی اور عربی ادب کی ایک بلند ترین شخصیت کا نام ہے۔اس لیے ان کی شعر گوئی پر بات کرنے سے پہلے ان کا مختصر سوانحی تعارف یہاں پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے تعلق سے ۴۱ واسطوں کے بعد سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم سے متصل ہوتا ہے۔مورخ امروہہ علامہ محمود احمد عباسی نے لکھا ہے:

''ان میں سب سے قدیم معزز صحیح النسب خاندان اولاد بابا فریدالدین گنج شکر قدس سرہ، ساکنان محلہ شیخ زادگان کا ہے(1)''

نثار احمد فاروقی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے نانا مولانا شاہ سلیمان احمد چشتی صابری(م: یکم جنوری ۱۹۶۲ء)اور چچا حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی (م:۱۸/اکتوبر ۱۹۸۸ء) کے زیر نگرانی حاصل کی۔ان دونوں بزرگوں کے زیر سایہ آپ عربی و فارسی درسیات پر قدرت اور ہندی انگریزی میں خاصا ملکہ حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں بغرض تلاش معاش دہلی گئے جہاں ''شمع'' کے دفتر میں ملازمت کی۔ یہاں آپ ہفتہ وار اردو اخبار ''آئینہ'' کے مدیر بھی رہے بعد میں دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ملازم ہوئے اور ملازمت کے دوران ہی ہائی اسکول، انٹر، جامعہ اردو سے ادب ماہر، ادیب کامل (گولڈ میڈل)، پنجاب یونیورسٹی سے منشی، منشی فاضل، الہ آباد بورڈ سے منشی وغیرہ کے امتحانات فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کیے۔ ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے۔ ۱۹۶۴ء میں فرسٹ ڈویژن عربی میں ایم۔اے۔ پاس کیا۔ ۱۹۷۷ء میں ''فی التاریخ عندالمسلمین فی العصر الاول'' کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔اسی سال دہلی یونیورسٹی میں عربی لکچر رہوئے۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۷ء تک دلی کالج میں عربی لکچرر رہے۔ ۱۹۷۷ء میں پھر دہلی یونیورسٹی میں ماڈرن عربی کے ریڈر ہو گئے۔ ۱۹۸۶ء میں دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے اور تین سال تک دوبارہ صدر شعبۂ عربی رہے۔یعنی پہلی بار ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء تک، دوسری بار ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء تک اور تیسری بار ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک شعبہ عربی کے صدر رہے۔ ۱۹۸۵ء میں صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے بحیثیت عربی اسکالر ''سند امتیاز'' سے سرفراز کیا۔

اس کے علاوہ آپ کو یوپی اردو اکادمی سے ۱۹۹۵ء میں ''ابوالکلام آزاد ایوارڈ''، دہلی اردو اکادمی سے ۱۹۸۲ء میں ''برائے تحقیق و تنقید ایوارڈ'' آل انڈیا میرا کادمی لکھنو کی طرف سے ۹۳-۱۹۸۵ء میں آپ کی تین

کتابوں پر ایوارڈ، ''برائے تحقیق و تنقید'' قاضی عبدالودود ایوارڈ، ۱۹۸۰ء میں غالب میموریل ویلفیر سوسائٹی ایوارڈ اور ۲۰۰۴ء میں ''عالمی اردو ایوارڈ'' دوحہ قطر سے نوازا گیا۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی کے علمی و ادبی مقالات کی تعداد بھی کافی ہے۔دو درجن کے قریب مطبوعات ہیں جن میں بعض عربی، فارسی اور انگریزی متون کے تراجم اور بعض ان کی طبع زاد ہیں۔ان میں چند کے اسما یہ ہیں:

میر کی آپ بیتی (۱۹۵۷ء)، دید و دریافت (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۶۴ء)، دہلی کالج میگزین میر تقی میرؔ پر خاص مضامین (۱۹۶۳ء)، طبقات الشعرا (۱۹۶۵ء)، تین تذکرے (۱۹۶۸ء)، غالبؔ کی آپ بیتی (۱۹۶۹ء)، تلاش غالب (۱۹۶۹ء)، (دہلی اور لاہور) تذکرۂ خواجہ نظام الدین اولیا (۱۹۸۰ء)، امداد المشتاق (۱۹۸۰ء)، مرقومات امدادیہ (۱۹۷۹ء)، نوادر امدادیہ (۱۹۹۶ء)، تاریخ طبری کے ماخذ کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ (عربی سے اردو ترجمہ تصنیف ڈاکٹر جواد علی)، سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین (۱۹۷۴ء)، فن التاریخ عندالمسلمین فی العصر الاول (۱۹۷۹ء)، یہ آپ کی پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔دراسات (بحث و نقد)، نقد ملفوظات (مجموعہ مضامین)، انوار القرآن (۱۹۹۵ء)، قوام العقائد (۱۹۹۴ء)، مقاصد العارفین (۱۹۸۴ء)، مفتاح الخزائن (۱۹۹۷ء)، روضۃ الاولیا (۱۹۹۶ء)، تاریخ محمدی جلد دوم (تدوین و شائع کردہ رام پور رضا لائبریری ۱۹۹۶ء)، یقظۃ النائمین (شائع کردہ رام پور رضا لائبریری ۱۹۹۶ء)، امن اور آشتی کا مذہب اسلام (۱۹۷۵ء)، کلیات مصحفیؔ (بار اول علمی مجلس دہلی، بار دوم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دو جلدوں میں)، دیوان غالب نسخۂ امروہہ، دریافت جناب توفیق احمد قادری چشتی امروہوی۔

شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا، ماہنامہ ''انشا'' کے پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر ''در مدح خودمی سرایم'' میں لکھتے ہیں:

''ذرا سا ہوش سنبھالا تو شعر کہنے کا لپکا پڑ گیا۔امروہہ میں ایک شاعر کوثر القادری مرحوم رئیسؔ امروہوی کے شاگرد تھے، ان کے ساتھ چار پانچ شاگرد بھی لگے رہتے تھے۔میں بھی ان میں شامل ہو گیا مگر ۱۹۵۲ء میں دہلی آ گیا تو یہ تعلق قائم نہ رہ سکا''(2)

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے شاعری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ دوستوں کی فرمائش پر یا برائے تفنن طبع کبھی کبھی شعر کہے یا کسی قریبی دوست شاعر یا عزیز کی وفات پر کچھ تاریخی قطعات لکھے ہیں۔اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر گوئی کی جب کہ شاعری کے بارے میں ان کا کہنا تھا:

''شاعری کا احوال یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء تک ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔رفتہ رفتہ یہ اندازہ ہوا کہ شاعری میں نئی راہ نکالنا آسان نہیں اور دوسروں کے خیالات کی جگالی کرنے سے فائدہ نہیں۔ اب شعر خود ہی نازل ہو جائے تو کہہ لیتا ہوں، ارادے کے ساتھ نہیں۔کلام جو محفوظ رہ گیا بیس پچیس غزلوں اور قطعات وغیرہ سے زیادہ نہیں ہے''(3)

نثار احمد فاروقی بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور اپنے ابتدائی دور میں شعر گوئی سے یک گونہ مناسبت

رکھتے تھے۔ اگرچہ ۱۹۵۲ء کے بعد سے انھوں نے شعر گوئی ارادتاً ترک کر دی تھی لیکن اندر چھپا ہوا شاعر جب جب جوش مارتا تو بے ساختہ شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر تابش مہدی لکھتے ہیں:

''یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ نثار احمد فاروقی ایک اچھے اور پختہ کار شاعر بھی ہیں۔ فن شعر پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ امروہہ کی ایک سے زائد نشستوں میں انھیں کی زبان سے ان کی غزلیں اور رباعیات سننے کا اتفاق ہوا، اور جب بھی کوئی غزل یا رباعی سنی ایسا لگا کہ وہ صرف اور صرف شاعری ہی کے مرد میدان ہیں'' (4)

بلا شبہ نثار احمد فاروقی ایک قادر الکلام اور پختہ کار شاعر تھے۔ موزونی طبع کے علاوہ شعری مزاج اور زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ ساتھ فن شعر گوئی کے رموز و غوامض ان کے رگ و پے میں رچے بسے تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے عربی و فارسی کے تمام اساتذہ سخن بالخصوص اردو میں میرؔ و غالبؔ اور مصحفیؔ کا اتنا مطالعہ کیا تھا کہ ان اساتذہ کا ایک ایک شعر ان کے ذہن پر مرتسم تھا۔ مظفر حسین برنی اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

''یہ تو میں جانتا تھا کہ ان کو بے شمار اردو و فارسی کے اشعار یاد ہیں لیکن اس سفر کے دوران، ان کے اس وسیع اور پر اسرار ذخیرۂ اشعار کا علم ہوا جو ان کے ذہن میں پوشیدہ تھا، اس میں ہر موقعہ اور محل کے شعر ہیں۔ پرانے بھی نئے بھی، سنجیدہ بھی غیر سنجیدہ بھی، مزاحیہ بھی رزمیہ بھی، کبھی کبھی درمیان میں عربی کا کوئی شعر سنا دیتے ہیں تو لطف سخن دوبالا ہو جاتا ہے۔ شعر و ادب سے دلچسپی ہو تو آدمی ان کی صحبت میں گھنٹوں بیٹھا رہے اور ایک لمحہ کے لیے بور نہ ہو'' (5)

نثار احمد فاروقی کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فی البدیہہ شعر کہنے میں استادانہ قدرت رکھتے تھے۔ ایک دو مثالوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ پہلا واقعہ جس کو ماہنامہ ''انشا'' کے مدیر ف۔ س۔ اعجازؔ نے اس طرح نقل کیا ہے:

''علامہ سلیمان ندوی کی ولادت پر سو سال پورے ہونے پر خدا بخش لائبریری پٹنہ میں سیمینار ہوا۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کی شام کو بعض حضرات قاضی عبدالودود صاحب کی وفات پر تعزیت کے لیے ان کے فرزند قاضی مسعود صاحب سے ملاقات کرنے گئے۔ اس وفد میں یہ حضرات تھے: سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم (ایڈیٹر معارف اعظم گڑھ)، سید شہاب الدین دیسنوی مرحوم (پٹنہ)، پروفیسر عبدالقیوم دیسنوی (بھوپال)، ڈاکٹر عابد رضا بیدار (سابق ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ)، ڈاکٹر محمد حسنین (پٹنہ)، جناب عطا کاکوی مرحوم (پٹنہ)، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (دہلی)، ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)۔ رخصت کے وقت زینے سے اترتے ہوئے صباح الدین عبدالرحمان صاحب نے ایک فقرہ کہا:

قاضی صاحب سپرد خاک ہوئے

پھر خیال آیا کہ یہ مصرع ہو گیا تو فرمائش کی اس پر کوئی مصرعہ لگایا جائے۔ نثار احمد فاروقی نے فی البدیہہ

تین مصرعے کہے اور اسے قطعہ بنا دیا، جس سے سب لوگ محظوظ ہوئے:

قاضی صاحب سپرد خاک ہوئے　　اہل تحقیق سینہ چاک ہوئے
ان کے ہاتھوں سے غنڈگان ادب　　ایسے دھوئے گئے کہ پاک ہوئے

ایک اور واقعہ جو اسی ماہنامہ میں لکھا ہے کہ نثار احمد فاروقی نے فی البدیہہ دو رباعیاں کہیں جس کا شان نزول یہ ہے:

حضرت بسملؔ سعیدی ٹونکی مرحوم کے ایک شاگرد اپنی کہی ہوئی رباعیاں اصلاح کے لیے پیش کر رہے تھے جن کی ردیف ''ہم لوگ'' تھی۔ انھوں نے ایک دو بار لفظ عنادل کو دال کے زبر کے ساتھ عنادَل پڑھا۔ نثار صاحب حاضر الوقت تھے، انھوں نے فی البدیہہ یہ رباعیاں لکھ کر پیش کیں کہ بسملؔ صاحب ان کی بھی اصلاح فرما دیجیے''

بُلبُل کو پکارتے ہیں بَلبَل ہم لوگ　　کہتے ہیں عنادِل کو عنادَل ہم لوگ
ہیں حضرت بسملؔ کے تلامیذ رشید　　واللہ کہ ہیں تبع فہمَل ہم لوگ

اور

میدان سخن کے ہیں کھلاڑی ہم لوگ　　دیکھیں نہ اگاڑی نہ پچھاڑی ہم لوگ
ہر فن میں ہوئے طاق بہ فیض بسملؔ　　اک شعر میں رہ گئے اناڑی ہم لوگ

مندرجہ ذیل دو شعر بھی انھوں نے اپنے آخری وقت میں کیا خوب کہے ہیں۔ اس کے بارے میں جناب مظہر امام صاحب نے اپنے مقالہ ''نثار احمد فاروقی معتقد میر'' مطبوعہ اردو دنیا دہلی جنوری ۲۰۰۵ء میں لکھتے ہیں:

''اوائل عمر سے ہی نثار احمد فاروقی کو شعر گوئی سے دلچسپی تھی، انھیں بے شمار اشعار یاد تھے۔ لوازمات شعری سے کما حقہ واقف تھے۔ کچھ غزلیں معیاری رسالوں میں چھپی بھی ہیں مگر شاعر کی حیثیت سے شائع ہونے میں اجتناب رہا۔ ان کے آخری دور کے دو شعروں سے میں نے لطف اٹھایا ہے:

دم وداع وہ حسرت سے دیکھنا اس کا　　سو آج تک ہے وہی ایک مشغلہ دل کا
چلو نثار اسے لامکاں میں ڈھونڈیں اب　　یہاں تو کچھ نہیں ملتا اَتا پتا دل کا''

پروفیسر نثار احمد فاروقی اپنے ابتدائی دور شاعری میں 'قمرؔ' تخلص کرتے تھے، اس کے بعد مستقل اپنے نام 'نثار' کو ہی تخلص کے طور پر استعمال کیا۔ اب یہاں ان کا تمام دستیاب کلام بغیر کسی تجزیے اور تبصرے کے پیش کیا جاتا ہے۔

دربار بابا فریدی (6)

از نثار احمد فاروقی الفریدی قمرؔ امروہوی

سبحان اللہ کیا دربار ہے دربار بابا کا　　سراپا دعوت دیدار ہے دربار بابا کا

تجلیات سے سرشار ہیں قلب و نظر دونوں
عجب اک مطلع انوار ہے دربار بابا کا

سمائے کیا مری نظروں میں باغ خلد کی رونق
کہ رشک جنت گلزار ہے دربار بابا کا

غلام آستانہ ہوں، مجھے اس در سے نسبت ہے
مرا مونس مرا دلدار ہے دربار بابا کا

خدا کا قرب ہے، زیارت بہاء الدین فریدی کی
مئے توحید سے سرشار ہے دربار بابا کا

ادب سے آستانہ بوس ہو جا اے دل مضطر
یہی دربار رحمت بار ہے دربار بابا کا

یہ بزم ناز ہے حضرت فریدالدین چشتی کی
عمر فاروق کی سرکار ہے دربار بابا کا

یہاں پر نامرادوں کو مراد زیست ملتی ہے
قمرؔ کا وارث و غمخوار ہے دربار بابا کا (7)

اپنے عم محترم مولانا مفتی نسیم احمد فریدی کی وفات پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ لکھا اور اس قرآنی فقرے (1409ھ) سے تاریخ وفات برآمد کی۔

فریدی ہوئے عازم ملک باقی
کلام الٰہی سے تاریخ نکلی

امروہہ کے ایک معروف طبیب و شاعر الحاج حکیم کلب علی شاہدؔ کی شان میں فی البدیہہ گیارہ اشعار پر مشتمل نظم بعنوان ''نذرانۂ شاہد'' لکھی۔ ان اشعار پر خود نثار احمد فاروقی نے مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے، 18 اکتوبر 1994ء کو فی البدیہہ موزوں ہوئے۔

نذرانۂ شاہد

بہ نام شاہد نازک خیالاں
عزیز خاطر آشفتہ حالاں

مئے اخلاص سے لبریز ہے پیمانۂ شاہد
الٰہی حشر تک قائم رہے میخانۂ شاہد

سلوک اپنوں سے سب کرتے ہیں اخلاص و مروت کا
یہاں ان پر نوازش ہے جو ہیں بیگانۂ شاہد

یہی ہے کعبۂ مقصود، اہل علم و عرفاں کا
کیا ہے مدتوں ہم نے طواف خانۂ شاہد

بہ نام دوستی جو زخم کھا کر مسکراتا ہے
ہزاروں آفریں بر ہمت مردانۂ شاہد

سخاوت، سیر چشمی، دل نوازی، بے ریا الفت
یہی عنوان ہوں گے جب لکھو افسانۂ شاہد

مسیحا کو سنا ہے، ان کو دیکھا اپنی آنکھوں سے
دوائے دردمنداں ہے مئے خمخانۂ شاہد

حذاقت میں وہ جالینوس ہے اپنے زمانے کا
حیات نو کی دستاویز ہے پروانۂ شاہد

ہمارے عہد میں ہوتا اگر داؤد انطا کی
بہ توفیق الٰہی ہوتا وہ دیوانۂ شاہد

مسیحا دم، طبیب مجتہد، اور خوش نوا شاعر
زمانہ اب نہیں دہرائے گا افسانۂ شاہد

نثارؔ حق محبت تو ادا کیا ہو سکے تم سے
یہ گل ہائے عقیدت ہی کرو نذرانۂ شاہد

اس کے علاوہ بھی بہت سے قطعات تاریخ آپ نے مختلف لوگوں کی وفات پر لکھے ہیں۔ اب ان کی

غزلوں کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

ہائے درد مہجوری خود ہی ہو گیا کم بھی
وقت کتنا ظالم ہے، زخم بھی ہے مرہم بھی

لذت غم دل سے وہ تو تھے ہی بے گانے
رسم دلبری سے کچھ آشنا نہ تھے ہم بھی

ان کی کیا شکایت ہو کج ادائی کی ہم کو
خود ترس نہیں کھاتے اپنے حال پر ہم بھی

غم کا بوجھ وہ دل پر کس طرح اٹھاتا ہے
جو نہ دیکھ سکتا ہو گل پہ بار شبنم بھی

یاس کے اندھیرے میں اشک غم فروزاں ہیں
جشن سے نہیں ہے کم شہر دل کا ماتم بھی

بولتے ہیں سناٹے، جاگتی ہے تنہائی
وحشتوں کی بستی ہے، بے کسی کا عالم بھی

اس کے سانس کی خوشبو، اس کی آنکھ کا جادو
یاد بن گئے جب سے، زہر ہو گیا غم بھی

اے نثار جس دن سے ان سے مل کے بچھڑے ہیں
کچھ خفا سے رہتے ہیں اپنے آپ سے ہم بھی

اچانک بیٹھے بیٹھے بے سبب کیوں یاد آتے ہو
کوئی پوچھے تو کیا بتلائیں کب کیوں یاد آتے ہو

مرے یاران رفتہ ٹک سنبھلنے دو ذرا ٹھہرو
ارے یک بارگی تم سب کے سب کیوں یاد آتے ہو

میں اپنے رب سے کچھ کہتا ہوں، تم سے تو نہیں کہتا
بہ ہنگام دعائے نیم شب کیوں یاد آتے ہو

بچھڑنا اور ملنا تو یہاں ہوتا ہی رہتا ہے
کسی سے جب کوئی ملتا ہے تب کیوں یاد آتے ہو

طالعوں میں لکھی تھیں رسوائیاں
احتیاطیں بھی نہ کچھ کام آئیاں

جو سنا کرتے تھے باتیں عشق کی
حضرت دل نے وہ کر دکھلائیاں

میرؔ کے فیضان سے ہم بھی نثارؔ
کر رہے ہیں قافیہ پیمائیاں

جب بھی تیرے دیوانے کوچے سے تیرے پھرتے ہیں
شہر کے لڑکے بالے اس کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

مہکا ہوا تھا صحرائے جاں جس محمل کی خوشبو سے
اس محمل کی کھوج میں اب ہم ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

کیا کیا اپنی وضع پہ ہم کو ناز تھے کیسے خوار ہوئے
چاک گریباں، حال پریشاں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

میرؔ کا قول نثارؔ ہمارے حال پہ کتنا صادق ہے
بخت چنیں برگشتہ اپنے، کس کے پھیرے پھرتے ہیں

دسمبر 1992 میں بابری مسجد کے سانحۂ انہدام سے متاثر ہو کر لکھی گئی غزل ملاحظہ فرمائیں:

کتنے دکھ جھیل کے افسردہ و مغموم رہی
زندگی خود مری نظروں میں بھی موہوم رہی

آگہی! زہر کا تیرے کوئی تریاق نہ تھا
عیش کی ساری فضا اس لیے مسموم رہی

ایک بے نام سی حسرت لیے پھرتی تھی ہمیں
لیکن افسوس وہ شرمندۂ مفہوم رہی

ہمیں جینے کو زمانہ وہ ملا تھا جس میں
زندگی معنی و مقصد سے بھی محروم رہی

ایسے فتنے تھے کہ منطق کی زباں کاٹی گئی — اور تاریخ اساطیر کی محکوم رہی
علم اشیا کی حقیقت کو بتاتا تھا کبھی — آج ہر بے خبری علم سے موسوم رہی
وہ جو غدار وطن تھے بَطَل قوم بنے — خدمت اہل وفا ذکر سے محروم رہی

حواشی:

(1) تاریخ امروہہ، علامہ محمود احمد عباسی، ص194

(2) ماہنامہ انشا کلکتہ، پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر، سن اشاعت اکتوبر 2002، ص10

(3) کتاب نما، پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر، ص45

(4) ماہنامہ انشا کلکتہ، پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر، سن اشاعت اکتوبر 2002، ص33

(5) کتاب نما، پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر، ص45

(6) یہ منقبت بہاء الدین بابا فریدی کی شان میں ہے جو نثار احمد فاروقی کے جد ہشت دہم ہیں۔ آپ کا مزار پر انوار قصبہ رجب پور تحصیل امروہہ میں مرجع خلائق ہے۔

(7) اخبار دبدبۂ سکندری رام پور، بابا فریدی نمبر، اکتوبر 1953، ص11

☆☆☆☆☆

Misbah Ahmad Siddiqi
Moh. Gher Munaf, Amroha-244221,U.P
Mob. +919997161315

عصرِ حاضر میں افکارِ آزاد کی معنویت

ذیشان حیدر

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ عالیہ کی حامل تھی۔ وہ بیک وقت زبردست عالم، ادیب، خطیب، سیاستمدار، صحافی، مفکر، مدبر، دانشور اور عظیم مجاہدِ آزادی تھے۔ ان کے اعلیٰ افکار و خیالات کا احساس ہر دور میں ہوتا رہے گا۔ وہ ہندوستان کی جمہوری حکومت کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے علم کی ترویج و ترقی اور نشر و اشاعت کے لیے مختلف افکار و خیالات اور متعدد مفید نظریات پیش کیے تھے، جن کی اہمیت و افادیت عصر حاضر میں بھی باقی ہے اور ان کے افکار و نظریات مستقبل میں بھی رہروانِ حریت و صداقت اور گامزنانِ طریقِ دانش و بینش کے لیے نفع بخش اور مشعل راہ ثابت ہوں گے۔

دور حاضر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار کی معنویت کو قومی یکجہتی، دینی، سیاسی، ادبی، صحافتی اور تعلیمی زاویۂ نگاہ سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے قوم و ملت کے افراد کے مابین اتحاد و یکجہتی کی پُرزور کوشش کی ہے۔ ۲۵ / اگست ۱۹۲۱ء کو مجلس خلافت کے خطبۂ صدارت میں مولانا نے کہا:

"ہندوستان کی نجات کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے "ہندو مسلم اتحاد" ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کے پہلے نمبروں میں کر چکا ہوں۔"(۱)

۱۵ / دسمبر ۱۹۲۳ء کو انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس میں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے ان مؤثر خیالات کا اظہار کیا:

"آج اگر کوئی فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔"(۲)

ظاہر سی بات ہے کہ باہمی اتحاد کے مفقود ہونے کی صورت میں خون ریزی اور غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ملک تنزلی و پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد ان خدشات کے باعث بہت فکرمند تھے، اسی لیے انھوں نے اتحاد و قومی یکجہتی پر کافی زور دیا، تا کہ ہمارا وطنِ عزیز تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور تمام ہندوستانی باشندے بلا تفریقِ مذہب و ملت مشترکہ طور پر اپنے ملک کی ترقی میں سعی و کوشش کریں۔ عہد حاضر میں مولانا آزاد کی دعوتِ اتحاد کا ثمرہ سائنسی ترقی کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ آج تمام باشندگانِ ہند کی باہمی

کد و کاوش کے نتیجے میں ہمارے ملکِ عزیز نے زندگی کے سبھی شعبوں میں ارتقائی منازل طے کیے ہیں، یہاں تک کہ اس نے تکنیکی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ایٹمی توانائی میں بھی گراں قدر پیش رفت کی ہے۔

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا حال یہ تھا کہ انھیں انڈین نیشنل کانگریس کا سب سے جواں سال صدر مقرر کیا گیا اور ان کی دور اندیشی و باریک بینی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں ''امیر کارواں'' جیسے خطاب سے نوازا تھا۔ مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے بعد پہلے وزیر تعلیم مقرر کیے گئے اور جب ہند و پاک کے وزرائے اعظم دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت اور ملکہ برطانیہ الزبیتھ کے جشن تاجپوشی میں شمولیت کی غرض سے لندن روانہ ہوئے تو مولانا کو پنڈت نہرو کی عدم موجودگی میں ہندوستان کا قائم مقام وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کا اعلان یکم جون ۱۹۵۳ء کو ایک سرکاری پریس نوٹ کے توسط سے کیا گیا جس کو ہندوستان کے اخبارات نے شائع کیا۔ یہ سرکاری پریس نوٹ درج ذیل الفاظ پر مشتمل تھا:

''۳۱/ مئی ۱۹۵۳ء کو حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام قائم مقام وزیر اعظم مقرر کیے گئے ہیں اور انھوں نے اس حیثیت سے کام شروع کر دیا ہے۔''(۳)

مولانا آزاد کی ادبی و صحافتی خدمات کا ایک خاص ہدف مقرر تھا، ان کی تمام تر جد و جہد اس امر پر مرکوز تھی کہ ہندوستانی عوام بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا جائز حق ملنا چاہیے اور انھیں زیورِ علم و ادب سے آراستہ ہونا چاہیے۔ چونکہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے تعلیم و تربیت کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی لہٰذا مولانا نے ان کی تعلیم و تربیت اور تحصیل علوم و فنون پر بہت زور دیا۔

مولانا آزاد میں تخلیقی و تصنیفی شعور اس وقت بیدار ہوا جب ان کی ایک غزل گلدستہ ''ارمغان فرّخ'' میں شائع ہوئی تھی اور انھیں اِس کی خوشگوار لذت محسوس ہوئی۔ اس وقت ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک گلدستہ شائع کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس خواہش کی تکمیل کے لیے انھوں نے ۱۸۹۹ء میں ''نیرنگ عالم'' گلدستہ جاری کیا۔ اس کی مدت مختصر تھی۔ پھر ۱۹۰۱ء میں ایک ادبی رسالہ ''المصباح'' شائع کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے اس مجلہ کو علمی، تاریخی اور سوانحی مضامین کے لیے مخصوص کیا۔ مولانا آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ پہلا ادبی ماہنامہ تھا جس نے مولانا آزاد کو ایک محدود ادبی حلقہ میں بحیثیت نثر نگار متعارف کرایا۔ چونکہ یہ رسالہ عید کے موقع پر شائع ہوا تھا اس لیے انھوں نے اس رسالہ میں ایک مضمون ''عید'' تحریر کیا تھا جو بعد میں دیگر اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوا۔ مگر یہ رسالہ بھی جلد ہی بند ہو گیا۔ پھر مولانا آزاد ہفتہ وار ''احسن الاخبار'' سے منسلک ہو گئے جو احمد حسن کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔ ایڈورڈ گزٹ شاہجہانپور پہلا ہفتہ وار تھا جس کے مولانا آزاد باضابطہ وقتی ایڈیٹر تھے۔ ''احسن الاخبار'' بند ہونے پر جب احمد حسن نے ''تحفۂ احمدیہ'' جاری کیا تو مولانا آزاد کو اس کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری دی گئی۔ پھر انھوں نے ''الندوہ'' کی ادارت کا فریضہ انجام دیا۔

''ماہنامہ ''خدنگ نظر'' منشی نوبت رائے نظر کا رسالہ تھا جو لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا چند مہینے اس کے حصۂ مضامین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے''(۴)

خدنگ نظر میں مولانا آزاد کی مشغولیت کے متعلق محمد اسحاق بھٹی تحریر کرتے ہیں:

''اس وقت مولانا عمر کے پندرہویں سال میں تھے۔ علامہ اقبال کے بارے میں پہلا تعارفی مضمون اسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا اس وقت اس کے عملۂ ادارت میں شامل تھے اور اس قسم کے مضامین کی اشاعت کے ذمے دار وہی تھے۔''(۵)

۲۰ /نومبر ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد نے ماہنامہ ''لسان الصدق'' کی اشاعت میں کامیابی حاصل کی۔ صحافت کے میدان میں یہ ان کی پہلی نمایاں کامیابی تھی۔ اس رسالے کے بعد وہ ایک کامیاب نثر نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ اس رسالہ میں شائع ہونے والے مضامین کے موضوعات مسلمانوں کی اصلاح معاشرت، اردو کی ترویج و ترقی، منصفانہ تنقید و تبصرہ اور علمی مذاق کی اشاعت پر مبنی ہوتے تھے۔

مولانا آزاد نے ۱۳ / جولائی ۱۹۱۲ء سے ۳۱ / مارچ ۱۹۱۶ء تک ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی شعلہ بار اور پُر وقار تحریروں کے توسط سے فرنگی حکمرانوں کو بار بار ہراساں اور خوف زدہ کیا تھا جس کے نتیجے میں پہلے ''الہلال'' کی ضمانت طلب کی گئی پھر ضمانت ضبط ہوئی اور الہلال کو بند کر دیا گیا۔ پھر انھوں نے الہلال کو البلاغ کی صورت میں شائع کیا، لیکن ابھی اس کے چند شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ انگریزوں نے انھیں بنگال چھوڑنے کا حکم دے دیا اور تقریباً تمام صوبوں میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اُس وقت کے بہار کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، لہٰذا مولانا نے رانچی کو بطورِ قیام گاہ منتخب کیا، جہاں وہ ۰۸ / جولائی ۱۹۱۶ء سے ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء تک نظر بند رہے۔ انھوں نے قیامِ رانچی کے دوران خود کو مختلف کاموں میں مشغول رکھا۔ اپنے بیشتر اوقات کو قرآن کریم کی توضیح و تفسیر اور ''ترجمان القرآن'' کی تالیف میں صرف کیا۔ مولانا آزاد اس نظر بندی میں اپنی مشغولیت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''الحمد للہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک نہ کوئی صدا ذوقِ سماع میں مخل ہے اور نہ کوئی منظر مشغولیت میں حارج، غالب وقت تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا ہے کہ تمام تر کتابِ عزیز و سنّتِ مطہّرہ کی شرح و تفصیل پر مشتمل ہیں۔ اس سے جس قدر مہلت نکلتی ہے وہ بھی ضائع نہیں جاتی۔''(۶)

اس کے علاوہ بھی انھوں نے مختلف مقامات پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، جن میں قلعۂ احمد نگر کی اسیری قابل ذکر ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود وہ اپنے علمی کارناموں میں مشغول رہے اور خطوط کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر اور اعلیٰ افکار و خیالات کی تشہیر کرتے رہے، غبار خاطر اس کی زندہ مثال ہے۔ ان کے خطوط کی معنوی اقدار عہدِ حاضر میں بھی نہایت سبق آموز ہیں۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے ان کے اسلوبِ نگارش

اوران کی تحریر میں مخفی معنوی افکار کی بلندی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر   نظمِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

رانچی کی نظر بندی کے بعد مولانا آزاد کلکتہ واپس آئے۔ گاندھی جی ایک عرصے سے مولانا آزاد سے ملاقات کے خواہشمند تھے، چنانچہ انھوں نے کلکتہ میں ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد سے ملاقات کی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے اور متعدد جلسوں میں باہم شریک ہوتے رہے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی رہنمائی میں کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا، جس میں تحریکِ خلافت اور عدم تعاون کے پروگرام پر غور وخوض کیا گیا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ خلافت کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے عدم تعاون کی تحریک ضروری ہے۔ اس کے بعد مولانا آزاد، گاندھی جی کے ساتھ مختلف جلسوں میں شرکت کر کے آزادی سے متعلق زبردست تقریریں کرتے رہے۔ ان کی زندہ تقاریر و پائندہ خطبات کتابی شکل میں بنام ''خطباتِ آزاد'' دستیاب ہیں جن کے افکار وخیالات سے عصرِ حاضر کے افراد بھی ہمیشہ مستفید و مستفیض ہوتے رہیں گے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء کو کانپور میں آل انڈیا خلافت کانفرنس مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں عالمِ اسلام کے تغیّرات، ملک کے داخلی معاملات، مسلمانانِ ہند کے حالات اور ہندوستان کو درپیش مشکلات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے اہلِ ہند کو مذہب، زبان، رسم ورواج اور تہذیب و معاشرت کے نتیجے میں واقع ہونے والے اختلافات کو دور کرنے کا مشورہ دیا۔ جہل وغفلت کے خاتمے پر زور دیا، کیونکہ ان سے بے شمار خرابیاں لاحق ہوتی ہیں۔ انھوں نے عزم وحوصلہ، استقلال واستقامت اور جوانمردی و پائداری کے ساتھ حصولِ مقصود کے لیے دعوتِ عمل دیتے ہوئے ذکر کیا ہے:

''آیئے، اپنی طلب وسعی کا سفر از سرِ نو شروع کر دیں، ہمارا سفر قوموں اور ملکوں کا سفر ہے۔ ہمیں انسانی اولوالعزمی اور فیروزمندی کی طرف جانا ہے۔ ہمیں اپنی گم گشتہ سعادت کا سراغ لگانا ہے۔ ہمیں اپنی راہ سے بے شمار رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ ہمیں خطروں اور مصیبتوں کے بیابان طے کرنے ہیں۔ خدارا مجھے جواب دیجیے، کیا ایسے عظیم و گراں بار مقصد کے لیے راہ کی درازی اور سفر کی تھکن محسوس کی جاسکتی ہے؟ ---------۔ اگر ہمیں موت سے زندگی، پستی سے بلندی اور ذلت سے شرف وعظمت کی طرف پلٹنا ہے، تو ہمیں نہیں معلوم ایسے کتنے ہی سفر پیش آئیں گے اور ہر مرتبہ ہمیں نئے عزم اور تازہ ہمّت کے ساتھ اٹھنا اور بڑھنا پڑے گا۔ اگر ہم مقصود سے غافل نہ ہوں اور صرف سفر ہی جاری رکھیں تو یقین کیجیے، اس راہ میں چلتے رہنا ہی بجائے خود مقصود ہے:

رہروان را خستگی راہ نیست   عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست (۷)''

مولانا آزاد تقسیمِ ہند کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے اس تقسیم کے سبب ہونے والے نقصانات کی نشاندہی بھی کی تھی، ان کا خیال تھا کہ تقسیمِ ہند سے ہمارے ملک وملّت کو زبردست صدمہ پہنچنے والا ہے۔ یہاں

کے باشندوں کے سر پر ایسی قیامت آئے گی جس کا اُس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لاکھوں کروڑوں افراد کی جان ومال، عزّت وآبرو، گھر اور جائداد، تجارت وکاروبار اور صنعت وحرفت تباہ وبرباد ہوجائیں گی۔ چنانچہ انھوں نے ان اندیشوں کا اظہار کیا تھا:

''تم کو یہ سبز باغ دکھایا جارہا ہے، آئندہ جب اس کے ہولناک نتائج سامنے آئیں گے اور تم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے، تب تم کو ہوش آئے گا اور اپنی غلطی کا احساس کروگے اور تمہاری حمایت کا دم بھرنے والے بالکل ہی غائب ہوجائیں گے۔'' (۸)

مولانا نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا، تقسیمِ ہند کے بعد وہ سو فیصد درست ثابت ہوئے، ہمارے عزیز ملک کے کروڑوں افراد بے گھر ہوگئے، ان کی عزت وآبرو تار تار ہوگئی، بے شمار اشخاص لقمۂ اجل بن گئے، ہر جانب خوں ریزی وسفاکی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ مختصر یہ کہ تقسیمِ ہند کے شدید اختلافات کے بعد زبان، رنگ ونسل، علاقائیت اور مذہب وملت کے نام پر معرکہ آرائی ہوئی۔ ان اختلافات وسفّاکیت کے نتیجے میں تقسیم در تقسیم عمل میں آئی۔ اور آج بھی پاکستان میں امن وامان کی صورتِ حال نہایت تشویش ناک ہے۔ دہشت گرد تنظیمیں وحشیانہ کارروائیوں میں مشغول ہیں۔ آئے دن بم دھماکوں سے انسانیت کا خون ہورہا ہے اور آج پاکستان کی شناخت دہشت گرد تنظیموں کی پناہ گاہ کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ افسوس کہ تقسیمِ ہند سے متعلق مولانا آزاد کے افکار وخیالات اور نظریات وتجزیات کو نظر انداز کر دیا گیا ورنہ تقسیم کے بعد اور موجودہ دور کے بدترین حالات سے نجات مل سکتی تھی۔

مولانا کا خیال تھا کہ ہمارے عزیز ملک کا سرمایہ خواہ ثقافتی ہو یا ادبی، اس پر صرف ہم ہندوستانیوں کا حق ہے، وہ ہمیں ملنا چاہیے، چنانچہ انھوں نے لندن میں انڈیا آفس لائبریری سے متعلق اس کے کارپردازوں سے مفصل گفتگو کی کہ اس لائبریری میں موجود تمام ہندوستانی آثار قدیمہ کو ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔ محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے لندن کی ایک پریس کانفرنس میں برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ انڈیا آفس کے ہندوستانی آثار قدیمہ جن کی قیمت کئی کروڑ تک پہنچتی ہے اور جو تاریخی اعتبار سے بھی ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، اب ہندوستان کو واپس دیے جائیں'' (۹)

اس موضوع پر پاکستان کو للکارتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:

''ہم پاکستان کے ارکانِ حکومت سے بجا طور پر پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی ملک کی تقسیم کے بعد بارہا یورپ کی سیر کی، لندن بھی گئے اور ہر مرتبہ پرانی یادگاریں دیکھیں، کیا ان کے نزدیک انڈیا آفس کے آثار قدیمہ میں پاکستان کا کوئی حصہ نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو وہ اسے کیوں مرکزِ التفات نہیں ٹھہراتے؟ اور کیوں برطانیہ سے اپنے ان گراں بہا ثقافتی خزائن کا مطالبہ نہیں کرتے؟'' (۱۰)

پھر مولانا ابوالکلام آزاد پاکستان کی خارجہ پالیسی پر سخت تنقید کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں:

''جب یہ ملک اس بات کا مدعی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت کا مظہر ہے تو پھر کیوں ہندوستان کے اُن مسلمان سلاطین کی یادگاروں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو آثار قدیمہ کے طور پر انڈیا آفس میں مقفل پڑی ہیں؟ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی طرح کیا پاکستان کے وزیر تعلیم بھی ان ذخائر کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں۔''(۱۱)

انھوں نے وزارت تعلیم کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت کی ترویج و ترقی کے لیے متعدد ادارے قائم کیے۔ مولانا آزاد نے ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے نظام کو درست کرنے کے لیے مختلف تعلیمی ادارے قائم کیے، بالخصوص ان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کو منظم کرنے اور اصلاحِ تعلیم کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی اور ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹیہ اکیڈمی، للت کلا اکیڈمی، آرٹس اکیڈمی، آئی سی سی آر اور آئی آئی ٹی وغیرہ جیسے تعلیمی و ثقافتی اداروں کا قیام بھی ان کے کامیاب قائد، علم دوست رہنما اور دانشمند سیاستداں ہونے کی دلیل ہے۔ تعلیمی میدان میں وضع کردہ ان کے بنیادی اصول آج بھی تمام ہندوستانیوں کے لیے کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ اور ان کے توسط سے قائم شدہ تعلیمی و ثقافتی ادارے ترقی کی منزلیں طے کرنے میں مشغول ہیں جس کے نتیجے میں روز بروز علوم و فنون کی جدید تحقیقات منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کد و کاوش، جدوجہد اور جانفشانی و عرق ریزی سے جن مفید تعلیمی افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کے نتیجے میں ان کی ذات علمی حلقوں میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گی اور انھیں عزت و وقار کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ انھوں نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ زرّیں حروف میں تحریر کرنے کے قابل ہے اور ان جیسی نابغۂ روزگار، لائق و فائق اور اعلیٰ ظرف شخصیتیں زمانے میں بہت کم وجود میں آتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆☆☆

حواشی و منابع:

(۱) معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد، صفحہ ۱۱۲، عبدالقوی دسنوی، نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

(۲) خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۲۰۵، ساہتیہ اکادمی دہلی

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نابغۂ روزگار شخصیت، صفحہ ۷۷، محمد اسحاق بھٹی، ناشر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۴) ایضاً، صفحہ ۵۲

(۵) ایضاً، صفحہ ۵۳

(۶) تلاشِ آزاد، صفحہ ۸۶، عبدالقوی دسنوی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، بحوالۂ تذکرہ ابوالکلام، صفحہ ۳۳۴، ساہتیہ اکادمی دہلی

(۷) خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۲۱۸، ساہتیہ اکادمی دہلی

(۸) مولانا ابوالکلام آزاد، صفحہ ۲۷۲، ضیاء الدین اصلاحی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

(۹) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نابغۂ روزگار شخصیت، صفحہ ۷۹، مصنف محمد اسحاق بھٹی، ناشر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۱۰) ایضاً، صفحہ ۷۹

(۱۱) ایضاً، صفحہ ۷۹

☆☆☆☆☆

Dr. Zishan Haider
Assistant Professor in Persian, MANUU Lucknow
Campus, C-9, H Park, Mahanagar Ext., Lucknow 226006,
Mob. 9336027795, Email: zishaanhaider@yahoo.com

سیفیہ کالج میں اردو کے تحقیقی مقالات

سید حیدر عباس رضوی

سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج شہر بھوپال کا ایک معروف غیر سرکاری تعلیمی ادارہ ہے۔اس تعلیمی ادارے میں آرٹس، کامرس، سائنس، قانون اور تعلیم کی فیکلٹیز کے اٹھارہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں، جن میں سے پندرہ مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی جاری ہے۔اس تعلیمی ادارے کی ابتدا سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر انتظام ۱۹۴۵ء میں ایک پرائمری اسکول کی صورت میں ہوئی تھی۔ ادارے کے بانی ملا سجاد حسین کا تعلیم کے باغ میں لگایا ہوا یہ ننھا سا پودا اب ایک تناور شجر بن گیا ہے۔

تحقیق دراصل سچائیوں کی تلاش کا ایک مسلسل عمل ہے، اسی لیے تحقیق میں کوئی کارنامہ کبھی حرف آخر نہیں ہوتا کیونکہ نئی سچائیوں کے منظر عام پر آنے کے امکانات ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ادبی تحقیق دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔آزاد یا غیر جامعاتی تحقیق اور دوسری جامعاتی تحقیق۔اردو میں آزاد یا غیر جامعاتی تحقیق کے خاص نمائندے محمد حسین آزادؔ، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، مالک رام، ڈاکٹر حنیف نقوی وغیرہ ہیں۔جامعاتی تحقیق کے چار مدارج پوسٹ گریجویٹ کے ڈزرٹیشن، ایم فل، پی ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ ہیں۔ڈزرٹیشن جامعاتی تحقیق کا ابتدائی مرحلہ ہے، جس کے تحت پوسٹ گریجویشن سطح کے طلبا کو قدرے محدود، مقامی اور علاقائی موضوعات پر ضروری معلومات کی تلاش، ترتیب، زبان و بیان، اسلوب تحریر نیز پیشکش کی تربیت دی جاتی ہے۔

ایم فل میں تحقیق کے فن کی حقیقت، تحقیق کے اصولوں اور متنوع طریقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ انھیں الگ الگ مدارج کے لیے تحقیق کے موضوعات کے تعین کے تقاضے، موضوع کے خاکے(Synopsis) کی تیاری، مخطوطہ شناسی، لائبریری سے استفادے کے طریقے اور کتب فہرست تیار کرنے کے جدید طریقے وغیرہ سکھا کر سنجیدہ تحریر اور دیدہ زیب پیشکش کی تربیت دی جاتی ہے نیز ریسرچ اسکالرس کو پی ایچ۔ڈی نیز ڈی لٹ کے اعلا معیاری تحقیقی کاموں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ڈی لٹ میں تلاش، تحقیق، تنقید اور علمی نثر کے ایک وسیع منصوبے کی تکمیل کرائی جاتی ہے۔سیفیہ کالج میں ایم اے اردو کے طالب علموں نے ۱۹۷۰ء سے اب تک جو ڈزرٹیشن لکھے ہیں ان میں سے چند خاص عنوانات اس طرح ہیں:

۱۔دارالمصنفین اعظم گڑھ کی علمی و ادبی خدمات	توفیق محمد خاں	۱۹۰۷ء
۲۔علی عباس حسینی شخصیت اور فن	محمد امین راہی	۱۹۷۰ء
۳۔اردو غزل کا نیا لہجہ	سید متین الرحمان	۱۹۷۰ء

۴۔شادؔ عارفی شخصیت اور فن	مظفر حنفی	۱۹۷۱ء
۵۔علامہ سید سلیمان ندوی	عمر حیات خاں غوری	۱۹۷۲ء
۶۔فسانۂ آزاد کا تنقیدی مطالعہ	اقبال مسعود	۱۹۷۲ء
۷۔اردو کے منفرد خط نگار	افتخار حسین	۱۹۷۲ء
۸۔موازنۂ انیس و دبیر اور اردو ناقدین	سید ظہور الاسلام	۱۹۷۲ء
۹۔جنگ آزادی اور اردو شاعری	ماجد حسین صدیقی	۱۹۴۷ء
۱۰۔اقبال اور ہندوستان	برجیس جہاں	۱۹۷۴ء
۱۱۔ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اور مرزا غالب	حدیقہ بیگم	۱۹٦۷ء
۱۲۔اردو خط نگاری	فرحت جہاں	۱۹۷٦ء
۱۳۔مشاہیر کا تعلق ریاست بھوپال سے	ارجمند بانو	۱۹۸۳ء
۱۴۔ڈاکٹر عبدالودود کی علمی خدمات	مشتاق احمد	۱۹۹۵ء
۱۵۔فضل تابش شخصیت اور خدمات	اسماء نگین	۱۹۹۸ء
۱٦۔محمد ابراہیم خلیل شخصیت اور کارنامے	سیدہ رشدیٰ	۱۹۹۸ء
۱۷۔شیفتہ فرحت بحیثیت طنز و مزاح نگار	مسز طاہرہ خاں	۱۹۹۸ء
۱۸۔عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری	راحلہ بانو	۲۰۰۱ء
۱۹۔نظیرؔ اکبر آبادی کی شاعری میں موسم، تہوار، میلے ٹھیلے اور تماشے	یاسمین پروین	۲۰۰٦ء
۲۰۔شوکت تھانوی کی ظرافت کا مطالعہ	سیدہ بشریٰ بیگم	۲۰۰٦ء
۲۱۔اردو شاعری اور شکیلؔ بدایونی	نسرین جہاں	۲۰۰٦ء

سیفیہ کالج میں ایم اے اردو امتحانات کے لیے لکھے گئے کئی ڈزرٹیشن نہایت بلند معیار ہیں، مثلاً توفیق محمد خاں کا مقالہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی علمی و ادبی خدمات، محمد امین راہی کا مقالہ علی عباس حسینی شخصیت اور فن، عمر حیات خاں غوری کا مقالہ علامہ سید سلیمان ندوی، اقبال مسعود کا مقالہ فسانۂ آزاد کا تنقیدی مطالعہ، مظفر حنفی کا مقالہ شادؔ عارفی شخصیت اور فن اور سید ظہور الاسلام کا مقالہ موازنۂ انیس و دبیر اور اردو ناقدین اپنی دقیق معلومات، سنجیدہ مباحث، استخراج نتائج، معقول ترتیب، شائستہ تنقید، ادبی زبان، موثر اسلوب تحریر اور دلکش پیشکش غرض ہر لحاظ سے منفرد ہیں۔ یہ کہنا جسارت بے جا نہیں کہ مذکورہ مقالات پی ایچ۔ڈی کے معیار کے قریب قریب پہنچتے ہیں۔ان میں سے سید متین اور ظہور الاسلام کے مقالے کتابی صورت میں شائع ہو کر اہل علم کی حوصلہ افزائی بھی حاصل کر چکے ہیں۔ڈاکٹر عبدالودود نے شعبۂ اردو کے مقالات پر اپنے مضمون ''شعبۂ اردو کے تحقیقی مقالات'' میں ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ہر مقالے کی نہ صرف تعریف کی بلکہ ان کو بہتر بنانے کے مشورے بھی شامل کیے ہیں۔

پی ایچ۔ڈی کی سند کے لیے سیفیہ کالج برکت اللہ یونیورسٹی کا ایک تسلیم شدہ تحقیقی مرکز ہے۔ کالج کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عبدالقوی دسنوی ۱۹۷۱ء میں برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال میں اردو ڈاکٹریٹ کے مقالوں کے لیے نگراں مقرر ہوئے۔ ان کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کی سند کے لیے پہلا مقالہ مظفر حنفی نے لکھا جس پر ۱۹۷۴ میں یونیورسٹی نے سند تفویض فرمائی۔ اس شعبے کے تحقیقی مرکز سے وابستہ اور دیگر اساتذہ جو پی ایچ۔ڈی مقالوں کے نگراں ہیں اور رہے ہیں، ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

۱۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی
۲۔ پروفیسر سید حیدر عباس رضوی
۳۔ ڈاکٹر محمد نعمان خاں
۴۔ ڈاکٹر مختار شمیم
۵۔ پروفیسر آفاق احمد

اس کالج سے پی ایچ۔ڈی کی سند کے لیے پینتیس سے زیادہ مقالات لکھے گئے ہیں لیکن تمام مقالات کالج لائبریری اور شعبۂ اردو کی لائبریری میں موجود نہیں ہیں لہٰذا یہاں صرف دستیاب مقالات کے عنوانات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ شاد عارفی شخصیت اور فن	مظفر حنفی
۲۔ اقبال اور اردو غزل	محمد ایوب خاں
۳۔ عبدالرحمان بجنوری حیات اور ادبی خدمات	حدیقہ بیگم
۴۔ اردو تنقید کا مارکسی دبستان	نسیم شہنوی
۵۔ سرونج کی ادبی خدمات	شان احمد
۶۔ انضمام کے بعد بھوپال میں اردو نثر	محمد نعمان خان
۷۔ ترقی پسند شاعری ایک جائزہ	یعقوب علی خاں
۸۔ بھوپال سے دستیاب مرزا غالب کے سرمایہ نظم و نثر کا جائزہ	عشرت رشید
۹۔ واحد پریمی حیات اور شاعری	توحید جہاں
۱۰۔ عشرت قادری کی شاعری کا مطالعہ	صبیحہ اختر
۱۱۔ اردو میں سفرناموں کی روایت	آصف سعید خاں
۱۲۔ حسرت موہانی کی غزلوں میں تہذیب عاشقی کا مطالعہ	سید عاقل عباس

۱۳۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو غزل (۱۹۵۰ء کے بعد) برکت حمید (رپورٹس کا انتظار ہے)

ان مقالات میں ''شاد عارفی کی شخصیت اور شاعری'' پر مظفر حنفی کا مقالہ ایک اچھی تحقیقی تحریر ہے۔ چونکہ مقالہ نگار شاعری میں شاد عارفی سے مشورہ سخن کرتے تھے لہٰذا اس میں اظہار عقیدت کا عنصر بھی شامل ہو گیا

ہے۔ مظفر حنفی نے منصف مزاج ریسرچ اسکالر کی ذمہ داری کو نباہتے ہوئے مقالے کو متوازن رکھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔

حدیقہ بیگم کا مقالہ ''عبدالرحمان بجنوری حیات اور ادبی خدمات'' اردو میں اعلا درجہ کی تحقیق کا معیاری نمونہ ہے۔ مقالے کے نگراں عبدالقوی دسنوی کے علاوہ حدیقہ بیگم کو ان کے شوہر ڈاکٹر سید حامد حسین کا بھی بھرپور تعاون فطری طور پر حاصل تھا۔ ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر اور اردو کے معتبر ناقد تھے۔ ان کی محتاط نگاہوں کا دیکھا ہوا یہ مقالہ یقیناً قابل تعریف ہے، چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ سیفیہ کالج ہی نہیں برکت اللہ یونیورسٹی میں پیش کیے گئے اردو مقالات میں یہ ایک ممتاز تحقیقی کاوش ہے۔

راقم الحروف کی نگرانی میں لکھا گیا عشرت رشید کا مقالہ ''بھوپال میں دستیاب مرزا غالب کے سرمایہ نظم و نثر کا جائزہ'' ایک اعلا اور بلند معیار تحقیقی مقالہ ہے۔ افسوس کہ مقالہ نگار کی عمر نے وفا نہیں کی اور سند تفویض کیے جانے کے تھوڑے عرصے بعد وہ فوت ہو گئیں اور یہ تحقیقی کام گمنامی میں رہ گیا۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر غالب کے سرمایہ نظم و نثر میں بھوپال سے ہونے والے اضافوں کی تحقیق اور قدر و قیمت کا تعین نہ صرف غالبیات میں اضافہ بلکہ شہر بھوپال کا ادبی امتیاز بھی ہے۔ اس مقالے نے دو نئی کتابوں ''غالب کا بھوپالی کلام'' اور مکمل تر اردو کلیات غالب کی تدوین کے امکانات روشن کر دیے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل کے اردو محققوں میں سے کون اور کب اس کام کی تکمیل کے لیے آگے آتا ہے۔

عاقل عباس کا مقالہ ''حسرت موہانی کی غزلوں میں تہذیب عاشقی کا مطالعہ'' تحقیق میں ایک نئے افق کی تلاش ہے۔ برکت اللہ یونیورسٹی سے حاصل کی گئی مقالے کے ممتحن حضرات (جن کے نام ظاہر نہیں کیے گئے ہیں) کی رپورٹس کے اقتباسات اس طرح ہیں:

۱۔ اردو میں پی ایچ۔ڈی کی سند کے لیے سید عاقل عباس کے مقالے کا میں نے مطالعہ کیا۔ حسرت اور ان کی شاعری کے بارے میں متعدد حقائق پر مشتمل یہ ایک بلند پایہ تحقیق ہے۔ اس کی پیش کش نیز ابواب کی تقسیم عمدہ اور لائق اطمینان ہے۔

۲۔ سید عاقل عباس نے اس مقالے میں حسرت موہانی کی غزلوں میں تہذیب عاشقی کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ یہ ایک ایسا اچھوتا (انوکھا) موضوع ہے جس کو کسی محقق یا نقاد نے چھوا تک نہیں۔ ریسرچ اسکالر نے بہترین کام کیا ہے۔ اس نے معروضی انداز میں نتائج کا استخراج از خود کیا ہے۔ اس کی زبان اور اسلوب نہایت عمدہ ہیں۔ میں ریسرچ اسکالر کے تئیں اس انوکھے موضوع پر نہایت اعلا معیار مقالے کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ میں اس مقالے کے نگراں کو بھی جنھوں نے اس بلند معیار تحقیقی مقالے کی تکمیل میں ریسرچ اسکالر کی ہمہ گیر رہنمائی فرمائی، مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں یہ بھی سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ بجنسہٖ شائع کرایا جائے۔

(انگریزی رپورٹ کے اقتباس کا ترجمہ)

مجموعی طور پر سیفیہ کالج نے جامعاتی اردو تحقیق میں نہایت بلند معیار قائم کیا ہے۔ تحقیق کی اس روایت

کو آگے بڑھانا سیفیہ کالج کے موجودہ اردو اساتذہ اور ارباب حل وعقد کی ذمہ داری ہے۔ بلند تر تحقیقی معیار کے اردو مقالات کی مستقبل کے ریسرچ اسکالرس سے امیدیں وابستہ رکھنا، شہر بھوپال، سیفیہ کالج اور تحقیق کے طلبا سب کے لیے مفید ہوگا۔ مستقبل میں اردو تحقیق کے اس بلند معیار کو قائم رکھنا اور بہتر بنانا تحقیق کے طلبا کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

☆☆☆☆☆

Prof. Syed Haider Abbas Rizvi,
7/6 Creative Garden, Saifia College Gate,
Ahamdabad Palace Road, Koh Fiza,
Bhopal 462001 M.P,
Mob. 08120126728

سفرنامہ نگاری کا آغاز اور تاریخی ارتقا

فیضان حیدر

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ سفر انسانی زندگی کا ایک جز و لاینفک ہے، جس کے بغیر انسانی زندگی کسی بھی اعتبار سے مکمل نہیں ہوسکتی۔ سفر کا آغاز ابتدائے خلقت سے ہی ہو چکا تھا اور مسافر اپنے سفر کی روداد صرف زبانی اپنے دوست احباب اور اہل خانہ کو سفر سے واپسی کے بعد سنادیا کرتے تھے۔ خط کی ایجاد سے قبل انسان سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات وحادثات کی تصویر بنا دیتے تھے تاکہ بعد میں آنے والوں کو معلوم ہوسکے کہ یہاں یہ حادثہ یا واقعہ رونما ہوا تھا۔ خط کی ایجاد کے بعد یہی واقعات وحادثات تحریری صورت میں لکھے جانے لگے۔

بعد کے ادوار میں بہت سے مسافروں اور سیّاحوں نے دنیا کے مختلف خطوں کا سفر کیا اور اپنی مفید معلومات قلمبند کیں۔ بہت سے سفرنامہ نگار ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس زمانے میں سفر کیا جب سفر اتنا آسان نہیں تھا، اور سفر سے حاصل شدہ معلومات، تجربات ومشاہدات اور تاثرات کو کتابی صورت میں بیان کیا۔ لیکن ان کے سفرنامے حادثات زمانہ کی نذر ہوگئے یا گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ گنتی کے افراد ہوں گے جنھوں نے ابتدائی ادوار میں سفرنامے لکھے اور بعد کو ان کے سفرنامے، سفرنامہ کی تاریخ مرتب کرنے اور اس کی کڑی سے کڑی جوڑنے میں معاون ثابت ہوئے۔ ان میں سے کچھ سفرناموں کی تو فقط تاریخی حیثیت ہے۔ ہاں ایسے سفرنامے بھی موجود ہیں جن کو فن پارہ ہونے کا درجہ نصیب ہوا اور ان کے مصنفین کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ ہیروڈوٹس، فاہیان، ہیون سانگ، ابن ہیکل بغدادی، البیرونی، ناصر خسرو، ابن بطوطہ اور مارکو پولو کے سفرنامے، سفرنامہ کی تاریخ مرتب کرنے میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان افراد نے دریاؤں، سمندروں کی چھاتیوں کو چیرتے ہوئے، صحراؤں کو سر کرتے ہوئے، پہاڑوں اور ریگستانوں سے گذرتے ہوئے دلیرانہ انداز میں سفر کیا اور اپنی سفری روداد کو تحریری صورت بخشی۔

شروع شروع میں چونکہ سفر اتنا آسان نہیں تھا اس لیے جو بھی سفر پر جاتا تھا وہ سفر کی مشکلات، دشوار گزار سفری مراحل اور راستوں کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند کر دیا کرتا تھا۔ ابتدا میں برّی سفر سے زیادہ بحری سفر کی روداد گائڈ بکوں میں لکھی جاتی تھی اور سفرنامہ نگار بحری سفر کے کوائف بڑے شدومد کے ساتھ قلمبند کرتا تھا۔ اس میں راستے کی سمتوں کا تعیّن، راستے میں پیش آنے والی دشواریوں اور سفر کے دوران پیش آنے والے ممکنہ حادثوں کا بیان ہوتا تھا، تاکہ بعد کے آنے والے مسافروں کے لیے یہ سفری کوائف خضر راہ ثابت ہوں۔

شروع شروع میں سفرنامے کا دامن بہت تنگ تھا اور اس میں صرف مسافروں کی رہنمائی کے لیے سفری راستوں اور سمتوں کا تعیّن کیا جاتا تھا، اور راستے میں پیش آنے والے حادثات اور ان سے بچاؤ کے

طریقے بیان کیے جاتے تھے۔ اگر سفر بری ہے تو انسان کو کیسے سفر کرنا چاہیے اور اپنے ساتھ کیا کیا چیزیں لے جانا چاہیے۔ سفر میں جانوروں اور درندوں سے کیونکر محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اگر سفر بحری ہے تو راستوں کے تعین کے ساتھ سمندری جانوروں سے حفاظت کے طریقے بھی بیان کیے جاتے تھے۔لیکن بعد کے ادوار میں واقعات وحادثاتِ سفر کو بھی درج کیا جانے لگا۔ سفر نامہ نویس اپنے تجربات ومشاہدات کو انوکھے انداز میں بیان کرنے لگا اور اب موجودہ دور میں جب کہ سفر عام ہو چکا ہے، سفر ناموں میں صرف سفر کی روداد ہی درج نہیں کی جاتی بلکہ سفر نامہ نگار روداد سفر کے ساتھ واقعات پر اپنا عمل اور ردّ عمل بھی ظاہر کرتا ہے۔ پورے سفر نامے میں سفر نامہ نگار کی شخصیت اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتی ہے، ساتھ ہی سفر نامے سے سفر نامہ نگار کے ذہن ودماغ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

جب ہم سفر نامہ نویسی کے آغاز پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل عالمی ادب میں سفر نامے لکھے گئے۔ اس طرح ہم اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مسافر اپنے سفر کی روداد خطوں، بیاضوں اور روزنامچوں کی شکل میں لکھا کرتے تھے اور واقعات کے بیان میں اکثر مبالغے سے کام لیتے تھے، جس کی وجہ سے اکثر واقعات اور حقائق مسخ ہو جاتے تھے اور ان کے ذریعہ لکھی گئی آپ بیتیاں یا سفر بیتیاں داستان کی صورت اپنا لیتی تھیں۔ مافوق الفطری عناصر اور دیو مالائی قصے کہانیاں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھیں کہانیوں کے بطن سے سفر نامے کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے آج کی موجودہ صورت اختیار کر گئی۔

درحقیقت سفر نامہ نگاری اس دور قدیم کی دین ہے جب لوگ تجارت، تبلیغ دین وغیرہ کی غرض سے سفر کیا کرتے تھے، بعد میں مہم جوئی بھی اس کا ایک اہم سبب بنی۔ مہم جوئی کے آغاز کے ساتھ ہی سفر نامے کی تحریریں اور بھی دلچسپ ہوتی گئیں اور تحقیق وتلاش کے جذبے نے مصنفین کو ماضی کے اوراق پلٹنے پر مجبور کیا۔ رفتہ رفتہ سفر کی رفتار بدلتی گئی اور سفر کرنا اتنا مشکل نہیں رہ گیا۔ اس طرح دوسروں کے ذریعہ لکھے گئے سفر ناموں کے مطالعے کے بعد لوگوں کا جذبۂ سفر اور تجسّس اور بڑھا اور وہ خود بھی سفر پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے ان معلومات کی جو سفر ناموں کے ذریعے حاصل کی تھیں، تصدیق یا تردید کی۔ جوں جوں سفر آسان ہوتا گیا ہر فرد اپنے سفر کی روداد اور معلومات قلمبند کرنے کی فکر کرنے لگا نیز ان میں سے بعض نے تخیل کی مدد سے اپنے سفر ناموں میں ان مقامات کی بھی سیر کرائی جہاں انھوں نے قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہومر (Homer) کے فرضی سفر نامے اوڈیسی (Odyssey) سے لے کر آج تک عالمی ادب میں بہت سی سفری داستانیں لکھی گئیں، جن میں سے اکثر فرضی واقعات پر مشتمل ہیں، تاہم ان میں سفر نامے کے بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں۔

یونانیوں کا ماننا ہے کہ ہومر آئیونیا (Ionia) کا باشندہ تھا جو ایشیائے کوچک کے مرکزی ساحلی علاقے کا نام تھا۔لیکن بعض محققین اس بات پر مُصِر ہیں کہ ہومر نامی واقعی کوئی شخص نہیں گذرا۔ خود یونانیوں نے 'الیڈ' اور 'اوڈیسی' کو ہومر نامی شخص سے منسوب کر دیا تھا اور اس کے متعلق یہ بات بھی مشہور کر دی کہ وہ اندھا تھا۔ جدید تحقیق

کے مطابق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہومر واقعی ایک گوشت پوست کا انسان تھا اور وہ غالباً آئیونیا کا ہی باشندہ تھا، اس لیے کہ اس کی نظموں کی زبان آئیونک (Ionic) ہی ہے جن میں سفری داستانیں بیان کی گئی ہیں۔

مشہور یونانی مورّخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے ہومر کے زمانے کو اپنے زمانے یعنی پانچویں صدی قبل مسیح سے تقریباً ۴۰۰ / سال پہلے کا زمانہ بتایا ہے۔لیکن بہت سے یونانی اسے ٹرائے (Troy) کی جنگ کے کچھ بعد کے دور سے متعلق بتاتے ہیں۔ جہاں تک ''الیڈ'' اور ''اوڈیسی'' کا تعلق ہے تو ''الیڈ'' کو اس سے منسوب کرنا اشکال سے خالی نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں نظموں کی زبان میں بہت فرق ہے۔لیکن لفظوں کی اسلوبی اور لسانی کیفیت سے پتا چلتا ہے کہ یہ تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہی کارنامہ ہے۔ ایک امریکی محقق ''مل مین پیری'' (Milman Parry) نے یہ انکشاف کیا ہے کہ 'ہومر' کا تعلق شاعری کی ایک قدیمی روایت سے تھا جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔ خود 'ہومر' نے شاعر کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے اس کے معنی 'گویّا' کے ہیں۔ 'اوڈیسی' میں ایسے دو بھائیوں یا گوَیّوں کا ذکر ہے جو قدیم اساطیری قصے، جن میں سفری داستانیں، دیوی دیوتاؤں کا ذکر اور بچھڑے ہوئے لوگوں کے ملاپ کے قصے بیان کیے جاتے، خاص خاص موقعوں پر سنایا کرتے تھے۔ اسی طرح اس کی نظم 'اوڈیسی' میں بھی سفری واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ ان نظموں کی بنیاد فرضی واقعات پر ہے لیکن ان میں سفر کے بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں۔

قدیم ترین تحریری سفر نامے کے سلسلے میں ابھی یہ طے نہیں ہو سکا ہے کہ سب سے قدیم تحریری سفر نامہ کون اور کس کا ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ یونانی سیّاح 'ہیروڈوٹس' سب سے پہلا سفر نامہ نگار ہے جس کا سفر نامہ تحریری صورت میں ملتا ہے اور اس نے سب سے پہلے اپنی سفری روداد تحریری شکل میں پیش کی۔ اس سلسلے میں شپلے (Shiply) لکھتا ہے:

> ''ہیروڈوٹس (متوفی ۴۲۵ ق م) بابائے تاریخ کہلاتا ہے، اسے بابائے سفر نامہ کی بھی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اپنے تجربوں پر سفر ناموں کی عمارت تعمیر کرتا ہے اور ان ملکوں کا حال بیان کرتا ہے جو اس وقت یونان کے علم میں تھے۔ اس طرح سب سے پہلے ہمیں تاریخ کے عظیم شعور سے آشنا کراتا ہے۔ وہ سفر کے حالات نہیں بلکہ ایسے نتائج بیان کرتا ہے جو جغرافیا کی نشاندہی کرتے ہیں'' (۱)

تاریخوں کے سلسلے وار مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونان، روم، ایران اور ہندوستان ایسے ممالک ہیں جہاں صدیوں قبل تہذیب وتمدن کا بول بالا رہا ہے۔ یونانی تہذیب وتمدن نے تمام مشرقی اقوام کو متاثر کیا اور سبھی تہذیبوں نے اس سے کسبِ فیض کیا ہے۔ یہاں ابتدا ہی سے تہذیب وتمدن اور علم وفضل کا رواج دکھائی دیتا ہے۔ یہاں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں جہاں تشنگانِ علوم، علم ودانش سے سیراب ہوا کرتے تھے۔ 'افلاطون' اور 'ارسطو' اسی سرزمین سے اٹھے تھے جن کا عقلی علوم میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہاں کے افراد عقلی علوم کے ساتھ فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور سفر ان کے خمیر میں شامل تھا۔ وہ تجارت، تبلیغ دین اور دوسرے مقاصد کے حصول کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے

تاجروں کے لیے بڑی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ یہ تجارت پیشہ افراد اکثر اپنے ملک ہی میں سفر کیا کرتے تھے، لیکن بعض اوقات ضرورت کے تحت اپنے پڑوسی ملکوں میں بھی سفر کر لیتے تھے۔ جب مسافر اپنے خاندان اور قبیلے میں واپس آتے تو داستانِ سفر ان کے سامنے بیان کرتے۔ سننے والوں کے اشتیاق نے انھیں، واقعاتِ سفر کو کتابی صورت میں ترتیب دینے پر مجبور کیا۔ اس طرح ان کے یہاں سفری روداد لکھنے کا رجحان پیدا ہوا اور انھوں نے سفر نامے قلمبند کیے۔

یونان ہی کی طرح ہندوستان بھی ابتدا ہی سے علم و دانش کا گہوارہ رہا ہے، جہاں بڑے بڑے علما و فضلا نے جنم لیا۔ اس کے علم و فضل کے چرچے چہار دانگ عالم میں رہے ہیں۔ رامائن، مہابھارت، ویدوں اور پُرانوں جیسی عظیم اور شاہکار تصنیفیں اسی سرزمین کی دین ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین باوجود اس کے کہ وہ علم و دانش میں اپنا بدیل نہیں رکھتے تھے، فنونِ حرب میں بھی مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے اس وقت کے ہندوستان کے مذہبی افکار و خیالات اور سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی حالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ان میں سفری داستانیں بھی ملتی ہیں جن میں سفر نامے کے بنیادی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

لیکن سفر نامہ نویسی کے باب میں جو درجہ یونان کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا، اور یونانیوں کے اس اعزاز میں ہندوستان بھی برابر کا شریک ہے۔ یونانی سیاح ''میگ استھیز'' جس نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے تقریباً تین سو سال قبل (۳۰۲ ق۔م۔) ہندوستان کا سفر کیا اور اس زمانے کے راجا ''چندر گپت موریہ'' کے دارالسلطنت ''پاٹلی پُتر'' (موجودہ پٹنہ) آیا۔ یہ یونانی سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور کئی سال یہاں مقیم رہا۔ اس نے ہندوستان کو بہت قریب سے دیکھا اور یہاں کے علمی، تہذیبی، سماجی اور اقتصادی حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ اس نے عوام سے اچھے تعلقات قائم کر لیے اور یہاں کی تہذیب و ثقافت سے بہت متاثر ہوا اور اپنے سفری کوائف کو کتابی شکل دے دی۔ دریافت شدہ معلومات کی بنا پر اس کا نام 'Indica' (سفر نامۂ ہند) ہے۔ اس کا یہ سفر نامہ دنیا کا پہلا سفر نامہ ہے جسے باقاعدہ طور پر سفر نامہ کہا جا سکتا ہے اور اس کا شمار دنیا کی قدیم ترین تصانیف میں کیا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں 'چندر گپت موریہ' کے عہد کا جیتا جاگتا ہندوستان ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی بادشاہ 'سکندر اعظم' نے اسی سفر نامے کو پڑھنے کے بعد ہندوستان کے کچھ علاقوں پر حملہ کیا تھا۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کیونکہ سکندر نے ہندوستان پر تین سو پچیس قبل مسیح حملہ کیا تھا۔

سفر نامے کی تاریخ میں چینی راہب ''فاہیان'' (۳۳۷ء-۴۲۲ء) کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک چینی بدھ سیّاح تھا جس نے اس وقت پیدل بدھ مت کے مقامات کا سفر کیا۔ 'گوتم بدھ' ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی نشو و نما ہوئی۔ انھوں نے خدا تک پہنچنے کے لیے بڑی ریاضت کی، ایک مدّت تک حلقہ بگوش رہے اور کامیابی کے بعد انھوں نے اسی سرزمین سے اپنے افکار و نظریات کی نشر و اشاعت

کی۔ ان کے اخلاق، کردار اور مثبت رویّے سے ایک بڑی جماعت ان کی مرید ہو گئی۔ اس طرح رفتہ رفتہ بدھ ازم نے پورے ہندوستان پر غلبہ حاصل کر لیا، لیکن برہمن سماج نے جس کی جڑیں ہمیشہ سے اس ملک میں مضبوط رہی ہیں، جب بدھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھی تو انھیں کھدیڑ دیا۔ یہاں تک کہ انھیں چین اور جاپان میں جا کر پناہ لینی پڑی اور بدھ ازم جس کی ابتدا اور نشو و نما ہندوستان میں ہوئی تھی ملک بدر ہو گئی۔ اس طرح بدھ عقیدتمندوں کی ایک بڑی جماعت اپنے مذہب کی تکمیل اور مقدس مقامات کی زیارت کے لیے ہندوستان آنے لگی۔ انھیں چینی عقیدتمندوں میں سے ایک نام 'فاہیان' کا بھی ہے۔ یہ پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا جب یہاں راجا 'بکرماجیت' کی حکومت تھی۔ اس وقت ہندوستان کی رعایا بڑی خوشحالی سے زندگی بسر کر رہی تھی اور بدھ مت کا پورے ہندوستان میں بول بالا تھا جسے بادشاہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ فاہیان خود بھی بدھ مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے سفر کا مقصد مذہبی تعلیمات حاصل کرنا اور مذہبی کتابوں کی نقول تیار کرنا تھا۔ اس نے اس زمانے کے مشہور مذہبی شہر 'پاٹلی پتر' کے علاوہ ویشالی اور کشی نگر وغیرہ کا بھی سفر کیا اور اپنی علمی اور مذہبی معلومات میں اضافہ کیا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں راجا 'بکرماجیت' کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کا سفر نامہ ایک مستند تاریخی دستاویز ہے جس سے اس زمانے کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی حالات پر گہری نظر پڑتی ہے۔

اس کا یہ سفر اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے قبل کوئی بھی چینی ہندوستان نہیں آیا تھا اور اس کا بنیادی مقصد چین میں بدھ مت کے بگڑتے ہوئے عقائد کی دوبارہ اصلاح کرنا اور انھیں راہ راست پر لانا تھا۔ اس نے اس سفر کے ذریعے بدھ مت کے مذہبی دستاویز جمع کیے اور چین لے گیا۔ اس کا یہ سفر ۳۹۹ء سے ۴۱۲ء تک جاری رہا۔

دوسرے چینی سیاحوں میں ''ہیون سانگ'' (۶۰۲ء-۶۶۴ء) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ یہ راجا 'ہرش چندر' کے دور حکومت میں ہندوستان آیا۔ یہ بھی حق کی تلاش اور اپنی مذہبی تعلیمات کی تکمیل کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس نے ۶۳۰ء سے ۶۴۵ء کے ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں سکونت اختیار کی اور ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ بھی کیا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے نالندہ یونیورسٹی مگدھ (بہار) میں تعلیم بھی حاصل کی اور تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس چین گیا اور وہاں بدھ معبد میں بیٹھ کر اپنے سفر کی روداد لکھی۔ اس نے اپنے سفر نامے میں اس وقت کی عوامی زندگی، رہن سہن، رسم و رواج اور اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ سفر نامہ اپنے عہد کے ہندوستان کا ایک تاریخی دستاویز ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر اور ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب اسلام کی نشر و اشاعت ہوئی تو مسلمان اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے مشرق کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور شام، یمن، چین اور ہندوستان تک پہنچ گئے، یہاں تک کہ گجرات اور مالابار کے ساحلوں پر اپنے جہازوں کے لنگر ڈال دیے۔ انھیں

انوکھی اور عجیب وغریب چیزیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا، ساتھ ہی ان کے متعلق معلومات فراہم کرنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ اس لیے انھوں نے یہاں کی تہذیب وتمدن اور رسم ورواج سے متعلق بیش بہا معلومات حاصل کیں اور اپنی کتابوں میں یہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی کا نقشہ پیش کیا۔

''سلیمان تاجر'' پہلا مسلمان سیّاح ہے جس نے ہندوستان کا سفر کیا اور اس کے ساحلی علاقوں کا بغور جائزہ لیا۔ اس نے یہاں کی تہذیب وتمدّن، رسم ورواج اور رہن سہن کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے سفرنامے میں بیان کیا۔ اس کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات فراہم ہوسکی ہیں اور اب تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ہندوستان اور چین کے سفر اور تجربات ومشاہدات کے متعلق اس نے جو کتاب لکھی ہے اس کا اصل نام کیا تھا۔ اس کی زندگی اور سفر کے متعلق جو بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں وہ اس کی کتاب ہی سے ہوتی ہیں۔ لیکن اتنا مسلّم ہے کہ اس نے یہ کتاب ۲۳۷ ہجری / ۸۵۱ عیسوی میں مکمل کرلی تھی۔

واضح رہے کہ مولوی مہیش پرشاد نے اس کے سفرنامے کا عربی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا جو 'کاشی ناگری پرچارنی سبھا' انڈین پریس بنارس سے تین بار شائع ہوا، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔

مسلمان تیسری صدی ہجری تک چین کے سلسلے میں بہت زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں پہلی بار عرب تاجروں کی چینی تاجروں سے مدبھیڑ ہوئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب عرب سپاہیوں نے ''اُبُلّہ'' بندرگاہ (بصرہ کے قریب) پر قبضہ کرلیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے چند کشتیاں دیکھیں جو چین سے آرہی تھیں، چینی تاجر اس میں اپنے بیچنے کی چیزیں بھر کے تجارت کی غرض سے نکلے تھے۔

سلیمان تاجر سے قبل جو افراد چین گئے اور جن کے نام ہم تک پہنچ سکے ہیں ان میں مشہور خارجی عالم ابوعبید اللہ بن قاسم اور مشہور تاجر نصر بن میمون کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابوسفیان محبوب عبدی کی تصریح کے مطابق یہ دو مشہور ومعروف شخصیتیں ہیں جنھوں نے تیسری صدی ہجری سے قبل ہی چین کا سفر کیا لیکن ان میں سے کسی نے اپنے سفر کے حوالے سے کوئی تحریر بطور یادگار نہیں چھوڑی۔ غالباً سلیمان تاجر سیرافی پہلا ایرانی مسلمان ہے جس نے اپنے چین وہند کے سفر اور اپنے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ کتابی صورت میں پیش کیا جو بہت بعد کو ۱۸۴۵ء میں ''سلسلۃ التواریخ'' کے نام سے شائع ہوا۔

اس کا سفرنامہ دقیق اطلاعات اور عینی شہادات پر مبنی ہے۔ اس کے مستند ہونے کا سبھی تاریخ نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ اس نے اپنے سفرنامے میں وہی چیزیں بیان کی ہیں جن کو یا تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا معتبر افراد سے سنا ہے۔ ''کراچکوفسکی'' سیرافی کے سفرنامے کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

> ''راستوں کے مقامات کو اتنی باریکی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ''فران'' نامی شخص نے اپنے جغرافیائی نقشے میں اس کی پیروی کی۔ وہ عربی اور ایرانی تاجروں کا بہترین نمونہ ہے جنھوں نے چین کا سفر کیا''۔ (۲)

سلیمان نے مقامات سفر کی توصیف اور مسافت کا تعین صرف شب وروز اور فرسخ ہی میں نہیں کیا

بلکہ ساحلوں، جزیروں، مختلف شہروں کے بندرگاہوں، لوگوں کے رہن سہن، کھیتی باڑی، صنعت وحرفت اور اپنے سامان تجارت کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ سیرافی کا یہ سفرنامہ اس کے زمانے سے ہی سیّاحوں، تاجروں، جغرافیا دانوں اور علمائے اسلام کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

تقریباً پچاس سال بعد 'ابن فقیہ ہمدانی' نے سنہ ۲۹۰ ہجری / ۹۳۰ عیسوی میں دو ہزار صفحات پر مشتمل ''کتاب البلدان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سلیمان تاجر کے سفرنامے سے خاطر خواہ استفادہ کیا اور اپنی کتاب کے آغاز میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمدانی کی اصل کتاب ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ صرف اس کا خلاصہ جو ''علی چیزری'' نے ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء میں کیا تھا، باقی رہ گیا ہے۔ جس سے ہمدانی کی اصل مفصّل کتاب کے بارے میں ہمیں پتہ چلتا ہے۔

ایک نامور ملّاح ''شہریار رامہرزی'' نے ''عجائب الہند'' کے نام سے ۳۴۲ھ / ۹۵۳ء میں ایک کتاب عربی زبان میں لکھی۔ اس کتاب میں اکثر مقامات پر اس نے 'سلیمان سیرافی' کی کتاب کا چربہ اُتارا ہے۔ خاص طور سے نویں، تیرہویں اور ایک سو چونتیسویں قصے کو سلیمان کا ذکر کیے بغیر ہو بہو نقل کردیا ہے۔

سفرنامہ نگاری کے باب میں 'سلیمان سیرافی' کا درجہ بہت بلند ہے۔ اسے اسلامی تہذیب وتمدن کے زمانے کا پہلا سفرنامہ نگار ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ مذکورہ باتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ پہلا اور قدیم ترین ایرانی مسلمان ہے جس نے ہندوستان، چین اور اقیانوس ہند کے بحری سفر کے واقعات کتابی صورت میں لکھے، جو ہمارے ہاتھوں تک پہنچی۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے کسی نے اپنے دریائی سفر کے واقعات وحادثات کو سفرنامے کی صورت میں لکھا ہو لیکن اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا ہے۔

سلیمان تاجر نے قرون وسطیٰ کے بہت سے مغربی سفرنامہ نگاروں سے بھی سبقت حاصل کرلی ہے۔ اس نے 'مارکو پولو' سے تقریباً چار صدی قبل اپنا سفرنامہ تحریر کیا۔ اس طرح اس نے ابن فضلان، ابودلف عجلی، ناصر خسرو قبادیانی، ابن جبیر اور ابن بطوطہ وغیرہ سے صدیوں پہلے ہندوستان، چین اور اقیانوس ہند کے سواحلی جزیروں کا سفر کیا اور اپنے تجربات ومشاہدات اور مفید معلومات کو سفرنامے کی صورت میں قلمبند کیا۔

'ابوزید حسن' تیسری صدی ہجری کا ایک مشہور سیاح اور جغرافیا نویس تھا۔ یہ فارس کی مشہور بندرگاہ ''سیراف'' کا باشندہ تھا اور تجارت کی غرض سے چین اور پھر ہندوستان آیا۔ اس نے ۹۲۰ عیسوی میں مسلمان سیاحوں کے سفر کی روداد، سلیمان سیرافی کی داستانِ سفر کی تکمیل کے لیے لکھی۔ اس کے بارے میں معین الدین ندوی رقمطراز ہیں:

> ''یہ تیسری صدی ہجری کا ایک سیاح اور تاجر ہے اور خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ سیراف کا رہنے والا تھا...... یہ سیراف سے ہندوستان اور چین کے درمیان بحری اور تجارتی سفر کیا کرتا تھا۔ اس نے سلیمان تاجر کے سفرنامے کا پچیس تیس برس کے بعد تکملہ لکھا جس میں ہندوستان کے رسم ورواج، تہذیب ومعاشرت، مذہبی اعتقادات اور راجاؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی معلومات کی بنیاد یا

تو چشم دید واقعات ہیں یا مشرقِ اقصیٰ کا سفر کرنے والے دوسرے سوداگروں کے بیانات ہیں۔اس کا یہ تکملہ بھی سلیمان کے سفر نامے کے ساتھ پہلی مرتبہ پیرس سے ۱۸۴۵ عیسوی میں چھپا''۔(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان تاجر کا سفر نامہ ایک مدّت تک اس کے زیرِ مطالعہ رہا ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے ان تمام مقامات اور راستوں وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کی ہے جو سیرافی کے سفر نامے میں مذکور ہیں اور ان واقعات کا تدارک بھی کیا ہے جو اس کے بیان سے رہ گیا تھا۔اس نے تقریباً ۸۷۰ء میں چین کا سفر کیا پھر ہندوستان، خراسان اور عرب کے مختلف علاقوں کا بھی سفر کیا اور اپنی معلومات کو ۹۲۰ء میں سلیمان کی کتاب ''اخبار الصین والہند'' یا ''سلسلۃ التواریخ'' میں شامل کر دیا۔اس کا یہ تکملہ سلیمان سیرافی کے سفر نامے کے اصل متن کے ساتھ بشمول ''حسین قرچانلو'' کے فارسی ترجمہ ''انتشارات اساطیر وبین الملل'' ایران سے شائع ہو چکا ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین مسعودی (۲۸۳ھ/۸۹۶ء-۳۴۶ھ/۹۵۷ء) ایک نامور تاریخ نگار، سیاح اور جغرافیاداں تھا۔اس نے اپنے زمانے کے مشہور مقامات کا سفر کیا اور اپنے تجربات و مشاہدات اور سفری کوائف کو اپنی کتاب ''مروج الذہب و معادن الجواہر'' میں پیش کیا۔یہ کتاب اگرچہ تاریخی کتاب ہے لیکن سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں بھی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ بغداد میں ۲۸۰ھ میں پیدا ہوا اور دنیا کے حقائق اور خبریں حاصل کرنے اور قوموں، معاشروں اور حکومتوں کے بننے بگڑنے کے اسباب سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے تقریباً نصف صدی سیر و سیاحت میں مشغول رہا اور آخر کار مصر کے ''فسطاط'' شہر میں ۳۴۶ ہجری میں وفات پائی۔اس نے شام سے مشرقی افریقا، کالا ساگر، ارمنستان، آذربائیجان، مناطقِ خزر کا سفر کیا، پھر وہاں سے فارس، ماوراء النہر، ہند، سیلان (شری لنکا)، چین، تبت اور مغرب سے انطاکیہ (Intioch) اور استنبول تک کا سفر کیا۔اس نے اپنے سفر میں نہ صرف دوسری قوموں کی تاریخی عمارتیں اور ان کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے بلکہ معتبر کتابوں اور مختلف بیش قیمت منابع تک رسائی حاصل کی اور مختلف سرزمین کے علما و فضلا سے ملاقات کی اور ان سے ان کے ادیان کے سلسلے میں گفتگو بھی کی۔

وہ ایک مشہور تاریخ نگار تھا اور مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھنے کے باوجود صاحب رائے بھی تھا۔تمام عقلی اور نقلی علوم سے بھی آراستہ تھا۔جغرافیا، کلام، فلسفہ اور نجوم سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا تھا، خصوصاً جغرافیا اور تاریخ میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔یہاں تک کہ اس نے جاحظ جیسے عالم و فاضل پر اطلاعات کی فراہمی کے بارے میں تنقید بھی کی ہے۔اپنی کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے:

''اس نے (جاحظ) شہروں اور ملکوں کا زیادہ سفر نہیں کیا۔راستوں اور شہروں سے بھی بالکل انجان تھا۔وہ تاریک رات میں ایندھن جمع کرنے والوں کے مثل دوسروں کی کتابوں سے نقلِ قول کرتا ہے''۔(۴)

اپنی اس کتاب کے بارے میں وہ خود ''مروج الذہب'' کی ابتدا میں لکھتا ہے:

''زمانے کی خبروں کے متعلق ایک کتاب لکھی اور اس میں یہ گفتگو مقدم رکھی کہ زمین کی ساخت، شہروں کے عجائب، دریاؤں، ٹیلوں، گھاٹیوں، پہاڑوں، ندیوں، انوکھے معادن، پانی کے چشموں، مرغزاروں، جنگلوں، دریاؤں میں واقع جزیروں اور جھیلوں وغیرہ کو بیان کروں''۔(۵)

مذکورہ بالا باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے مختلف مقامات کا سفر کیا اور اس کا نچوڑ اپنی کتاب میں پیش کیا۔اس نے ہندوستان کے متعلق بھی بہت سی معلوماتی باتیں تحریر کی ہیں۔اگرچہ وہ دنیائے اسلام میں ایک تاریخ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور اس کی تاریخ نگاری کی وجہ سے اس کی سفر نامہ نگاری پر پردہ پڑ گیا، لیکن اس کی کتاب ایک مستند تاریخی دستاویز ہونے کے باوجود سفر نامہ نگاری کے باب میں بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

احمد بن فضلان تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا ایک اہم سفر نامہ نویس اور جغرافیا داں تھا۔عباسیوں کے عہد خلافت میں بغداد میں رہتا تھا۔اس کا سفر نامہ اس سفر کی یادگار ہے جو اس نے بغداد سے شروع کیا تھا اور ماوراء النہر ہوتا ہوا روس کے شہر ''صقالبہ'' پہنچ گیا تھا۔اس نے یہ سفر نامہ ۳۱۰ھ/۹۱۰ء میں تحریر کیا۔

اس کے سفر کی بنیاد یہ تھی کہ ۳۰۹ھ/۹۰۹ء میں شاہ صقالبہ (المش بن یلطور) نے ''عبداللہ بن باشتو خزری'' کے ذریعے عباسی خلیفہ کو ایک خط لکھا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ دینی اور فقہی مسائل کی تعلیم دینے، مسجد بنانے، منبر نصب کرنے اور تمام شہروں میں خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھنے کی غرض سے کچھ علما کو بھیجے۔ چنانچہ چار افراد پر مشتمل ایک جماعت تشکیل دی گئی جن میں احمد بن فضلان بھی تھا۔اس نے ۱۱ر صفر ۳۰۹ ہجری کو سفر کا آغاز کیا اور مسافرت کے دوران مختلف شہروں میں حالات کے پیشِ نظر قیام کیا۔ابن فضلان کے بقول اس کا سب سے زیادہ قیام جرجانیہ میں تھا۔وہ نہروان، ہمدان، ساوہ، سمنان، دامغان، نیشاپور، سرخس، مرو، جیحون، بخارا، خوارزم، جرجانیہ، بجناک (غز ترکوں کا ایک قبیلہ) وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے قبیلۂ صقالبہ پہنچا۔اس سفر میں گیارہ مہینے لگے، جن میں سے تقریباً پانچ مہینے مسلسل راہ پیمائی اور صحرانوردی کرتا رہا۔

اس کے سفر کی نوعیت مذہبی ہونے کے ساتھ سیاسی بھی تھی۔شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر وہ بہت اجمال سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے منصوبے سے دوسرے لوگ بھی واقف ہوں۔جیسا کہ ابن فضلان نے اکثر جگہوں میں دو یا تین روز قیام کیا لیکن ''رَے'' میں گیارہ روز تک رہ گیا اور اس کی وجہ بھی نہیں بیان کی۔اس نے اپنے سفر نامے میں بادشاہ کے استقلال اور اس کی مہمان نوازی کی تعریف بھی کی ہے، مثلاً بادشاہ سے ملاقات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ہمیں جب صقالبہ پہنچنے میں ایک روز کی مسافت باقی رہ گئی تو بادشاہ نے ایک جماعت ہمارے استقبال کے لیے بھیجی اور جب دو فرسخ باقی رہ گیا تو خود بادشاہ ہمارے استقبال کے لیے آیا۔ہم نے چار دن قیام کیا تاکہ تمام امرا اور وسا جمع ہو جائیں اور ہم خلیفہ کا خط پڑھیں۔جب ہم خط پڑھ رہے تھے تو سبھی لوگ کھڑے تھے اور آخر میں سب نے تکبیر کہی''۔(۶)

ایک اہم بات جس سے ابن فضلان کو تعجب ہوا یہ ہے کہ اس علاقے میں عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ عورت اور مرد ایک ہی جگہ ندی اور تالاب میں نہاتے تھے۔اس نے بہت کوشش کی کہ ان کی عورتیں پردہ کریں لیکن اسے کامیابی نہیں ملی۔ باوجود اس کے کہ پردہ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا ابن فضلان کے بقول وہ زنا اور لواط سے محفوظ تھے اور اگر شاذ و نادر ایسے واقعات سامنے آتے تو مجرم کو درخت میں باندھ دیتے اور بیچ سے دو ٹکڑے کرنے کے بعد بوٹی بوٹی کر کے درختوں پر لٹکا دیتے تھے۔

اس کا سفر نامہ جغرافیائی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں اس نے دقیق جغرافیائی اطلاعات فراہم کی ہیں۔ اکثر مقامات پر شہروں کے فاصلے کا بھی ذکر کیا ہے۔اس نے فاصلوں کو شب و روز اور فرسخ میں بیان کیا ہے۔

بہر حال اس کا سفر نامہ مجموعی طور پر ایک بہترین اور پُراز معلومات ہے۔اس کے ذریعے فراہم کی گئی معلومات مخصوص بہ فرد ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کو جو شہرت و عظمت روس میں حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔اس کا یہ سفر نامہ مسلمانوں کے اس دور کی یادگار ہے جب اسلام کا غلبہ تھا اور ان کی شہرت و عظمت بامِ عروج پر تھی۔اس سفر نامے سے اس وقت کے روس کی سیاسی، تمدنی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی زمانے کے بغداد کے تاجروں میں سے ''ابولقاسم ابن حوقل'' بھی ہے۔اس کا پورا نام محمد بن علی بن حوقل تھا۔ یہ ترکی کے جنوب میں واقع ایک قدیمی شہر نصیبین میں پیدا ہوا، لیکن اس کی عمر کا بیشتر حصہ بغداد میں گذرا۔ وہ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر کتاب لکھنے کی غرض سے ۳۳۱ھ میں اپنے گھر بغداد سے سفر پر نکلا اور ۳۵۸ھ میں اپنے وطن واپس آیا۔ اس نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً ستائیس سال سفر میں گذارے اور اکثر اسلامی ملکوں کا سفر کیا۔ وہ اپنے اس سفر میں شمالی افریقا اور اسپین بھی گیا۔ پھر جنگلوں کے راستے مصر، آذربائیجان اور ارمنستان گیا اور اپنا سفر جزیرۃ العرب، عراق، خوزستان اور فارس تک جاری رکھا۔ ۳۵۸ھ میں خوارزم اور پھر ماوراء النہر پہنچا۔ وہ وادی سِند بھی آیا جہاں اس کی ملاقات مشہور و معروف سیاح ابو اسحاق ابراہیم اصطخری (استخری) سے ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے کی سفری یادداشتوں سے استفادہ بھی کیا۔اس نے اپنی کتاب ''صورۃ الارض'' یا ''اشکال البلادیہ'' جو اس کے ستائیس سال کے سفر کی روداد اور تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہے، ۳۶۶ھ میں لکھی۔ یہ کتاب علم جغرافیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

ابو اسحاق ابراہیم اصطخری دسویں صدی عیسوی / چوتھی صدی ہجری کے اہم سیاحوں اور جغرافیا دانوں میں سے تھا۔اس کا شمار علم جغرافیا کے بانیوں میں ہوتا ہے۔جیسا کہ بیان کیا گیا کہ وہ ابن حوقل کا ہمعصر تھا اور ان دونوں نے سفر کے دوران ہندوستان میں ملاقات کی تھی اور ایک دوسرے کی سفری یادداشتوں سے استفادہ بھی کیا تھا۔اس نے اپنی کتابوں میں زیادہ توجہ جغرافیا، شہروں اور ملکوں کے نقوش پر صرف کی ہے۔

اس کی ایک اہم کتاب ''صوَرُ الاقالیم'' ہے۔جس میں اس نے عرب، شمالی افریقا، خلیج فارس، اندلس، مصر، شام، بیت المقدس، خوزستان، فارس، کرمان، سندھ، آذربائیجان، طبرستان، دیلم، خراسان، سیستان اور ماوراء النھر کے سفر کی روداد لکھی ہے اور مختلف مقامات کے نقشے بھی کھینچے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۳۹ء میں پہلی بار جرمنی میں چھپی۔

اس کی دوسری کتاب ''المسالک والممالک'' ہے، اصطخری نے اسے بیس اقلیم میں تقسیم کیا ہے۔اس نے اس زمانے کی اسلامی دنیا کے صرف جغرافیائی کوائف ہی نہیں بیان کیے بلکہ زمینوں کی مساحت اور دریاؤں کی ساخت کی بھی تفصیل بیان کی ہے۔اس نے جزیرۃ العرب، خلیج فارس، مغرب، اندلس، سسلی، مصر، شام، دریائے روم، عراق، جنوب ایران، ماوراء النہر اور سندھ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

اس نے تمام ملکوں، خطوں اور وہاں کے محصولات، صنعت و حرفت کی تفصیل اور قومی خصوصیتیں بھی بیان کی ہیں۔اس کا ایک بڑا حصہ فارس سے مخصوص ہے۔اس نے اس سرزمین کے متعلق نہ صرف مسافتوں، شہروں اور عمارتوں کا ذکر کیا ہے بلکہ قلعوں، محفوظ شہروں، آتشکدوں اور نہروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ مقدسی، یاقوت اور بہت سے دوسرے افراد نے اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔اس نے اپنی کتاب میں صرف انھیں مقامات کا ذکر کیا ہے جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا معتبر لوگوں سے سنا ہے یا پھر معتبر کتابوں سے ان کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔اس کے ذریعے فراہم کی گئی معلومات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔اس کی دونوں کتابیں سفر نامہ نگاری کے باب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کا ایک مشہور سیاح اور جغرافیا داں ''مقدّسی'' ہے۔ یہ تقریباً بیس سال تک سفر میں رہا اور سفر سے واپسی کے بعد چالیس سال کی عمر میں اپنے سفر کی روداد اور مشاہدات کو ۳۷۵ھ میں اپنی مادری زبان عربی میں ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' کے نام سے لکھا۔اس نے اپنی کتاب لکھنے کے لیے ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے لے کر اندلس تک کا سفر کیا۔اس کے ذریعہ فراہم کی گئی معلومات زیادہ تر اس کے مشاہدات کا ہی نتیجہ ہیں۔

اس کا نام محمد بن احمد بن شمس الدین، کنیت ابوعبداللہ اور لقب شہاب الدین تھا لیکن وہ مقدّسی اور بشّاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ فلسطین کے مشہور شہر بیت المقدس کا باشندہ تھا۔اس نے اپنے سفر نامے کے آغاز میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں اپنے سفر کے اسباب و علل اور سفر نامے کے موضوع کی وضاحت کی ہے۔

اس نے اپنے سفر کا آغاز مراکش سے کیا اور مختلف اسلامی علاقوں، شہروں اور ملکوں کا دورہ کرتا رہا اور اس کا یہ سفر تاشقند تک جاری رہا۔اس نے اپنے سفر نامے میں شاہراہوں، شہروں کے محل وقوع اور ان کے درمیان فاصلوں اور ان کی تہذیب و تمدن کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ سفر کی ان تمام جزئیات کی عکاسی کرتا ہے جہاں عام مسافر کی نظر نہیں پہنچ پاتی۔ لوگوں کے رسم و رواج، رہن سہن، مذہبی عقائد، صنعت و حرفت، قوم، قبیلے، فرقے، زبانیں غرض ان تمام چیزوں کو بیان کیا ہے جو عام مسافروں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔

اس کے سفر نامے کی زبان اس زمانے کی مروّجہ مقفّیٰ اور مسجع زبان ہے، جس کی وجہ سے کچھ واقعات بری

طرح متاثر ہوئے ہیں۔ بعض اوقات وہ غیر مانوس اور متروک الفاظ بھی استعمال کر دیتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنا سفر نامہ سفر کے دوران ہی لکھا تھا۔ وہ جہاں جہاں بھی جاتا تھا وہاں کے رہن سہن اور زبان سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتا تھا، اس لیے غیر شعوری طور پر علاقائی الفاظ اس کی زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔

مقدسی اپنے سفر نامے میں ایک تاریخ نگار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ واقعات، حادثات اور جغرافیائی کوائف کو بیان تو کرتا ہے لیکن اپنے جذبات و احساسات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا سفر نامہ ایک ایسا تاریخی دستاویز بن گیا جس میں زندگی کی حرارت نہیں ہے۔ بعض مقامات پر وہ اپنی دقیق تاریخی معلومات کو بھی بروے کار لاتا ہے۔ ملک شام کی تاریخی اور مذہبی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے۔

> ''یہ عظیم الشان مملکت نبیوں کا مدفن اور صالحین و ابدال کا مُستقر ہے، یہاں مقدّس مقامات، عمدہ خانقاہیں، اہم سرحدیں اور بابرکت پہاڑ ہیں، یہاں وہ میدان ہے جہاں سے قیامت کے دن مردے اٹھیں گے۔ یہاں ابراہیم کی ہجرت گاہ اور قبر ہے۔ ایوّب کا گھر اور کنواں، داؤد کی محراب اور دروازہ، مسیح کا وطن اور گہوارہ، موسیٰ کی چٹان، زکریا کی محراب اور بے شمار زیارت گاہیں اور مشاہد ہیں۔ یہ ایک خوش حال مملکت ہے جہاں پانی، پھول اور درخت خوب ہوتے ہیں'' (٦)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے جن جن مقامات کا سفر کیا پہلے وہاں کے بارے میں تاریخی معلومات فراہم کیں، پھر وہاں کے داخلی اور خارجی مسائل بیان کیے۔ نیز جو خوبیاں نظر آئیں انھیں بے باکانہ انداز میں بیان کر دیا اور خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ انھیں بھی من وعن بیان کیا۔

مقدسی ہر علاقے کی اطلاعات کی فراہمی میں اسی سماج اور معاشرے کا جز بن جاتا ہے۔ اس طریقے سے کہ قاضیوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور جن شہروں میں بغرض تجارت جاتا وہاں کے لوگوں کی سنگھت اختیار کر لیتا، قصے کہانیاں بیان کرنے والوں کی مجلسوں میں بیٹھتا یہاں تک کہ امرا و روسا کی خدمت بھی کرتا۔ اس طرح اس کا طریقۂ کار یہ رہا کہ واقعات یا حادثات کو خود دیکھے یا معتبر لوگوں سے سنے یا وہاں کے کتب خانوں سے رجوع کرے۔

اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جزئیات پر گہری نظر رکھتا ہے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس عہد کی تاریخ کے ساتھ ہمیں اس کے ماقبل کی تاریخ سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ جو شہر ابھی نئے آباد ہوئے ہیں ان کے عہد کی تاریخ کے علاوہ جن شہروں کی اپنی تاریخی اہمیت ہے اور تاریخی اعتبار سے دنیائے اسلام میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں، ان کے بارے میں بڑی بیش بہا اور قیمتی معلومات فراہم کی ہیں اور ان کے بیان میں بڑی دیانتداری کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی بیان کردہ معلومات میں اپنے عقیدے اور جذبے کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ وہ اسی تاریخ کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح اس کا سفر نامہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات کا ایک بہترین آئینہ ہے جس میں اس دور کی اسلامی تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی تصویر صاف دکھائی دیتی ہے۔

اس سلسلے کا ایک اور نام شریف ادریسی کا ہے وہ ۱۱۰۰ء میں اسپین کے ایک علاقے 'سیوٹا' (Ceuta) میں پیدا ہوا، اس کا پورا نام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن ادریسی ہے۔ اس نے اسپین کے مشہور شہر ''قرطبہ'' میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی طبیعت شروع سے ہی سیر و سیاحت کی طرف مائل تھی۔ آخر کار سفر پر نکل پڑا اور اپنے زمانے کے مشہور شہروں کی سیر کی، یہاں تک کہ وہ سسلی (Sicily) پہنچ گیا اور وہاں کے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی۔

اس نے اپنے سفری واقعات کو سسلی میں ہی ''نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق'' کے نام سے جمع کیا اور وہاں کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے کتاب کو بہت پسند کیا اور اس سے درخواست کی کہ جن مناطق کے سفر کی روداد درج ہے ان کے نقشے بھی بنا کر کتاب میں ضمیمے کے طور پر شامل کرے۔ چنانچہ اس نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی اور نقشے بنا کر اس میں شامل کیے۔

اس نے جوانی میں ہی اس طولانی سفر کا آغاز کیا اور دنیا کے مختلف نقاط کا سفر کرتا رہا۔ وہ لیسبون (Lisbon) سے مراکش گیا اور شہر قسطنطنیہ کی سیر کی، پھر فرانس کے جنوبی علاقے سے کشتی کے ذریعے انگلینڈ گیا۔ ۵۱۰ھ میں ایشیائے کوچک کا سفر کیا اور دریائے مدیترانہ سے مراکش کی سمت واپس لوٹا۔ اس کا مشہور سفر افریقا کے دریاؤں کا تھا اور چونکہ یہ علم جغرافیا میں مدیترانہ کے علاقوں میں مشہور ہو گیا تھا اس لیے بادشاہ نے اس کو دعوت دی اور وہ افریقا سے سسلی کی طرف چلا۔ اس وقت سسلی کی بندرگاہوں میں آمد و رفت زیادہ تھی، اس لیے اس نے وہاں گذرنے والوں سے ان کے ممالک کے بارے میں اچھی خاصی معلومات فراہم کر لی۔ چونکہ یہ ایک عیسائی بادشاہ کی دعوت پر جا رہا تھا اس لیے اس نے آنے جانے والوں سے اس وقت کے عیسائی ملکوں از جملہ فرانس، جرمنی، انگلینڈ اور اسکینڈینویا (Scandinavia) کے بارے میں اچھی معلومات حاصل کر لی تھی جو اس وقت تک کے کسی بھی مسلمان جغرافیا داں کو فراہم نہیں ہو سکی تھی۔

ناصر خسرو کا شمار فارسی کے صف اول کے شاعروں اور سفر نامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کا نام سفر نامے کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اسے اپنے زمانے کے تمام عقلی اور نقلی علوم میں مہارت حاصل تھی۔ اس کا پورا نام ابو معین ناصر بن خسرو بن حارث قبادیانی بلخی تھا۔ ۹/ ذیقعدہ ۳۹۴ھ بمطابق ۳/ستمبر ۱۰۰۴ء کو بلخ کے ایک قصبے ''قبادیان'' میں پیدا ہوا۔ اس کا آبائی پیشہ منشی گیری تھا۔ آغاز جوانی میں ہی تمام مروّجہ عقلی اور نقلی علوم میں دسترس حاصل کر لی اور قرآن مجید حفظ کیا۔ پہلے سلطان محمود غزنوی پھر مسعود غزنوی کے دربار میں منشی گیری کی ملازمت اختیار کر لی۔

اس نے اپنے سفر نامے کے آغاز میں اپنے سفر کی علت یہ بیان کی ہے کہ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ اس سے کوئی کہہ رہا ہے ''چند خواہی خوردن از این شراب کہ خرد از مردم زایل کند اگر بہ ہوش باشی بہتر'' تو ناصر خسرو نے جواب دیا ''حکما چیزی بہتر از این نتوانستن ساخت کہ اندوہِ دنیا ببرد'' تو اس مرد نے جواب دیا ''حکیم نتوان گفت کسی را کہ مردم را بہ بیہشی و بی خردی رہنمون باشد، چیزی باید کہ خرد و ہوش را

بیفزاید'' تو ناصر خسرو نے فوراً پوچھا ''من آن از کجا آرم'' تو اس نے کہا ''عاقبت جوینده یابنده بود'' اور قبلہ کی طرف اشارہ کیا۔(۷)

اس خواب نے ناصر خسرو کے افکار و نظریات میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے شراب و کباب اور دنیا کی تمام لذتیں چھوڑ دیں، منشی گیری کی ملازمت بھی ترک کر دی اور حج کے ارادے سے سفر پر نکل پڑا۔ اس نے سات سال تک مختلف سرزمینوں از جملہ آذربائیجان، ارمنستان، ایشیائے کوچک، حلب، طرابلیس، شام، فلسطین، جزیرۃ العرب، قیروان، تیونس اور سوڈان کا سفر کیا اور تین یا چھ سال تک فاطمیوں کے دارالسلطنت مصر میں سکونت اختیار کی اور وہیں پر 'مستنصر باللہ' کے زمانے میں اسماعیلی مذہب اختیار کر لیا اور مصر سے تین بار حج کی ادائیگی کے لیے خانۂ کعبہ گیا۔ اس کا سفرنامہ اس کے اسی سات سالہ سفر کی یادگار ہے۔

اس نے اپنے سفرنامے میں ہر قصبہ، شہر اور ملک کے جغرافیائی محل وقوع اور ان سے وابستہ تاریخی حقائق بھی پیش کیے ہیں۔ اس کے سفرنامے میں حکما، علما، فضلا اور صلحا کا ذکر ملتا ہے ساتھ ہی شہروں اور ملکوں کے آثار قدیمہ، مسجدوں، گرجا گھروں، خانقاہوں، زیارت گاہوں اور مقابر وغیرہ کے احوال اور ان کے بارے میں تاریخی معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں۔

اس نے زندگی کے تمام شعبوں کا بغور مطالعہ کیا اور اپنی باریک بینی اور دقت نظر سے تمام جزئیات پر غیر معمولی گرفت حاصل کر لی۔ تاریخی واقعات اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنا اس وقت کے تمام مسافر کی ایک اہم ضرورت تھی اس لیے اس نے اپنے سفرنامے میں اس وقت کے عالمی جغرافیا اور مختلف ممالک کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی معلومات فراہم کیں۔ اس نے مختلف ملکوں، شہروں کے کوائف، عوام کی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی کیفیت بھی بیان کی ہے۔

اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ واقعات، تجربات اور حادثات کے بیان میں کہیں بھی جانبداری سے کام نہیں لیتا۔ صداقت اس کا ایک بڑا خاصہ ہے، اس کے سفرنامے کا انداز بیانیہ اور اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے، لیکن اس کے ایک خاص مذہبی نقطۂ نظر کی وجہ سے اس کے سفرنامے کو مذہبی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس کی فراہم کردہ معلومات مسلمانوں کے ایک طبقے کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

بلاشبہہ ناصر خسرو عجم کا دوسرا بڑا سفرنامہ نگار ہے جس نے ابواسحاق ابراہیم اصطخری کے بعد عرب کے مختلف ممالک کا سفر کیا اور ایک جدید طرز کا سفرنامہ لکھ کر سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ اس کا شمار فارسی سفرنامہ نگاری کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔

غزنویوں کے دور حکومت میں ایک اور نامور ایرانی دانشور ''البیرونی'' جو ایران کے مردم خیز شہر ''خوارزم'' سے نمودار ہوا اور ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے ایک لمبے عرصے تک یہاں پر سکونت اختیار کی۔ یہاں کے علما، فضلا اور دانشوروں سے ملاقات کی اور ان سے ہندستانی فلسفہ اور ہندوؤں کے عقائد کے متعلق مفید معلومات فراہم کیں اور اپنی عظیم تصنیف ''تحقیق ماللہند'' کی زینت بنایا۔

بیرونی کا پورا نام ابوریحان محمد بن احمد البَیر ونی تھا۔ وہ ۲۹/ذی قعدہ ۳۶۲ھ بمطابق ۵/ستمبر ۹۷۳ء میں سامانیوں کے حدود حکومت میں پیدا ہوا۔ اس کی جائے پیدائش خوارزم کا ایک چھوٹا سا قصبہ 'بیرون' تھا۔ اسے عربی، یونانی اور ہندی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے بہت سے رسالے اور کتابیں لکھیں جن کی تعداد ۱۴۶ تک بتائی جاتی ہے۔ بیرونی ہندوستان پر محمود غزنوی کی لشکر کشی کے وقت ہندوستان آیا اور چونکہ وہ ایک ذہین، دانشور، جغرافیا داں، ریاضی داں اور نجومی ہونے کے باوجود مشرقی زبانوں میں بھی مہارت رکھتا تھا اس لیے بہت جلد یہاں کے عالموں سے ہندوستانی زبان سیکھ لی اور اس وقت کے ہندوستان کے بارے میں تحقیق شروع کر دی۔ اس نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے جغرافیے، یہاں کے لوگوں کے اخلاق و عادات، رہن سہن اور عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔

بیرونی نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں گذارا۔ اس نے ایک طویل مدت ہندوستان کی تاریخ، عوام کے مذہبی عقائد، رسم و رواج اور ہندوستانی فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کی۔ کہا جاتا ہے کہ شروع شروع میں ہندوستانی علما بیرونی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی ہمنشینی سے گریز کرتے تھے نیز علمی مسائل میں اس کے نظریات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے، لیکن کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنے اخلاق و کردار سے ان کا دل جیت لیا اور یہاں کے دانشمندوں اور عالموں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ یہ افراد بعض اہم موقعوں پر اس کی دعوت بھی کرتے تھے اور بیرونی اس میں شریک بھی ہوتا تھا۔ اس طرح اس نے یہاں کے رسم و رواج، مذہبی اور تاریخی معلومات میں دسترس حاصل کر لی۔ اس نے انھیں مذہبی پیشواؤں سے یہاں کی علمی اور مذہبی زبان سنسکرت بھی سیکھ لی اور ان کی مذہبی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس نے جو کچھ ان کتابوں میں پڑھا اور یہاں دیکھا اسے بڑی دیانتداری کے ساتھ اپنی کتاب ''تحقیق ماللہند'' میں بحسن و خوبی بیان کر دیا۔ اس کتاب کے مطالعے کے وقت ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا مصنف ہندو ہے یا مسلمان۔ یہ کتاب اس وقت سے لے کر آج تک ہندوستانی تہذیب و تمدن اور اس وقت کے ہندوستان کے جغرافیائی کوائف کو سمجھنے میں ایک معتبر اور مستند ماخذ سمجھی جاتی رہی ہے۔ اس کا پورا نام ''تحقیق ماللھند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل اومزدولہ'' ہے۔

چونکہ وہ ایک حکیم اور فلسفی تھا اس لیے اس کتاب میں اس کا انداز استدلالی ہے۔ وہ اپنی بات کو منطقی استدلال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سفرنامے کا انداز بیانیہ ہونے کے بجائے خطیبانہ ہے۔ اس کی کتاب اس وقت کے ہندوستان کی سماجی، مذہبی، طبقاتی اور اقتصادی حالت کی بہترین آئینہ دار ہے۔ اس سے اس وقت کے ہندوستان کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور چونکہ وہ ایک ماہر نفسیات بھی تھا اس لیے اس نے اپنی کتاب میں ہندوستانی افراد اور سماج کا نفسیاتی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں ایسے واقعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد عقل حیران و پریشان ہو جاتی ہے اور وہ ایک عام قاری کی سمجھ سے باہر نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے واقعات اور قصے کہانیاں حکایات کی صورت میں پیش کرتا ہے جن کا بظاہر حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں معلوم ہوتا۔ ان قصے کہانیوں کو پڑھ کر لوگوں کے ذہن

میں ہندوستان کی ایک عجیب وغریب تصویر سامنے آتی ہے۔ بہرصورت اس نے جس ہندوستان کو اپنے عہد میں دیکھا یا سنا تھا اس کی من وعن تصویر لوگوں کے سامنے پیش کر دی۔

رابی نجبین جولوڈیلہ کا رہنے والا تھا، اس نے ۱۱۶۰ء سے ۱۱۷۷ء تک دنیا کے مشہور مقامات کا سفر کیا اور اپنا سفرنامہ لاطینی زبان میں لکھا جس میں اس نے یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک کے سفر کی روداد قلمبند کی۔ اس کا سفرنامہ اس وقت کے یورپ اور ایشیا کے جغرافیائی محل وقوع کو سمجھنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا کئی زبانوں از جملہ انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

صاحب ''معجم البلدان'' شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ حموی چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا ایک مشہور ادیب اور خطاط تھا۔ یہ ۵۷۴ھ/ ۱۱۷۸ء کو روم میں پیدا ہوا اور تقریباً نصف صدی تک مختلف علوم کی تحصیل وتدریس میں مشغول رہا اور آخرکار ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں بغداد میں وفات پائی۔ چونکہ وہ ایک خطاط تھا اور اس فن سے اسے خصوصی دلچسپی تھی اس لیے اس نے تیرہویں صدی عیسوی میں مخطوطات کی دریافت شروع کی اور اس کے لیے مختلف اسلامی ممالک کا سفر بھی کیا۔ سب سے پہلے تو اس نے جزیرۂ قیس کا سفر کیا جو خلیج عرب کے جنوب میں واقع ہے، لیکن اس کا یہ سفر تجارتی تھا۔ پھر اس نے ایران کے مختلف شہروں از جملہ نیشاپور اور خوارزم کا سفر کیا اور وہاں چند روز قیام بھی کیا۔ ۲۰-۱۲۱۹ء میں جب چنگیز خاں نے تباہی پھیلائی تو اس افراتفری میں وہ اپنے وطن واپس آ گیا۔

اس نے بھی دوران سفر، اپنے سفر کے واقعات اور حادثات کو یادداشت کی صورت میں قلمبند کیا تھا لیکن اب تک اس کے سفرنامے کا مسوّدہ دریافت نہیں ہو سکا۔ بعض تحریروں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے سفری کوائف کو بصورت یادداشت قلمبند کیا تھا تاہم جب تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، اس کا نام سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں تو لکھا جا سکتا ہے لیکن سفرنامہ نگاری کے باب میں اس کے مقام کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

ابن جبیر کا سفرنامہ ''رحلۃ ابن جبیر'' بھی ایک اہم سفرنامہ ہے جو اپنی فنی اور جغرافیائی خوبیوں کی وجہ سے عربی زبان کے شاہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن جبیر کا پورا نام ابوالحسن محمد بن احمد بن جبیر تھا۔ وہ ۵۴۰ ہجری بمطابق ۱۱۴۵ عیسوی میں اسپین کے ایک شہر ''وِلنسِیَہ'' (Valencia) میں پیدا ہوا۔ کچھ دنوں ''شاطبہ'' میں رہا اور مروجہ علوم وفنون میں مہارت پیدا کی۔ ادب، فقہ اور حدیث میں اسے تبحرِ علمی حاصل تھا۔ دینی علوم کی تحصیل کے بعد غرناطہ گیا اور وہاں کے حاکم عثمان بن عبدالمومن کا کاتب بن گیا۔

اسی دوران عثمان بن عبدالمومن نے اسے شراب نوشی پر مجبور کیا اور شراب سے چھلکتے ہوئے سات جام پلا دیے۔ ہوش میں آنے کے بعد ابن جبیر نے بادشاہ سے معذرت خواہی کرتے ہوئے ملازمت ترک کر دی اور اس گناہ کا بوجھ اتارنے کے لیے فریضۂ حج کی ادائیگی کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ابن جبیر غرناطہ شہر سے ۸ رشوال ۵۷۸ ہجری بروز جمعرات ۳۸ رسال کی عمر میں فریضۂ حج ادا کرنے

کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوا اور ایک مہینے کے بعد اسکندریہ پہنچ گیا اور وہاں عاملوں اور زکات وصول کرنے والوں کی بدسلوکی دیکھی جسے اپنے سفرنامے میں ذکر بھی کیا۔ وہاں سے قاہرہ اور وہاں سے عیذاب پہنچا، پھر عیذاب کی بندرگاہ کو جدہ کے ارادے سے ترک کیا۔ اگرچہ وہ ایک بہترین شاعر بھی تھا لیکن اس کے چند اشعار تذکروں کی زینت ہیں اور اس کی یادگار صرف یہ سفرنامہ ہی باقی رہ گیا ہے جو ''رحلۂ ابن جبیر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اصل نام ''تذکرۃ بالاخبار عن اتفاقات الاسفار'' ہے جسے اس نے ۵۸۲ ہجری/ ۱۱۸۶ عیسوی کے آس پاس لکھا تھا۔ ایک عرصے تک اس کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہو سکی تھی، پھر اس کا ایک اہم نسخہ دستیاب ہوا جس کی کتابت نویں صدی ہجری میں ہوئی تھی، اور سب سے پہلے اس کا انگریزی اور فرانسیسی میں ترجمہ ہوا پھر بہت بعد کو اس کا ترجمہ فارسی اور اردو میں بھی ہوا۔

ابن جبیر جہاں جہاں بھی گیا وہاں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کیں اور عجائب وغرائب کو دیکھا۔ غرض جو کچھ بھی دیکھتا تھا اسے اسی وقت یادداشت کے طور پر لکھ لیا کرتا تھا۔ اس نے اس سفرنامے میں اپنے سفر کے حالات، تجارت اور اپنے راستے کے جغرافیائی کوائف پیش کیے ہیں۔

اس سفرنامے کا ایک عمدہ حصہ شہر مکہ کی تعریف وتوصیف خصوصاً خانۂ خدا سے مخصوص ہے۔ وہ کعبہ کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیتا ہے اور اپنے حافظے کی مدد سے اس کی پوری تاریخ پیش کر دیتا ہے۔ ناصر خسرو نے بھی کعبے کے بارے میں تفصیل پیش کی ہے لیکن دونوں کی تفصیلات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چونکہ ان دونوں کے سفرناموں میں سوا سو سال کا زمانی فرق ہے اس لیے بہت سی چیزیں مختلف نظر آتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان دونوں کے ذریعہ فراہم کی گئی اطلاعات میں تضاد ہے بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ کعبے میں یہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔

اگرچہ ابن جبیر کا سفر خالص مذہبی تھا جس میں حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارات شامل تھیں لیکن چونکہ اسے تاریخ اور جغرافیا سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی، اس لیے اس نے اپنے مخصوص زاویۂ فکر ونظر کی وجہ سے اسے خالص دینی اور مذہبی سفرنامہ نہیں بننے دیا۔ اس نے راستوں، شہروں کی رنگینیوں کے بیان میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور ان کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس نے اپنے سفرنامے میں عمارتوں، قلعوں، مسجدوں، خانقاہوں، زیارت گاہوں اور مقابر وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کا سفرنامہ محض جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا ذخیرہ ہی نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ اپنے احساسات اور جذبات کی شمولیت بھی کی ہے اور ان کی مذہبی، سماجی اور اقتصادی حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے اس کا سفرنامہ ایک خاموش بیانیہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس میں زندگی کی حرارت ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

اس کا اندازِ بیان نہایت سادہ، سلیس اور رواں ہے، البتہ بعض اوقات مسجع ومقفّی عبارت کا بھی اہتمام کرتا ہے لیکن یہ سجع وقوافی کا التزام قاری پر گراں نہیں گذرتا بلکہ عبارت کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ وہ بلاتکلف قاری کو اپنے جذبات واحساسات سے واقف کراتا ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں تفصیل

کی ضرورت ہوتی ہے تفصیل سے کام لیتا ہے اور جہاں ایجاز و اختصار درکار ہو وہاں چند جملوں میں پوری بات بیان کر دیتا ہے۔اس کا سفرنامہ بڑے بڑے سفرنامہ نگاروں اور تاریخ نگاروں کا ماخذ رہا ہے اور ایک مدت تک لوگ اس سے اقتباس پیش کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ ابن بطوطہ نے بھی حلب اور دمشق کے احوال بیان کرتے وقت اس سے اقتباس نقل کیا ہے۔

’’مارکو پولو‘‘ تیرہویں صدی عیسوی کا ایک مشہور و معروف سیاح اور تاجر ہے جس کے سفر کے واقعات اور تجربات و مشاہدات کتابی صورت میں ملتے ہیں، جو آج کل Travels of Marco Polo (سفرنامۂ مارکو پولو) یا ’’عجائب وغرائبِ دنیا‘‘ کے نام سے جانی جاتی ہے۔اس کتاب نے مغربی اقوام کو مرکزی ایشیا اور چین کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں نقشِ کلیدی ادا کیا ہے۔

مارکو پولو ۱۲۵۴ء میں وینیس (Venice) میں پیدا ہوا۔اس کا باپ ’’نکلاس پولو‘‘ ایک ثروتمند تاجر تھا جو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں تجارت کیا کرتا تھا۔وہ ۱۳۲۴ء میں دنیا سے رخصت ہوا اور سن لورنزو (San Lorenzo) میں دفن ہوا۔مارکو پولو نے تجارت کے گُر اس وقت سیکھے جب اس کے والد نکلاس اور چچا مَفیو نے ایشیا کا سفر کیا اور چین میں قبلئی خان کے دربار میں حاضری دی۔۱۲۶۹ء کے قریب ۱۷ سالہ مارکو پولو اپنے والد اور چچا کے ساتھ تجارت کی غرض سے ایشیا کے سفر پر روانہ ہوا۔اور اس کا یہ سفر فلسطین، ایران، ترکستان اور چین تک جاری رہا۔اس کی واپسی ۱۲۹۲ء میں ساترا، جاوہ، سیلان، ہندوستان کے ساحلی علاقے، ایران، دریائے سیاہ کے ساحلی علاقے اور قسطنطنیہ کے راستے ہوئی۔اس طرح وہ ۲۴ سال کے بعد اپنے وطن وینیس واپس لوٹا۔

اس کی وطن واپسی کے زمانے میں وینیس اور جنیوا کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ملک میں خانہ جنگی کا ماحول تھا، چنانچہ اسی افراتفری میں مارکو پولو گرفتار ہو گیا اور اسے جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا گیا۔اس نے اسی قید خانے میں اپنے سفر کی روداد اپنے ایک قیدی دوست روسٹیکلو دا پیزا (Rustichello Da Pisa) کو سنائی اور اس نے اس کی سفر بیتی کو تحریری صورت دی۔روسٹیکلو چونکہ ایک عشقیہ داستان نویس تھا اس لیے اس نے بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ اس سفرنامے کو ترتیب دیا۔بہت جلد ہی یہ کتاب ’’سفرنامۂ مارکو پولو‘‘ کے نام سے مشہور ہو گئی۔اس کتاب میں اس وقت کے پورے ایشیا کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر ممالک مثلاً چین، ہندوستان، جاپان اور ایران کے متعلق خاطر خواہ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

کتاب ایک مقدمے سے شروع ہوتی ہے جس میں اس کے والد اور چچا کے بلغاریہ (Bolgar) کے سفر کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔وہ لوگ ایک سال کے بعد اوکک (Ukak) اور وہاں سے بخارا گئے، وہاں شام کے ایک تاجر نے قبلئی خاں سے ملاقات کی دعوت دی اور کہا کہ قبلئی خان نے آج تک کسی مغربی انسان کو نہیں دیکھا۔چنانچہ وہاں سے یہ لوگ ۱۲۶۶ء میں قبلئی خاں کے دربار ’’دادو‘‘ میں پہنچے جہاں آج کا موجودہ شہر بیجنگ (Beijing) آباد ہے۔قبلئی نے ان سے یورپ کے انتظامی اور سیاسی حالات اور روم کے پاپ اور کلیسا کے بارے میں دریافت کیا، اور پاپ سے عیسائی علما اور یروشلم کے تیل کے چراغ کے

حصول کے متعلق معلومات حاصل کیں۔پھر انھیں پاپ کے نام ایک خط دے کر روانہ کیا، جس میں ۱۰۰/ ایسے عیسائی علما کی درخواست کی گئی تھی جو اس زمانے کے علوم مروجہ سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ساتھ ہی ان سے یہ تاکید بھی کی کہ یروشلم (Jerusalem) سے ایک تیل کا چراغ بھی لائیں۔چنانچہ یہ لوگ فوراً سفر پر روانہ ہو گئے اور واپسی پر پاپ کا ایک جوابی خط اور یروشلم سے ایک تیل کا چراغ بھی لائے۔نیکولو (نکلاس) نے پاپ کا خط اور تیل کا چراغ قبلئی خان کو دیا، لیکن اس سفر میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ مارکو پولو بھی تھا اس لیے بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو نیکولو نے جواب دیا کہ آپ کا غلام اور میرا بیٹا ہے۔چونکہ مارکو پولو چار زبانوں میں مہارت رکھتا تھا اور اپنی ذہانت اور دقت نظر کی وجہ سے بہت جلد چین کے آداب و رسوم بھی سیکھ گیا تھا اس لیے وہاں ایک مدت تک مختلف عہدوں پر مامور بھی رہا۔

چین میں ۱۷/ سال قیام کے بعد اپنے والد اور چچا کے ساتھ ایران کے ارادے سے چین کو ترک کیا اور جنوب چین میں کشتی پر سوار ہوا اور سنگاپور پہنچا، پھر ساترا، ترنکو مالی بندرگاہ سے سیلان پہنچا۔پھر دریائے عرب کو عبور کیا اور ہرمزگان پہنچا اور زمینی راستے سے طرابزون (لاطینی: Trabzon) پہنچا جو دریائے سیاہ (Black Sea) کے قریب ہے۔اس طرح ۲۵ سال کے سفر کے بعد اپنے وطن وینیس پہنچا۔اس کا سفرنامہ اس کے اسی سفر کی یادگار ہے۔

ابن بطوطہ کا شمار اہم ترین سیاحوں اور سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے جس نے اپنے استقلال، استقامت، عزم و حوصلہ اور انتھک کوششوں سے سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا ہے۔اس کا نام محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم لَواتی (لواطی) طنجی تھا۔۷۰۳ ہجری/ ۱۳۰۴ عیسوی میں مغربی مراکش کے ایک شہر طنجہ میں پیدا ہوا اور ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء میں مراکش ہی میں وفات پائی۔رجب ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں اپنے شہر طنجہ سے حج کی نیت سے مکہ کی طرف روانہ ہوا اور مصر، شام، فلسطین، حجاز، عراق، ایران، یمن، ہندوستان، چین، جاوہ، مشرقی یورپ اور مشرقی افریقا تک ایک عالم چھان ڈالا۔اس کا یہ سفر ۲۷/ سال (۱۳۲۵ء- ۱۳۵۲ء) کے ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ابن بطوطہ تقریباً مارکو پولو کا ہمعصر ہے لیکن اس نے مارکو پولو سے تین گنا زیادہ سفر کیا۔اسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سیاح کہا جاتا ہے جس نے سفر سے واپسی کے بعد اپنے سفر کی یادداشتوں اور تجربات و مشاہدات کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ قرون وسطیٰ کا ایک اہم ترین ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔اس کے سفرنامے کا اصل نام ’’تحفۃ النُظّار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار‘‘ ہے۔اس کا مواد خود ابن بطوطہ کی یادداشتیں اور تجربات و مشاہدات ہیں۔اس کا تقریباً ۲۰/ فیصدی حصہ ہندوستان اور جزائر مالدیپ کے سفر پر مشتمل ہے۔اس نے یہاں کے لوگوں کے اخلاق و عادات، تہذیب و تمدن اور چین سے ان کے تجارتی رشتوں کے بارے میں اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔وہ واحد شخص ہے جس نے قرون وسطیٰ میں جزائر مالدیپ، جنوبی روس اور افریقا کے متعلق مفید باتیں تحریر کیں۔

ابن بطوطہ نے سیاحت کی غرض سے اپنی زندگی میں ۱۱۷۵۰۰ کیلومیٹر سفر کیا اور موجودہ دنیا کے نقشے کے اعتبار سے اس نے تقریباً ۴۴ ممالک کا سفر کیا۔''ابن جُزَی'' کے بیان کے مطابق ابن بطوطہ نے اپنے اتمام سفر پر یہ جملے زبان پر جاری کیے:

''بحمداللہ درحقیقت میں نے دنیا میں اپنی آرزو جو زمین پر سفر کرنا تھی، پوری کر لی، اور فخر کی بات ہے کہ یہ عام انسانوں کے بس سے باہر ہے''۔

اگرچہ اس نے مصر، شام، حجاز، عراق، ایران اور یمن وغیرہ کا سفر کیا لیکن اس کا ہندوستان کا سفر اپنی نوعیت کا واحد سفر ہے۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد شام، ایران، ماوراء النہر اور افغانستان کے مختلف شہروں از جملہ بلخ، ہرات اور غزنی ہوتا ہوا کابل پہنچا۔ کابل سے کرماش ہوتا ہوا محرم ۷۳۴ھ میں دریائے سندھ کے کنارے (بھکر) پہنچا۔ پھر ملتان سے گذرتا ہوا دریائے ستلج کو پار کیا۔ وہاں سے ابوہر، ہانسی ہوتا ہوا نجف گڑھ کے قریب موضع مسعود پور پہنچا اور چونکہ وہ پرانی دلّی سے بہت قریب تھا اس لیے جلد ہی پرانی دلّی میں داخل ہو گیا۔ سلطنت دہلی کے بادشاہ محمد تغلق نے اس کی بہت قدردانی کی اور جب اس پر پورا اعتماد حاصل ہو گیا تو اسے قاضیِ شہر بھی مقرر کر دیا۔ وہ نو سال دہلی میں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے دہلی کے قرب و جوار کے بہت سے شہروں کا سفر کیا جن میں قنوج، امروہہ اور بجنور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

محمد تغلق چونکہ اس کی علمیت، ذہانت اور صداقت کا قائل ہو گیا تھا اس لیے صفر ۷۴۳ ہجری میں اسے بادشاہ چین کے لیے تحفے تحائف دے کر روانہ کیا۔ چنانچہ یہ دہلی سے تلپت، قنوج، گوالیر، اجین ہوتا ہوا دولت آباد پہنچا، پھر مختلف شہروں سے ہوتا ہوا مالا بار گیا اور وہاں سے کالی کٹ پہنچ گیا۔ لیکن کالی کٹ میں جہاز پر سوار ہوتے وقت جہاز ٹوٹ گیا جس سے اس کے ہمراہی اور تحائف تلف ہو گئے، خوش قسمتی سے یہ ابھی سوار نہیں ہوا تھا اس لیے بچ گیا اور چونکہ مال و اسباب، ہمراہی اور تحائف تلف ہو گئے تھے اس لیے بادشاہ کے خوف سے دہلی واپس نہ آیا اور جزائر مالدیپ کا رخ کر لیا، پھر ۴۳ دن سفر کرنے کے بعد بنگالہ پہنچا۔ وہاں سے سماترا، کمبوڈیا، کوچین ہوتا ہوا ٹامکن پہنچ گیا اور چین کے شہر کالٹن میں داخل ہوا، لیکن کسی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوا اس لیے جلد ہی وہ سماترا، ظفار، مسقط، شیراز، یزد، اصفہان، شوشتر، بصرہ، کوفہ ہوتا ہوا بغداد پہنچا۔ وہاں سے شام کا راستہ لیا اور مصر، تیونس ہوتا ہوا ۷۵۰ ہجری میں شہر فارس پہنچ گیا۔ وہ پچیس سال مسلسل سفر میں رہا لیکن ابھی بھی سوڈان کا سفر باقی رہ گیا تھا، چنانچہ محرم ۷۵۴ھ میں وہاں کے سفر پر نکل پڑا اور ۷۵۵ھ میں اپنے وطن واپس لوٹا۔ واپسی کے بعد ۷۵۶ھ میں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے اپنی یادداشتوں کو سفرنامے کی صورت میں مرتب کیا۔

ابن بطوطہ کا یہ سفرنامہ اس وقت کے ہندوستانی سماج اور معاشرے کی بہترین تصویر کشی کرتا ہے۔ چونکہ وہ بلا کا ذہین، روشن فکر اور روشن دماغ تھا، ساتھ ہی مختلف علوم و فنون سے بھی آراستہ تھا اس لیے اس نے چیزوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی حقیقت تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اگرچہ اس نے بعض چیزوں کی تعریف و

توصیف میں مبالغے سے کام لیا ہے اور عجیب و غریب قصے کہانیاں بھی نقل کی ہیں تاہم اس کا سفرنامہ اس وقت کے ہندوستان کو سمجھنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔

اس نے اس وقت کے ہندوستان کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور سماجی و سیاسی زندگی پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کا سفرنامہ عربی زبان و ادب کا ایک بیش قیمت نثری فن پارہ ہے، جسے عربی ادب کے شاہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ کے سفرنامے کی دریافت کا سہرا ایک مشہور مستشرق 'ڈاکٹر سموئیل' کے سر جاتا ہے جنھوں نے بڑی کدوکاوش اور تلاش و جستجو کے بعد ۱۸۲۹ء میں اس کی تلخیص شائع کی تھی لیکن کچھ ہی مدت بعد 'الجزائر' میں اس کا مسوّدہ مل گیا اور اسے شائع کیا گیا۔ اس کا فارسی ترجمہ محمد علی موحد نے 'سفرنامہ ابن بطوطہ' کے نام سے کیا تھا۔ اس کا پہلا فارسی ترجمہ ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ محض جغرافیائی حالات کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کے مسلمانوں کی سماجی زندگی کی ایک مفصل، مفید اور دلچسپ نیز عبرت انگیز تاریخ بھی ہے۔ اس کی مدد سے اس دور کے مورخین اور جغرافیادانوں کے بیانات کی تصدیق و تصحیح کا کام بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ سفرنامے کی تاریخ میں اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ قدیم سفرناموں میں اس کا ذکر کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اگرچہ یہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے لیکن اپنی اہمیت و افادیت کے باعث دنیا کی مختلف زبانوں من جملہ فارسی اور اردو میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

سفر اور سفرنامہ کے باب میں ''کرسٹوفر کولمبس'' کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جس نے پندرہویں صدی عیسوی میں امریکا کی دریافت کی۔ وہ ۱۴۵۱ء میں جنیوا (اٹلی) میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کے ساتھ پارچہ بافی کا کام کرتا رہا۔ ایک مدت تک اس نے اسپین کے قشتالوی عیسائی حکمرانوں کی ملازمت بھی کی لیکن اسے بچپن ہی سے سمندری سفر سے دلچسپی تھی اور وہ مارکوپولو کی سیاحت کے قصے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا۔ خود اسی کے بیان کے مطابق وہ چودہ سال کی عمر میں ملاح بن چکا تھا اور اس نے سمندری راستے سے انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور مغربی افریقا کے ساحلی علاقوں کا سفر کیا۔

۱۴۷۹ء میں وہ پرتگال گیا اور وہاں ایک پرتگالی کپتان کی لڑکی ڈونا فلیپا (Dona Filipa) سے شادی کر لی۔ کئی سال بعد اس نے افریقا کی ایک مہم سے واپسی کے بعد پرتگال کے حکمراں 'جان' سے روپیہ پیسہ اور جہاز کی درخواست کی تاکہ وہ مغرب کی طرف ہندوستان جانے کا نیا راستہ معلوم کرے، لیکن پرتگال کے بادشاہ نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے اسپین کے بادشاہ سے درخواست کی۔ اس سلسلے میں اس کے بھائی بارتھولومیو (Bar Tholomew) نے انگلینڈ اور فرانس کے بادشاہوں سے بھی مدد چاہی۔ آخرکار اس نے اپنے منصوبے کے لیے ایک اسپینی پادری کو تیار کیا جس نے اسپین کی ملکہ ایسابیلا (Isabella) سے کولمبس کو ملوایا، ایسابیلا نے اس کی تائید کی اور اسپین کے بادشاہ فرڈینینڈ (Fardinand) نے جب غرناطہ (Granada) فتح کیا

تو ایسابیلا کی سفارش پر کولمبس کی مہم کو منظور کیا گیا اور اسے ایڈمیرل کا عہدہ دے کر سفر کی اجازت دی گئی۔

۸۸ آدمیوں کے قافلے کے ساتھ اس نے ۳/اگست ۱۴۹۲ کو پالوس (Palos) سے سانٹا ماریا جہاز پر مغرب کی طرف سفر شروع کیا۔ اس کے ساتھ اور دو چھوٹے جہاز پنٹا (Pinta) اور نینا (Nina) بھی تھے۔ راستے میں بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن آخر کار ۱۲/اکتوبر کو زمین نظر آئی۔ کولمبس بڑی شان سے اترا اور بادشاہ فرڈینینڈ اور ملکہ ایسابیلا کی طرف سے اس پر قبضہ کیا اور اس کا نام سان سیلواڈور (San Salvador) رکھا۔ یہاں سے پھر مغرب ہی کی طرف جاپان کی تلاش میں نکلا اور کیوبا اور ہسپانیولا (Hispaniola) پہنچ گیا۔ یہاں پر اس نے ایک قلعہ تعمیر کرایا اور نئی آبادی بھی بسائی۔

اس نے دوسرا سفر ۲۴/ستمبر ۱۴۹۳ء میں شروع کیا جو ۱۷ جہازوں اور ۱۵۰۰/افراد پر مشتمل تھا۔ نو آبادکاروں کو ہسپانیولا چھوڑ کر وہ آگے بڑھا اور پورٹو ریکو (Puert Rico) کی دریافت کی۔ ۱۴۹۴ء کے موسم گرما میں کیوبا کے جنوبی ساحل تک پہنچا۔ اس کے بعد جمائیکا (Jamaica) پہنچا اور وہاں سے ہسپانیولا واپس آیا۔

۱۴۹۸ء میں وہ اپنے تیسرے سفر پر نکلا، پہلے وہ ہسپانیولا پہنچا اور پھر نئی سرزمین کی تلاش میں آگے بڑھتا گیا اور اس دفعہ وہ ٹرینیڈاڈ (Trinidad) اور جنوبی امریکا جا پہنچا لیکن جلد ہی وطن واپس آگیا۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں گٹھیا کا شکار ہو گیا اور اسپین ہی میں رہنے لگا۔ اس نے ۱۵۰۶ء میں وہیں وفات پائی۔

کولمبس کی سفری یادداشتوں کا اصل مسوّدہ جو اس نے خود اپنے ہاتھ سے سفر کے دوران لکھا تھا، گم ہو گیا۔ لیکن اس کا ایک نسخہ جسے 'لاس کازاس' نے اصل سے نقل کیا تھا ہم تک پہنچا اور اس کا اکثر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور خود اس کا فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جسے کامیاب خلیلی نے 'انتشارات قصیدہ سرا' سے ۱۳۸۱ش میں شائع کیا۔

کولمبس کے ایک بیٹے نے اپنے باپ کی روزانہ کی سفری یادداشتوں کو 'لاس کازس' کے حوالے کیا تاکہ وہ اسے نقل کر کے صاف صاف لکھ دے لیکن چونکہ اس کی یادداشتیں بڑی مفصل تھیں اس لیے کازاس نے اس کا خلاصہ کر دیا اور اس کا اصل سفرنامہ جو یادداشت کی صورت میں موجود تھا ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ تاہم یہ خلاصہ بھی بہت اہم ہے اور اس کے سفر کے اہم واقعات و حادثات کا احاطہ کرتا ہے۔

اس کے بعد سفرنامے کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا اور دنیا کی سبھی زبانوں میں بے شمار سفرنامے لکھے گئے۔ موجودہ دور میں سفرنامہ ایک اہم صنف ادب بن چکا ہے جسے فنی حیثیت بھی حاصل ہے۔ لیکن چونکہ اب تک اس کے اصول و ضوابط اور پیمانے نہیں مقرر کیے گئے اس لیے سفرناموں کو پڑھ کر ادب میں ان کا مقام متعین کرنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محققین و ناقدین اس پر توجہ فرمائیں اور اس کی جانچ اور پرکھ کے پیمانے مقرر کریں تاکہ سفرناموں کے مطالعے کے بعد ان کی قدر و قیمت اور ان کا ادب میں مقام متعین کیا جا سکے۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

(۱) Dictionary of world litreture P-7 بحوالہ ''اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ''، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۲۰۱۱، ص ۶۲

(۲) تاریخ نوشتہ ہای جغرافیائی در جہان، کراچکوفسکی، ترجمہ ابوالقاسم پایندہ، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۷۹ش، ص ۱۰۷

(۳) ہندوستان عربوں کی نظر میں، معین الدین ندوی، مخزونہ ذاکر حسین لائبریری، ص ۵۶

(۴) مروج الذہب، ابوالحسن مسعودی، ترجمہ ابوالقاسم پایندہ، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۷۴ش، ج۔ا، ص ۹۴

(۵) مروج الذہب، ج ا، ص ۱۷

(۶) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ابوعبداللہ مقدسی، ترجمہ خورشید احمد فاروقی، یونین پریس، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۶۱

(۷) سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی، خواجہ الطاف حسین حالی، مطبع اخبار خیر خواہ ہند، دہلی، ۱۸۸۲ء، ص ۳۳-۳۴

☆☆☆☆☆

کتابیات:

(1) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ابوعبداللہ مقدسی، ترجمہ خورشید احمد فاروقی، یونین پریس، دہلی، ۱۹۹۲ء

(2) اخبار الصین والہند، باہتمام ابراہیم خوری، دار الموسوم للاعلام، پہلا ایڈیشن، بیروت، ۱۹۹۱ء

(3) اردو ادب میں سفرنامہ، انور سدید، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء

(4) اردو ادب میں ایران کے سفرنامے، شبیلہ کوثر، مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، (Acc.99856)

(5) اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء

(6) اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

(7) اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

(8) اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، قدسیہ قریشی، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۸۷ء

(9) اردو کے غیر مذہبی سفرنامے، بشریٰ رحمان، شاندار پریس جامع مسجد، گورکھپور، ۱۹۹۹ء

(10) اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۸۶ء

(11) الفہرست، ابن الندیم، لائپزگ، 1871ء

(12) ایک چینی سیاح کا سفرنامہ، ہیونگ سانگ، (مترجم نامعلوم)، پنجاب ریلیجس بک، لاہور، ۱۹۰۹ء

(13) تاریخ نوشتہ ہای جغرافیائی در جہان، کراچکوفسکی، ترجمہ ابوالقاسم پایندہ، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۷۹ش

(14) تجدد و تجدد ستیزی در ایران، عباس میلانی، نشر اختران، تہران، چاپ ششم، ۱۳۸۵ش

(15) تحفۃ الحرمین، نایب الصدر شیرازی، تہران، ۱۳۶۲ش

(16) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، تہران، ۱۳۴۳ش

(17) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (ادبیات)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

(18) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (تاریخ)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

(19) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (سماجی علوم [جغرافیہ])، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

(20) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (فنون لطیفہ)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

(21) سفرنامہ ابن بطوطہ، ابن بطوطہ/ رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۶ء

(22) سفرنامہ ابن بطوطہ، مترجم دکتر محمد علی موحد، بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب، تہران، ۱۳۵۹ش

(23) سفرنامہ احمد بن فضلان، ترجمہ ابوالفضل طباطبائی، شرق، تہران، ۱۳۵۵ش

(24) سفرنامۂ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی، خواجہ الطاف حسین حالی، مطبع اخبار خیر خواہ ہند، دہلی، ۱۸۸۲ء

(25) سفرنامہ مارکو پولو، مارکو پولو (مترجم نامعلوم)، ریلجس بک سوسائٹی، لاہور، ۱۹۱۱ء

(26) سفرنامہ محمد ابن جبیر اندلسی، محمد ابن جبیر/ (مترجم) حافظ احمد علی خاں شوق، مطبع احمدی، رام پور، ۱۹۰۰ء

(27) سفرنامہ ابن جبیر، محمد بن احمد بن جبیر، ترجمہ پرویز اتابکی، آستان قدس رضوی، دانشگاہ امام رضاؑ، ۱۳۷۰ش

(28) سیر ایران، محمد حسین آزاد، آزاد بک ڈپو، لاہور، سنہ ندارد

(29) شرح حال نابغہ شہر ایران ابوریحان محمد بن احمد خوارزمی بیرونی، علی اکبر دہخدا، کتابخانۂ طہوری، تہران، 1352ش

(30) عجائب الاسفار، شیخ ابن بطوطہ/ عطاء الرحمان، رحمانی پریس، دہلی، ۱۳۳۴ھ

(31) کتاب الہند، ابوریحان البیرونی/ مترجم لطیف ملک، سنگ میل، لاہور، ۱۹۶۵

(32) مروج الذہب، ابوالحسن مسعودی، ترجمہ ابوالقاسم پایندہ، انتشارات علمی وفرہنگی، تہران، ۱۳۷۴ش

(33) نامور سیّاحوں کے سفر، ارک ووڈ، پنجاب بک کمپنی، لاہور، ۱۹۲۸ء

(34) نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق، ابوعبداللہ ادریسی، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، قاہرہ، ۱۹۷۹ء

(35) ہندوستان عربوں کی نظر میں، معین الدین ندوی، مخزونہ ذاکر حسین لائبریری

☆☆☆☆☆

Faizan Haider
Pura Maroof, Kurthijafar Pur,
Dist. Mau, U.P 275305,
Mob. 7388886628, 9455341072,
Email: faizanhaider40@gmail.com

احمد گلچین معانی کی ادبی خدمات پر ایک اجمالی نظر

سید نقی عباس (کیفیؔ)

گلچین به جز کتاب مرا نیست مونسی
دائم کتاب خانه اذانم نشیمن است

مرحوم استاد احمد گلچین معانی معاصر ایرانی کتاب شناس، تذکرہ نویس، مورخ، مصحح متن، فہرست نویس، اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا شمار ان ایرانی دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے خصوصاً ہندوستانی فارسی ادب کو اپنے تحقیقی میلانات کا محور بنایا اور بعض اہم تذکروں اور کتابوں کی تصحیح کی۔

استاد گلچین معانی، 18 دی 1895 شمسی/ 8 فروری 1917ء کو تہران کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام علی اکبر تھا (1) ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد، استاد گلچین معانی 1313 شمسی/ 1935ء میں وزارت عدلیہ سے وابستہ ہو گئے اور تقریباً چھبیس سال تک اس سے منسلک رہے۔ چونکہ عدلیہ سے وابستگی ان کے ادبی رجحانات کے منافی تھی لہٰذا انھوں نے 1338 شمسی/ 1959ء میں استعفیٰ دیدیا۔ تاہم قابل ذکر ہے کہ اس دوران بھی وہ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے عموماً دوپہر میں کتابخانۂ ملک تہران میں مطالعہ اور ادبی کاموں میں مشغول رہے۔ عدلیہ سے مستعفی ہونے کے بعد مکمل طور پر علمی و ادبی کاموں سے وابستہ ہو گئے اور تقریباً چار سال کتابخانۂ مجلس تہران میں ہمہ وقت علمی و ادبی امور کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ وہ چار سال تک اس کتب خانے کی مجلس منتظمہ کے اہم رکن بھی رہے اور پھر 1342 شمسی/ 1964ء میں اپنی درخواست پر اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ اسی سال کتابخانۂ قدس رضوی کی درخواست پر وہاں منتقل ہو گئے اور وہاں کے قلمی نسخوں کی فہرست مرتب کرنے لگے۔ یہ فہرست پانچ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

استاد گلچین معانی نے اپنی زندگی کے آخری پچیس سال علم و ادب کی خدمت اور کتابخانۂ ملک، آستان قدس رضوی اور مجلس شورائے ملی جیسے علمی مراکز سے وابستگی میں گزارے۔ معاصر دانشمند ڈاکٹر غلام حسین یوسفی کے بقول:

> ''بست و پنج سال کار مداوم در کتاب خانہ ہا۔۔۔ وسروکار داشتن دایمی با کتاب ہا و نسخہ ہای خطی و تذکرہ ہا و آثار ادبی و مطالعات و تتبعات فراوان، سبب شد کہ گلچین از کتاب شناسان معدود کشور بہ شمار آید''۔(2)

آستان قدس رضوی میں مشغولیت کے باعث استاد گلچین معانی مستقل طور پر مشہد میں رہنے لگے، اس کے پیش نظر ڈاکٹر غلام حسین یوسفی کی کوششوں سے وہ دانشگاہ فردوسی مشہد میں درس و تدریس سے بھی وابستہ

رہے۔ استاد گلچین معانی اگرچہ محقق و دانشمند تھے اور بیشتر اوقات کتب خانوں میں بسر کرتے تھے لیکن ادبی منظرنامے پر وہ ایک شاعر کی حیثیت سے جانے گئے۔ ادبی انجمنوں میں پابندی سے شرکت کرتے رہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کی اسی فعالیت نے ان کے اندر ادبی تحقیق کا ذوق وشوق پیدا کیا تو غلط نہ ہوگا۔ مثلاً وہ 1314 شمسی/ 1935ء میں ''انجمن ادبی حکیم نظامی'' سے وابستہ ہوئے۔ اس زمانے میں استاد وحید دستگردی مرحوم ''خمسۂ نظامی'' کی تصحیح میں مشغول تھے۔ یہ وہ پہلا موقع تھا جب گلچین معانی متن اور تصحیح متن سے آشنا ہوئے اور اپنے زمانے کے ایک جید استاد کے ساتھ انھیں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں وہ خود کہتے ہیں:

''عشق علاق×ای ک×تد×ب×کتاب خطّی پید اکردم تمافت×زفت×دا عدا کتاب شناسان معد و دشناخت×شدم لہ آن جا پدیدآ مدک×درا و اخر سال 1314 ش./ 1935 م نوزد×سال از سنین عمرم می گذشت ب×انجمن ادبی حکیم نظامی را×یافتم و ب×سلسلۂ استاد فقید مرحوم وحید دستگردی پیوستم۔
در آن اوقات ب لک×تا آخرین روز حیات استاد، جوان ترین فرد آن انجمن بودم۔ در آن محضر پُرفیض، ک×محل تجمّع استادان سخن بود×فت×ای یک شب ب×ریاست مرحوم وحید تشکیل می یافت، کار اساسی و مفیدی ک×پیش از شعرخوانی اعضای انجمن صورت می گرفت مقابل×و تصحیح خمسۂ نظامی بود۔
مرحوم وحید، قدیمی ترین نسخۂ خمسۂ نظامی را عمداً ب×دستِ بند×می داد و می فرمود ک×بخوانم و بند×نا گزیر بودم شعار نظامی را از روی آن نسخ×ک×ن سال با رسم الخطِّ نا آشنایی ک×داشت، بصورت بلند بخوانم و دیگران با نسخ×ایی ک×در دست داشتند مقابل×کنند و اختلاف قرأت را لذ کور بدارند۔ جوانی نوخواست×و محبوب و شاعری مبتدی را در محضر استادی بزرگی چون وحید و سخن سرایانی نا لبِگنت×ا نظر بگیرید ک×در خواندن ابیاتِ سخن سالار گنج×رسم الخطِّ عجیب وغریب نسخۂ خطّی مزبور تا چ×حدّی می بایستی اطراف و جوانب کار را بنگرد و پاس حیثیت خود را بدارد تا کلم×ای را ب×غلط نخواند و در چنان مجمع ای شرمند×و سرافکند×نشود۔ این تمرین اجباری، ولی ذوق انگیز ب×زودی برای من امری عادی و اختیاری شد و مرا ب×کت×ب خان×کشید و ب×آن جا رسانید ک×علاو×بر نشر مقالاتِ فنّی عدید×، چندین کتاب در رشتۂ کتاب شناسی، تالیف وتدوین کنم و این×ام×از برکتِ تربیتِ استادِ بی نظیر و صاحبِ نظر و حید بود×است ک×از نخستین دیدار چو×روا ستعداد این کار را در وجنات من دید×و در یافت×بود''۔(3)

استاد احمد گلچین معانی نے تصحیح متن کے میدان میں قدم رکھا اور سب سے پہلے ''تذکرۂ میخانہ'' کی تصحیح کی جو 1321 شمسی/ 1942ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے یکے بعد دیگرے متعدد تذکروں اور چھوٹے بڑے رسالوں کی تصحیح کا کام انجام دیا اور اس میدان میں ایک معتبر نام بن کے ابھرے۔ استاد وحید دستگردی کی وفات کے بعد گلچین معانی نے محمد علی ناصح کے باہمی تعاون سے ''انجمن ادبی ایران'' کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح اس زمانے کے ''فرہنگستان ایران'' کے ڈائرکٹر ادیب السلطنت حسین سمیعی نے ''انجمن ادبی فرہنگستان ایران'' کی بنیاد ڈالی جس میں گلچین معانی ہمیشہ ایک فعال ذمہ دار رکن کی حیثیت سے موجود رہے۔

استاد گلچین معانی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا تھا اور اپنے تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ان کے اشعار خوش گزرانی محض یا تفنن طبع ہی نہیں، بلکہ سیاسی، سماجی حالات پر ایک صاحب نظر و صاحب قلب شاعر کے تبصرے ہیں۔ اکثر ان کی سیاسی نظمیں مستعار تخلصوں کے ساتھ اخباروں اور مجلّوں میں چھپتی رہیں۔ ان کا دیوان 1362 شمسی/ 1983ء میں تہران سے شائع ہوا۔

استاد احمد گلچین معانی کی ذات اپنے آپ میں ایک دریائے متلاطم معانی تھی جو کہ 16 اردی بہشت 1379 شمسی/ 5 مئی 2000ء کو دریائے ابدیت سے جاملی۔

استاد احمد گلچین معانی نہ صرف کثیر المطالعہ تھے بلکہ کثیر التصانیف بھی تھے اور ان کی نگارشات کو ادبی تحقیق، تصحیح متن، فہرست نویسی وشاعری کے ذیل میں رکھا جاتا ہے۔ ان کے آثار کی مکمل فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ گلچین معانی کی بیشتر کتابیں متعدد بار اور مختلف ناشروں کے ذریعہ شائع ہوئی ہیں، موجودہ فہرست میں عموماً پہلی اشاعت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

فہرست آثار استاد احمد گلچین معانی

☆تصحیح متن:

(1) تذکرۂ میخانہ×، تالیف: میرزا محمّد علی مذ×ب اصف×انی متخلّص ب×ب×ر×، ناشر: شرکت تضامنی حیدری ت×ران، 1331 ش./ 1952ء۔ (چاپ اول)

(2) لطائف الطّوائف، تالیف: مولانا فخرالدّین علی صفی، انتشاراتِ اقبال ت×ران، 1336 ش./ 1957ء

(3) تاریخِ ملّا زاد×درذکر مزاراتِ بخارا، تالیف: احمد بن محمّد المدعو ب×معین الفقراء، انتشاراتِ ابن سینا ت×ران، 1339 ش./ 1960ء

(4) تذکرۂ میخان×، تالیف: ملّا عبدالنّبی فخرالزّمانی قزوینی، انتشاراتِ اقبال ت×ران، 1340 ش./ 1961ء

(5) تذکرۂ منظومِ رشح×، تالیف: محمّد باقر رشح×اصف×انی، انتشاراتِ امیر کبیر ت×ران، 1334 ش./ 1955ء

(6) الایضاح عن اصول صناع×المسّاح، تالیف: ابو منصور عبدالقا×ر بن طا×ر بن محمّد بن عبداللہ تمیمی، بنیاد فر×نگ ایران، ت×ران، 1347 ش./ 1969ء

☆ادبی تحقیق:

(1) شہر آشوب در شعر فارسی، انتشارات امیر کبیر، تہران، 1336 ش/ 1967ء

(2) مکتب وقوع در شعر فارسی، بنیاد فرہنگ ایران، تہران 1348 ش/ 1969ء

(3) تاریخ تذکرہ ہای فارسی، انتشارات دانشگاہ تہران، 1349ش/ 1970ء (جلد اول)، 1360ش/ 1971ء (جلد دوم)

(4) گلزار معانی، نگارش بزرگان ادب و ہنر ایران در دوران جنگ جہانی دوم، سلسلۂ نشریات ما، تہران، 1352ش/ 1973ء

(5) تذکرۂ پیمانہ (ساقی نامہ ہاوساقی نامہ سرایان)، دانشگاہ فردوسی مشہد، 1359ش/ 1980ء

(6) فرہنگ اشعار صائبؔ، جلد اول از حرف ''آ'' تا ''ز''، وجلد دوم از حرف ''س'' تا ''ی''، موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی، تہران، 1364ش/ 1985ء

(7) مضامین مشترک درشعر فارسی، شرکت انتشاراتی پاژند، تہران، 1369ش/ 1990ء

(8) کاروان ہند، (دوجلد) انتشارات آستان قدس رضوی، مشہد، 1369ش/ 1990ء

(9) تکملۂ امثال وحکم، انتشارات تاسوعا، مشہد، 1378ش/ 1990ء

(10) تحفۂ گلچین، یہ کتاب فضلا، ادبا اور شعرا کے متعلق حکایات، لطیفے، بدیہہ گوئی وحاضر جوابی کے واقعات پر مشتمل ہے اوراب تک شائع نہیں ہوسکی ہے۔ (نامۂ معانی، ص33)

☆ فہرست نگاری:

(1) فہرست چند مجموعۂ کتابخانۂ مجلس شورای ملی (دفتر پنجم، زیر نظر محمد تقی دانش پژوہ وایرج افشار)، انتشارات دانشگاہ تہران، ص153-203

(2) فہرست آستان قدس رضوی (جلد 7، بخش 2-1 (انتشارات ادارۂ کتابخانہ، 1346ش/ 1967ء

(3) رہنمای گنجینۂ قرآن، آستان قدس رضوی، مشہد، 1347ش/ 1968ء

(4) فہرست قسمتی از کتب خطی کتاب خانۂ مرحوم عبدالحسین بیات (دفتر ششم، زیر نظر محمد تقی دانش پژوہ وایرج افشار)، انتشارات دانشگاہ تہران، 1348ش/ 1969ء، ص63-117

(5) فہرست کتب خطی کتابخانۂ آستان قدس رضوی (جلد 8، انتشارات ادارۂ کتابخانہ، مشہد، 1350ش/ 1971ء)

(6) فہرست کتب خطی کتابخانہ مرکزی آستان قدس رضوی (جلد 13، لغت)، باہمکاری غلام علی عرفانیان، انتشارات کتابخانۂ مرکزی آستان قدس رضوی، مشہد، 1372ش/ 1993ء

☆ مختصر رسائل:

(1) آتشکدۂ آقا صادق تفرشی ومثنوی آذر، مجلّہ دانشکدۂ ادبیات مشہد، سال 3، شمارہ 1، بہار 1342ش/ 1963ء، ص23-51

(2) ابر گہر بار، نشریۂ دانشکدۂ ادبیات تبریز، سال 17، شمارہ 4، 1344ش/ 1956ء، ص

490-500 ''ابر گہر بار'' میرزا ارشد برنا آبادی کی مثنوی ہے جو ''مخزن الاسرار'' نظامی کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔

(3) اختیارات منظوم، فرہنگ ایران زمین، جلد 21، تہران، 1354ش/ 1975ء، ص116-117

(4) السوانح فی العشق، سالنامہ کشور ایران، سال 21، 1345ش/ 1966ء، ص305-366

(5) انشای علامۂ العلمائی۔۔۔، تحقیق در مبدای آفرینش، جلد 2، شمارہ 10، 1343ش/ 1964ء، ص27-28

(6) تاریخ یادگار، یغما، سال 16، شمارہ 6، شہریور 1342ش/ ستمبر 1963ء، ص283-287

(7) تصحیح یک رباعی از جمال الدین محمد بن نصیر، وزیر سلطان غیاث الدین غوری، یادگار، سال 2، شمارہ 10، خرداد 1352ش/ جون 1973ء، ص63-68

(8) تصحیح یک قصیدہ از حکیم ناصر خسرو، یادنامۂ ناصر خسرو، دانشگاہ فردوسی، مشہد، 1355ش/ 1976ء، ص444-450

(9) خانقاہ ومقبرۂ صدرالدین ابراہیم بن سعدالدین حموی جوینی، مجلۂ دنشکدۂ ادبیات مشہد، سال 7، شمارہ 4، 1350ش/ 1971ء، ص868-886

(10) خطاب وعتاب میرداماد بہ ملا عبد اللہ شوشتری، وحید، سال 6، شمارہ 5، اردی بہشت 1348ش/ مئی 1969ء، ص363-368

(11) دیباچۂ انیس الارواح، مجلۂ دانشکدۂ ادبیات دانشگاہ مشہد، سال 4، شمارہ 4، 1347ش/ 1968ء، ص330-375

(12) رسالہ در علم سیاق، مجلۂ دانشکدۂ ادبیات دانشگاہ تہران، سال 12، شمارہ 4، فروردین 1344ش/ مارچ 1965ء، ص335-363

(13) سرشماری در تہران در زمان ناصرالدین شاہ، یغما، سال 13، شمارہ 4، تیر 1339ش/ جون 1969ء، ص207-211

(14) فتوت نامۂ ناصری، فرہنگ ایران زمین، جلد 11، 1342ش/ 1963ء، ص93-101

(15) کنوز الاسرار ورموز الاحرار، مجلۂ دانشکدۂ ادبیات دانشگاہ تہران، سال 14، شمارہ 3، بہمن 1345ش/ جنوری 1967ء، ص531-328؛ وشمارہ 4، فروردین 1346ش/ مارچ 1967ء، ص522-494۔ یہ مثنوی ایک نامعلوم شاعر کی سوانح العشاق تالیف احمد غزالی کی منظوم شرح ہے جو 674 اشعار پر مشتمل ہے۔

(16) وصایای افلاطون شاگرد خویش را ارسطالیس، وحید، سال 8، اسفند 1349ش/ فروری 1971ء، ص385-399

(17) یک رسالۂ نفیس و کہن سال ہنری، نشریۂ دانشکدۂ دانشگاہ تبریز، سال 14، شمارہ 3، 1341ش/ 1963ء، ص287-310

(18) یک نامۂ تاریخی از قائم مقام فراہانی کہ تاکنون نشر نیافتہ است، وحید، سال 3، دی 1344ش/ دسمبر 1965ء، ص29-31

☆☆☆☆☆

حواشی:

(1) نامۂ معانی، ص20؛ (انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا میں موصوف کی تاریخ ولادت 1916ء درج ہے جو درست نہیں ہے)

(2) چشمۂ روشن، صص 702،703

(3) وقفِ میراثِ جاویدان، ص117

☆☆☆☆☆

Syed Naqi Abbas (Kaify)
Guest Faculty, Dept. of Persian,
University of Delhi 110008,Mob. 9968748275,
Email: kaifyy@gmail.com

پروفیسر نیر مسعود کی گراں قدر تالیف انیسؔ (سوانح) کا تنقیدی جائزہ

وسیم حیدر ہاشمی

پروفیسر سید نیر مسعود اردو فارسی ادبیات کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر گراں قدر کتابیں، مضامین اردو ادب کو دیئے ہیں، جن میں انیس (سوانح) ان کا معرکتہ الآرا علمی تحقیقی کام سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر سید نیر مسعود کی ولادت ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ تھا جو لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر اور مایۂ ناز محقق تھے۔ نیر مسعود کی تعلیم والد کی نگرانی میں لکھنؤ میں ہوئی۔ موصوف نے ہائی اسکول، لکھنؤ کے گردھاری سنگھ ہائی اسکول سے ۱۹۵۱ء میں اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ جبلی کالج لکھنؤ سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں سے بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے ۱۹۵۷ء میں فارسی میں ایم۔اے۔ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ پھر الہ آباد چلے گئے اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ موصوف نے الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں فسانۂ عجائب پر اردو میں پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی، پھر واپس لکھنؤ لوٹ آے اور دوبارہ شعبۂ فارسی میں داخلہ لے کر وہیں سے اپنی دوسری پی ایچ۔ڈی مکمل کی۔ ان کی اس پی ایچ۔ڈی کا موضوع 'صوفی مازندرانی اور اس کا تذکرہ ''بت خانہ'' تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء میں بریلی کے 'گاندھی فیض عام اسلامیہ کالج' میں ان کی تقرری بحیثیت لکچرر ہوگئی، مگر لکھنؤ کے مقابلے انھیں بریلی کا ماحول کچھ زیادہ پسند نہ آیا چنانچہ وہ اسی سال یعنی ۱۹۶۵ء میں ہی اسلامیہ کالج سے مستعفی ہوکر لکھنؤ آ گئے اور وہیں شعبۂ اردو، فارسی میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوگیا۔ یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۷۷ء میں تہران (ایران) بھی تشریف لے گئے۔ ایران کے سفر سے لوٹنے کے بعد موصوف نے اپنا سفرنامہ تحریر کیا جو ۴/اگست ۱۹۷۸ء کو 'اظہار' بمبئی میں شائع کرایا۔ نیر مسعود اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی نظمیں، کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھا کرتے تھے جو بچوں کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ مختصر افسانہ نگاری کے میدان میں بھی انھوں نے بہت کامیاب افسانے لکھے۔ انھوں نے ۳۲ سے زیادہ کتابیں اور ۵۰۰ سے زیادہ مضامین اردو اور فارسی موضوعات پر سپرد قلم کیے۔ موصوف کی متعدد کتابوں اور افسانوں کے تراجم اِسپینی، فرانسیسی، انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں بھی شائع ہوئے۔ نیر مسعود کی بیش بہا علمی و ادبی خدمات کے لیے کئی اردو اکادمیوں کے علاوہ ساہتیہ اکادمی نے بھی انھیں انعام سے نوازا۔ موصوف کے افسانوی مجموعے ''طاؤس چمن کی مینا'' کو ۲۰۰۷ء کا سترہواں 'سرسوتی سمّان' دیا گیا۔ موصوف کی یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی تھی۔

انیسؔ (سوانح):

پروفیسر نیر مسعود کی دلچسپی اور مطالعہ وتحقیق کا ایک اہم میدان 'انیس اور متعلقات انیس' رہا ہے۔ انھوں نے رثائی ادب میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں، وہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ خاص کر موازنے اور ادبی معرکوں کے علاوہ سوزخوانی کے موضوع کو جس دقت نظر سے ادبی منظرنامے پر پیش کیا ہے کسی اور سے ممکن نہ ہوسکا۔ انیسیات کے تعلق سے پروفیسر نیر مسعود کی یہ حوالہ جاتی کتاب اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اس کتاب میں میر انیسؔ کی زندگی کے نشیب وفراز سے متعلق نیر مسعود کے کل ۱۹/جامع مضامین ہیں۔ کل ۴۷۲/صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۱۱/ابواب کے ساتھ ۱۵۱/ذیلی عناوین ہیں۔

زیر بحث کتاب کا آغاز موصوف نے میر انیسؔ کے آبائی وطن فیض آباد اور ان کے والد میر مستحسن خلیقؔ سے کیا ہے پھر بھی اگر نیر مسعود ضمناً ضاحکؔ اور میر حسنؔ کا ذکر بھی کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ اس سے اردو کے طلبا مستفیض ہوتے کیوں کہ عام طور پر ایم۔اے۔ تک کے طالب علم میر ضاحکؔ سے تقریباً نابلد ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کتاب کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے پیش نظر انھوں نے میر ضاحکؔ کے تفصیلی ذکر سے گریز کیا ہو۔

اردو مرثیہ کو باقاعدہ صنف سخن کی حیثیت سے روشناس کرانے اور جدید دور تک لانے میں میر ضمیرؔ، فصیحؔ و دلگیرؔ وغیرہ کے ساتھ خلیقؔ نے جتنی محنت کی تھی اس اعتبار سے نیر مسعود نے خلیقؔ کی خدمات کا اچھا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب میں میر انیسؔ کی زندگی کے تعلق سے نیر مسعود نے چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات اور واقعے کو بھی نظرانداز نہیں کیا بلکہ پوری وضاحت کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔

میر انیسؔ کے خاندان کے تعلق سے مصنف فرماتے ہیں کہ میر انیسؔ سادات 'موسوی' سے تعلق رکھتے تھے یا سادات 'رضوی' سے، کیوں کہ میر حسن نے ایک مقام پر اپنے اجداد کے تعلق کا ذکر میر امامی موسوی (صفحہ ۱۱) سے بھی کیا ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امام موسیٰ کاظمؑ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جب کہ ان کا تعلق امام رضاؑ کے خاندان سے تھا۔ انیسؔ کے مقام پیدائش (گلاب باڑی، فیض آباد) اور والدہ ہینگا بیگم کے خاندان کی بابت بھی مناسب جانکاری فراہم کرائی ہے۔ میر انیسؔ کی زندگی کے آغاز کے ساتھ ان کے بچپن، تعلیم وتربیت اور اساتذہ کے ذکر کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ پانچ برس کی عمر سے مصرعے موزوں کرلیا کرتے تھے۔ ''وہ کھیلتے میں برابر موزوں فقرے کہا کرتے تھے'' (صفحہ ۱۸)۔ لڑکپن کے دوران میر انیسؔ نے اپنی بکری کی موت اور 'تکل' کے کھوجانے کے سلسلے میں جو پانچ شعر کہے تھے وہ بھی نیر مسعود نے اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ میر انیسؔ کے اساتذہ میں موصوف نے میر نجف علی اور انیسؔ کے والد خلیقؔ کا بھی ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ میر انیسؔ کے ایک استاد مولودی حیدر علی فیض آبادی حنفی سنی عالم بھی تھے۔ اس سلسلے میں نیر مسعود نے دونوں (میر انیسؔ اور مولوی حیدر علی فیض آبادی) کی تاریخ ولادت کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کی عمروں کے درمیان صرف پانچ یا چھ برس کا فاصلہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''استادی شاگردی کا رشتہ

مشکوک بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے'' (صفحہ ۲۱)۔ میر انیسؔ کی تعلیم کے سلسلے میں موصوف نے ان کی نصابی تعلیم کے ساتھ شہ سواری، سپہ گری، تیراندازی اور تلوار بازی کا بھی ذکر پوری وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔

خلیقؔ نے میر انیسؔ کی خداداد صلاحیتوں کو ان کی طفلی میں ہی پہچان لیا تھا چنانچہ وہ میر انیسؔ کو اکثر وبیشتر اپنے ساتھ ہی رکھتے۔ تلاش معاش اور دوسری ضرورتوں کے تحت جب بھی ان کو فیض آباد سے لکھنؤ جانا ہوتا تو اکثر سفر میں انیسؔ ان کے ہمراہ ہوتے۔ اسی زمانے میں میر انیسؔ کے کلام پر ناسخؔ کی اصلاح کے سلسلے میں ایک نہایت پرلطف واقعے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ جب خلیقؔ کو لکھنو سے دور جانا ہوتا تو وہ انیسؔ کو کئی کئی دنوں کے لیے لکھنؤ میں ہی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ نیر مسعود نے میر انیسؔ کو لکھنؤ میں چھوڑے جانے کے سلسلے میں دبی زبان سے یہ بھی کہا ہے کہ خلیقؔ نے لکھنؤ میں بھی ایک شادی کر رکھی تھی اور وہ میر انیسؔ کو اسی بیوی کے پاس چھوڑ کر کئی کئی دنوں کے لیے لکھنؤ سے دور رہا کرتے اور واپسی میں انیسؔ کو ہمراہ لے کر فیض آباد واپس چلے جاتے۔ اس زمانے تک خلیقؔ نے لکھنؤ میں سکونت نہیں اختیار کی تھی بلکہ مع اہل وعیال فیض آباد میں ہی مستقل طور سے رہا کرتے تھے۔ میر انیسؔ کو لکھنؤ میں کئی کئی دنوں تک جس بیوی (صفحہ ۵۷) کے پاس چھوڑنے کا ذکر نیر مسعود نے کیا ہے وہ خاص ہے۔ خاص طور پر انیسؔ کے بچپن کے تعلق سے، مگر نیر مسعود نے اس بات کا ذکر نہایت مختصر طور پر کیا ہے، جب کہ میر خلیقؔ کی لکھنؤ والی بیوی اور ان کی اولاد کے ذکر میں وضاحت سے کام لینا چاہیے تھا کیوں کہ اس کتاب میں پروفیسر نیر مسعود نے میر انیسؔ کے تعلق سے باریک سے باریک اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نہ تو نظرانداز کیا ہے نہ ہی مختصر ذکر پر اکتفا کیا ہے، اس لیے اس واقعے پر مدلل بحث اور اس کی وضاحت ضروری تھی۔

میر انیسؔ کی باقاعدہ شاعرانہ زندگی کے آغاز کو، نیر مسعود ان کی غزل گوئی سے بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ آزادؔ کے نام میر انیسؔ کے ایک خط کے حوالے سے ان کے 'عالم شباب' (صفحہ ۴۰) کا زمانہ بتاتے ہیں۔ اس زمانے کی میر انیسؔ کی غزلوں پر زیادہ طولانی بحث نہ کرنے کے ساتھ ہی ''آب حیات'' (صفحہ ۵۱۹) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''ابتدا میں انھیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں (تحقیقی نقطہ نظر سے اس مقام کا نام، تاریخ اور اس شخص کا نام بتانا اور مزید تحقیق ناگزیر تھی جسے نظرانداز کیا گیا) مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ مشفق باپ خبر سن کر دل میں تو باغ باغ ہوا مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انھوں نے حال بیان کیا۔ (خلیق نے) غزل سنی اور فرمایا کہ بھائی اب غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زور طبع کو صرف کرو جو دین ودنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اسی دن ادھر سے رخ موڑ لیا۔ غزل مذکور کی طرح میں سلام کہا۔'' اتنا لکھنے اور 'غزل کو سلام کرنے' کے ذکر کی وضاحت کے بعد چند اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''۔۔۔۔۔ قیاس کہتا ہے کہ شاید یہی میر انیسؔ کی آخری غزل ہو۔'' ایسے زود گو شاعر کے سلسلے میں یہ قیاس درست نہیں کہ انھوں نے اتنے کم اشعار کہے یا پوری غزل دستیاب ہی نہیں۔ اگر یہ میر انیسؔ کی آخری غزل (اور بعد میں سلام) کے اشعار ہیں تو شروع زمانے کے اشعار بھی ملنا چاہیے جن کا کہیں کوئی ذکر یا حوالہ درج نہیں ہے۔ اب اس غزل اور سلام کے تخلص کے سلسلے میں ان اشعار کی نقل ضروری ہے جن کا حوالہ نیر مسعود نے دیا

ہے۔وہ فرماتے ہیں:"۔۔۔غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں (صفحہ ۴۲):

غزل

اشارے کیا نگہِ ناز دل ربا کے چلے — ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے
پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی — صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے
مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی — حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

مذکورہ سلام میں چودہ اشعار ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے — خدا کے آگے ندامت سے سر جھکا کے چلے
مقام یوں ہُوا اس کارگاہ دنیا میں — کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہل بیت امام — مزار شاہ پہ لخت جگر چڑھا کے چلے

نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سلام کا مقطع بہت مشہور ہے:

انیسؔ دَم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ — چراغ لے کے کہاں سامنے ہَوا کے چلے

موصوف نے غزل اور سلام کے صرف تین تین اشعار نقل فرمائے ہیں جب کہ یہاں پورے سلام کے ساتھ ہی پوری غزل کو بھی نقل کرنا میری نظر میں ضروری تھا۔سلام کے دوسرے شعر پر غور فرمائیں تو شعر جتنا سلام کا محسوس ہوتا ہے اتنا ہی غزل کا بھی لگتا ہے کیوں کہ بے ثباتی عالم کے موضوع کا جتنا تعلق سلام سے ہے اتنا ہی غزل سے بھی ہے۔ یہاں سلام کے ساتھ مقطع تو پیش کیا جب کہ غزل سے مقطع کا شعر ندارد ہے۔ یہ صورت حال دو طرف اشارہ کرتی ہے۔ یا تو میر انیسؔ کی درج بالا غزل (جس کے ساتھ اتنی اہم روایت منسوب ہے) کے دیگر اشعار کے ساتھ مقطع کا شعر بھی کسی سبب تلف ہو گیا یا پھر انیسؔ نے غزل کے ساتھ مقطع کہا ہی نہیں، جو کہ ممکن نہیں یا پھر غزل اور سلام دونوں کا مقطع ایک ہی ہے جو عام طور پر سلام کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ان میں راقم السطور کو پہلی بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ غزل کے باقی اشعار کے ساتھ اس کا مقطع بھی تلف ہو گیا ہوگا۔ بہر حال اگر متذکرہ غزل اور سلام دونوں کے مقطعوں کو ایک ہی مان لیا جائے تو بھی ایک سوال برقرار رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ "انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ۔۔۔۔تو بات اور بھی الجھ جاتی ہے، کیوں کہ جس زمانے میں میر انیسؔ صرف غزلیں کہا کرتے تھے اور قرب و جوار کے مشاعروں میں پڑھنے جایا کرتے تھے اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی اور وہ انیس تخلص نہیں کرتے تھے بلکہ حزیں تخلص کرتے تھے۔اس لیے ابتدائی زمانے کی ان کی تمام غزلوں کے ساتھ انیس نہیں بلکہ حزیں تخلص ملنا چاہیے۔اس سلسلے میں کوتاہ نظر راقم کا خیال ہے کہ میر انیسؔ کی متذکرہ غزل اور سلام سے ملحق روایت الحاقی ہو سکتی ہے کیوں کہ میر انیسؔ جس زمانے میں غزلیں کہا کرتے تھے وہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔انیسؔ کے ابتدائی دور کے اشعار میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں تھی جو مذکورہ سلام میں ہے۔لفظوں کا یہ امتزاج، ایسی تشبیہ، استعارے، شعری صنعتیں اور دیگر شعری لوازمات کا خیال کہنہ مشق انیسؔ ہی رکھ سکتا ہے نہ کہ حزیںؔ۔ راقم کی اس دلیل کے ثبوت میں میر انیسؔ کے شروعاتی زمانوں کے مراثی جو انھوں نے فیض آباد میں

کہے یا اپنی لکھنؤ سکونت کے ابتدائی زمانوں میں کہے ہوں گے۔ان کے ابتدائی دور کے مراثی کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اس سلام اور غزل کا معیار وہی معلوم ہوگا جو ان کے کہنہ مشق اشعار میں ملتا ہے۔ قیاس ہوتا ہے کہ میر انیسؔ نے چودہ اشعار پر مشتمل یہ بہترین سلام اپنی عمر کی پختگی کے زمانے میں کہے ہوں گے اور قافیہ اور ردیف کی وسعتوں، فرصت اور منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر غزل کے چند اشعار بھی اسی زمین میں کہہ دیے ہوں گے جو دستیاب ہیں۔ انھوں نے پوری غزل مع مقطع کہی ہی نہ ہوگی۔ ہاں اس بات سے البتہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر خلیقؔ نے انیسؔ کو غزل گوئی چھوڑنے اور سلام و مراثی کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین کسی اور غزل کے ساتھ کی ہو گی۔ وہ غزل وہی تھی جس کا ذکر پہلے کیا چکا ہے، مشکوک لگتا ہے۔

میر انیسؔ کی باقاعدہ مرثیہ گوئی کے آغاز کے زمانے میں نیر مسعود اُن کی عمر اُنیّس برس (صفحہ ۴۴) بتاتے ہیں۔ جب انھیں ایک رئیس، مرزا سیدو نے اپنے یہاں مرثیہ خوانی کے لیے باقاعدہ ۲۰۰/روپے سالانہ پر تقرر کیا تھا۔ میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی کے آغاز کے بعد موصوف نے ان کی تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا ذکر کیا ہے۔

تحت اللفظ مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ نے ایسا انوکھا اور جاذب و جالب انداز بیان پیدا کیا کہ میر انیسؔ کے ساتھ ہی تحت اللفظ مرثیہ خوانی کو باقاعدہ ایک فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ میر خلیقؔ تک اس خاندان میں باقاعدہ داستان گوئی رائج تھی۔ میر خلیقؔ اور دوسرے داستان گویوں سے متاثر ہو کر میر انیسؔ نے بھی باقاعدہ داستان گوئی کے فن کو تحت اللفظ مرثیہ کے ساتھ جوڑ لیا ہوگا جس سے مرثیہ پڑھتے وقت داستان گویوں کی طرح 'بتانے' کے ہنر کو مرثیہ خوانی کا فن قرار دے دیا ہوگا۔ کیوں کہ صحیح طریقے سے 'بتانے' کا مطلب یہی ہے کہ سامعین کی آنکھوں کے سامنے ہر اس منظر کا نقشہ کھنچ جائے جو کچھ داستان گو یا مرثیہ خواں کہہ رہا ہو۔ اگر 'بتانے' کو صحیح طریقے سے نبھایا جائے تو وابستہ قصے اور گاڑھے لفظوں کی وضاحت بھی عام سامعین پر پوری طرح سے ہو جاتی ہے۔ میر انیسؔ اس فن پر بھی قدرت رکھتے تھے، چنانچہ مرثیہ پڑھنے کے اپنے اس خاص انداز کی وجہ سے بھی انھوں نے عوام کے دلوں پر سکہ جما لیا تھا اور اسی سبب انھیں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کے ہمعصروں میں کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔ 'بتانے' کے اس کام میں وہ زیادہ تر آنکھوں، کندھے، گردن اور وقت ضرورت ہاتھ اور پیر کے اشارے سے بھی کام لیتے تھے۔ مرثیہ خوانی کا ہنر انیسؔ کو خلیقؔ نے ہی سکھایا تھا اور مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی میں بھی وہ انیسؔ کے استاد تھے (صفحہ ۴۸)۔ ان کی مرثیہ خوانی کی خوبی کے سلسلے میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزادؔ سمیت کئی محققین فرماتے ہیں کہ ایک قدآدم آئینے کے سامنے مرثیہ پڑھنے کی مشق بہم پہنچاتے تھے (صفحہ ۴۹)۔ جب کہ بہت سے افراد اس روایت سے اتفاق نہیں رکھتے۔ میر انیسؔ کے گھر میں قدآدم آئینہ تھا ہی نہیں (صفحہ ۴۹)۔

مرثیہ خوانی میں منبر سے 'بتانے' کی ان کی منفرد خوبی اور خاص انداز بیان نے ہی انھیں اس میدان میں اتنی بلندی عطا کی کہ پورا لکھنؤ دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ہر طرف باقاعدہ دو گروہ 'انیسیے اور دبیریے' بن گئے۔ میر انیسؔ کی منفرد مرثیہ خوانی کے بارے میں پروفیسر نیر مسعود "حیات انیس" کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ "وہ شخص منبر پر پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔" انیس کی مرثیہ خوانی کا یہ حال شمس العلما مولوی

ذکاء اللہ کی زبانی ہے جو انھوں نے محمد حسین آزاد سے بیان کیا تھا (آبِ حیات)۔ ذکاء اللہ نے اشہری سے بھی اس مجلس کا ذکر کیا تھا جسے اشہری نے اس طرح نقل کیا ہے:

''جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالی شان مکان آدمیوں سے بھر چکا تھا بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے کنارے زمین پر دھوپ میں کھڑے ہوئے محوِ سماعت تھے۔ میرا مجلس کے اندر جگہ پانا ناممکن تھا اس لیے میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے اور دور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور ان کی ادائے بیان کو دیکھنے لگا۔ میں میر انیس کی فصاحت بیانی اور ان کے طرزِ بیان کی دل فریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق الفطرت اثر پیدا ہوتے مشاہدہ کیا ۔۔۔ معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے اور جب چاہتی ہے ہنساتی ہے اور جب چاہتی ہے رلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں خون اترنے سے شل ہو گئے۔ لیکن میں جب تک میر انیسؔ کی صورت دیکھتا اور ان کا مرثیہ سنتا رہا، مجھ کو یہ کوئی بات محسوس نہ ہوئی۔'' (صفحہ ۱۲۲)

''انیسیات'' کے حوالے سے دوسری روایت نقل کرتے ہوئے نیر مسعود فرماتے ہیں کہ صغیرؔ بلگرامی نے لکھا:

''میں کلام دبیرؔ کا شیدائی تھا، انیسؔ کے کمال کا قائل نہ تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً انیسؔ کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے دلی سے ان کو سننے لگا، لیکن دوسرے ہی بند کی مندرجہ ذیل بیت:

'ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں'

انھوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دینے لگے، اور میں ان کا پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا، یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھے ہوشیار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس عالم میں ہوں'' (ص ۱۲۲)۔

یہ تو تھیں میر انیسؔ کے خاص لب و لہجے کے ساتھ خواندنی کی دو جھلکیاں۔ وہ ایسے نازک مزاج اور بااصول شخصیت کے مالک بھی تھے کہ منبر پر بیٹھنے کے بعد بڑے بڑے امرا اور روسا کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھیں یہ قطعی پسند نہ تھا کہ ان کی مجلس کے درمیان کوئی مجمع کو ڈاکتا پھلانگتا منبر کے قریب تک آئے۔ ان کے مزاج کی یہ نزاکت اس وقت اور بڑھ جاتی جب وہ منبر پر تشریف فرما ہوتے (صفحہ ۱۲۳)۔ اس سلسلے میں موصوف ''نوشتۂ ادیبؔ'' کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''ان کے غصے کے وقت بڑے بڑے صاحب اقتدار لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ان کی ایک ڈانٹ نے دوشالہ اوڑھنے والوں کو پائین فرش جوتیوں کے پاس بٹھا دیا۔ وہ منبر پر پہنچ کر

اپنے جذبات غیظ کو روک نہیں سکتے تھے ۔۔۔ میر معصوم علی سوز خواں کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے ایک امیر کبیر محفلوں میں خدم و حشم اور رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ جاتے تھے۔ ایک بار انیس کی ایک مجلس کے بیچ میں وہ تشریف لائے اور منبر کے قریب جا کر بیٹھے ۔۔۔ دستور کے مطابق ان کا بھنڈی خانہ، آب دار خانہ اور دست بغچہ وغیرہ بھی آنا شروع ہوا، اس میں دیر ہوئی۔ میر صاحب خاموش مگر غصے میں بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا جناب میر صاحب، بسم اللہ، آپ مرثیہ شروع فرمائیں۔ انیسؔ نے جھلا کر جواب دیا، کیا شروع کروں، آپ کا جہیز تو آ لے'' (صفحہ ۱۲۴)۔

مجلسوں کے درمیان میر انیسؔ کا طریقہ، رعب و داب اور قدر و منزلت کچھ ایسی ہی تھی جس کے سلسلے میں پروفیسر نیر مسعود نے اور بھی بہت سے واقعات اسی کتاب میں مستند حوالوں کے ساتھ سپردِ قلم کیے ہیں۔ انیسؔ کے کلام اور خواندنی کے سلسلے میں موصوف کا کہنا ہے:

''انیسؔ کی مرثیہ خوانی میں ان کا کلام، ان کا لب و لہجہ، ان کی آواز، چہرے کے تاثرات اور اشارات، یہاں تک کہ منبر اور مکان مجلس بھی، ان کی ظاہری ہیئت میں مل جل کر ایک ہو جاتے تھے۔ جب تک وہ مرثیہ پڑھتے رہتے، سننے والے خود کو کسی دوسری دنیا میں پاتے اور انیسؔ انھیں کوئی ورائے فطرت وجود یا کم سے کم ایک عجوبہ معلوم ہوتے تھے ۔۔۔'' (صفحہ ۸۔۱۲۷)۔

''میر انیسؔ لباس اور ٹوپی کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ ان کے پاس بہت سی ٹوپیاں تھیں۔ وہ لباس کے ساتھ ٹوپی کا جائزہ لیتے ہوئے اکثر زیادہ وقت آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گزارتے تھے اور مسلسل متعدد ٹوپیاں بدل بدل کر خود کو آئینے میں دیکھا کرتے تھے'' (صفحہ ۴۹)۔

میر انیسؔ کی صغرسنی میں بھی خلیقؔ انھیں اکثر اپنے ساتھ لکھنؤ لے جایا کرتے تھے۔ خلیقؔ نے ہی انھیں ضمیرؔ اور ناسخؔ جیسے بڑے شعرا کے علاوہ اکابر شہر اور روسا سے ملوایا۔ بڑے ہونے کے بعد وہ اکثر فیض آباد سے لکھنؤ مجلسیں پڑھنے جایا کرتے تھے (صفحہ ۵۷) مگر ان کی مستقل سکونت فیض آباد میں ہی تھی۔

لکھنؤ میں میر انیسؔ کی پہلی مجلس کے سلسلے میں پروفیسر نیر مسعود اشہری کی ''حیات انیس'' کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ یہ موقع انھیں خلیقؔ نے ہی فراہم کیا (صفحہ ۶۴)۔ لکھنؤ میں میر انیسؔ کی پہلی مرثیہ خوانی کے سلسلے میں مختلف و متضاد بیانات ملتے ہیں مگر ان کی خواندنی کے آغاز کا زمانہ قریب قریب سبھی نے ۲۔۱۲۶۰ھ کے درمیان کا بتایا ہے۔ ان تمام لوگوں نے ''غالباً'' ''گویا'' جیسے لفظوں کے ساتھ اپنے بیانات درج فرمائے ہیں۔ جس وقت میر انیسؔ نے لکھنؤ میں مرثیہ خوانی کا آغاز کیا وہاں پہلے سے مرزا دبیرؔ کے قدم جمے ہوئے تھے۔ مرثیہ خوانی میں لکھنؤ اور دور دور تک دبیرؔ کا طوطی بولتا تھا۔ مرزا دبیرؔ کی صرف لکھنؤ میں مرثیہ خوانی سے ہونے والی آمدنی کا اندازہ پروفیسر محمد زماں آزردہؔ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے افضل حسین ثابتؔ کے حوالے سے اپنی کتاب ''مرزا اسلامت علی دبیرؔ'' میں نقل کیا ہے جو ذیل ہے:

''ملکہ زمانی زوجہ نصیر الدین حیدر، دوئم شاہِ اودھ، عشرۂ محرم میں دس ہزار روپیہ مرزا

صاحب (مرزا دبیرؔ) کو نذرانہ پیش کش فرماتی تھیں۔ بادشاہ کے یہاں سے جو ملتا وہ اس سے بدرجہا زیادہ تھا اور محلات اور امرا جو پیش کش کرتے تھے ان تمام نذرانوں پر خیال کیا جائے تو لاکھوں روپیہ سالانہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔'' (حیات دبیر، افضل حسین ثابت، صفحہ، ۶۵۔۶۶)

پروفیسر زماں آزردہ کے اسی بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شروعاتی زمانے میں نام و نمود کے پیش نظر مرزا دبیرؔ کے مقابلے میر انیسؔ کو لکھنؤ والے جانتے تک نہ تھے۔ یہ ان کی مرثیہ خوانی کا خاص انداز ہی تھا جس نے ان کی پہلی مجلس کے ساتھ ہی ان کے نام کو اتنی شہرت دی کہ وہ قلیل وقت میں ہی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے اور اپنی پہلی مجلس کے بعد سے ہی انھیں مرزا کا مدمقابل کہا جانے لگا۔ انیسؔ کو اپنی پہلی مجلس سے جو شہرت ملی وہ بتدریج بڑھتی گئی۔ ان کے خاص طرز بیان کے علاوہ لکھنوی عوام نے مرزا کے مقابلے ان کے کلام کی بھی زیادہ پذیرائی کی۔ عوام کے لیے ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ پرکشش تھی وہ ان کا روزمرہ کا استعمال اور سادہ، سلیس اور رواں زبان تھی۔ اشعار میں صنعتیں بھی اتنی آسان ہوتیں کہ بقول میر انیسؔ سامعین جلد سمجھ لیں جیسے، صنعت ہو وہی'۔ ان تمام خواص کے ساتھ کلام میں سہل پسندی کے امتزاج نے میر انیسؔ کو جو شہرت و عزت بخشی وہ جگ ظاہر ہے۔ ایسی شہرت کے حصول کے بعد اب میر انیسؔ کا تھوڑے تھوڑے وقفے پر فیض آباد جانا آنا ممکن نہ تھا چنانچہ انھوں نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب انھوں نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی تو امجد علی شاہ کا زمانہ تھا (صفحہ ۱۱۵)۔ اس سلسلے میں شادؔ عظیم آبادی کے حوالے سے پروفیسر نیر مسعود فرماتے ہیں:

''لکھنؤ کے لوگوں سے وعدے ہو گئے تھے کہ مع عیال اب لکھنؤ میں ہی آ کر رہوں گا۔

چنانچہ تھوڑے دن میں وطن کو خیر باد کہا اور مع عیال لکھنؤ میں چلے آئے'' صفحہ، ۱۰۹

میر انیسؔ کی راٹھ حویلی، فیض آباد سے لکھنؤ منتقلی کے سلسلے میں بھی پروفیسر نیر مسعود نے شبہ ظاہر کیا ہے۔ کہیں ان کی منتقلی کا یہ زمانہ ۱۲۶۰ھ درج ہے تو کہیں ۱۲۶۲ھ۔ ان اشتباہات کی دو اہم وجہیں یہ ہیں۔ میر انیسؔ کی لکھنؤ منتقلی کسی مخصوص تاریخ کو نہ ہو کر بتدریج ہوئی۔ ان کا لکھنؤ اور فیض آباد آنے جانے کا سلسلہ عرصے تک برقرار رہا اور انھوں نے لکھنؤ کی مستقل سکونت اختیار کر لینے کے کافی عرصہ بعد تک خود کو ثم لکھنوی کہتے رہے تھے (صفحہ ۱۰۹)۔ پروفیسر نیر مسعود اپنی اسی کتاب میں رقمطراز ہیں:

''لکھنؤ میں میر انیس کی کل چھ قیام گاہیں تھیں۔ مختصراً (۱) شیدیوں کا احاطہ (۲) سٹھہٹی (۳) نخاس (۴) منصور نگر (۵) پنجابی ٹولہ (بیگم گنج، راجا بازار) اور (۶) چوبداری محلہ (محلہ آئینہ سازاں، سبزی منڈی، چوک)''۔ صفحہ ۱۱۴۔۱۱۰

ان سکونتوں کی تبدیلی کے سلسلے میں نیر مسعود نے جو وجوہات بیان کی ہیں مختصراً اس کا ماحصل یہ ہے کہ انتزاع سلطنت کی وجہ سے انھیں کئی مرتبہ اپنی سکونتیں تبدیل کرنی پڑیں۔ (بحوالہ حسن) جب انیسؔ لکھنؤ گئے تو ان کا مکان محلہ سٹھہٹی یا شیدیوں کے احاطے میں تھا'' (صفحہ ۱۱۰)۔ ۱۲۶۷ھ میں وہ نخاس یعنی اس محلے میں رہتے تھے (صفحہ ۱۱۳)۔ شاہی کے خاتمے کے بعد لکھنؤ میں جنگ کا ماحول پیدا ہوا تو انیس سٹھہٹی کی سکونت ترک کر کے

منصور نگر میں اپنے ایک شاگرد مرزا محمد عباس کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ انگریزوں کی فتح کے بعد لکھنؤ کا تخلیہ شروع ہوا تو کچھ عرصہ کے لیے کاکوری کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے واپس آ کر پھر مرزا عباس کے یہاں منصور نگر میں مقیم ہوئے۔ آشوب ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں حالات معتدل ہوئے تو انیس نے اس علاقے میں مکان لیا۔ چھٹویں سکونت میر انیسؔ کی آخری قیام گاہ تھی۔ یہیں ان کی وفات اور اسی علاقے میں تدفین ہوئی۔ (صفحہ ۱۱۴)

لکھنؤ میں میر انیسؔ کی متعدد قیام گاہوں کا ذکر کرنے کے بعد نیر مسعود نے ان کی شخصیت، پسند ناپسند وغیرہ کا ذکر بھی نہایت حسن و خوبی سے کیا ہے۔ میر انیسؔ کی شخصیت کے عنوان کے تحت موصوف نے ان کی آواز، طرز گفتگو، بولے ہوئے فقرے (۱۲ فقرے)، ان کی صحبتیں، شعر و شاعری، پڑھے ہوئے شعر، شعروں کی اثر پذیری، شاعری پر تبصرہ، حسِ مزاح، (انیسؔ کے لطیفوں اور بذلہ سنجیوں)، ملاقات کے مقررہ اوقات، دوست داری، معمولات، دلچسپیاں اور مشغلے کے تحت کتابیں اور مطالعہ، پتنگ اڑانا، کبوتر کا شوق، (لڑانے کا نہیں بلکہ پالنے کا) (صفحہ ۱۵۹)، بلی، چھڑیوں کا شوق، موسیقی، سوز خوانی، حقہ، (مجلس پڑھنے کے بعد حقے کی طلب بڑھ جاتی تھی) (صفحہ ۱۶۱)، گوشت، غسل تفریح، مذہبیت (میر انیسؔ کا آبائی اور خاندانی مذہب شیعہ تھا۔۔۔ انیس مذہبی، روزہ، نماز وغیرہ کے پابند تھے) (۱۶۳)، انیس گھر میں، انیس کے ملازمین (میر اکبر علی، بدبدی بیگم، خدابخش، مرزا راحت علی، سید علی حسین، غلام عباس، کسیا مالی، شیخ نجف علی، حاجی نور محمد)۔ ۲۹/عناوین کا احاطہ کرنے کے ساتھ موصوف نے تمام خاص لمحات نہایت خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔ اس ذکر کے ساتھ کتاب کا چوتھا باب اختتام پذیر ہوتا ہے۔

پانچویں باب میں ''عہد واجد علی شاہ میں میر انیسؔ کا ذکر'' بھی مصنف نے مرزا دبیرؔ کی شہرتوں سے شروع کیا ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں: ''اس زمانے میں میاں فصیحؔ و میاں دبیرؔ و میاں ضمیرؔ کے سے شعرائے لکھنؤ نے مرثیے کی فصاحت کو عرش اعظم تک پہنچا دیا تھا'' (صفحہ ۱۷۷)۔ اس ضمنی ذکر کے بعد ''بادشاہ محل عالم اور انیسؔ'' کے عنوان کو قلمبند کرتے ہوئے عالم آرا بیگم واجد علی شاہ کی پہلی بیگم جسے انھوں نے نصیر الدین حیدر کے جلسے والیوں میں سے ایک (موتی خانم) کے پسند آ جانے کے باعث بھلا دیا تھا۔ واجد علی شاہ کی اس حرکت سے ان کے والد امجد علی شاہ نے سخت ناراضی ظاہر کی اور اپنی بہو عالم آرا کی طرفداری کی۔ میر انیسؔ کے ایک بند کے حوالے میں موصوف فرماتے ہیں کہ ان میں مرثیہ کے مطلع والے بند میں ''شہنشاہ معظم'' سے بادشاہ وقت امجد علی شاہ مراد ہے (ص ۱۸۱)۔۔۔ عالم کا لفظ عالم آرا بیگم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس سے یہ امکان سامنے آتا ہے کہ انیسؔ ان کی سرکار سے وظیفہ وغیرہ پاتے تھے (ص ۱۸۲)۔ مگر میر انیسؔ کو امجد علی شاہ یا واجد علی شاہ کی سرکار سے کسی وظیفے کے ملنے کا کوئی دستاویزی یا حتمی ثبوت انھوں نے فراہم نہیں کیا ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر کوکب کے حوالے سے لکھا ہے کہ (اس بند کے تیسرے مصرعے)۔۔۔ انیسؔ نے ''حامی دیں'' اور ''قبلہ عالم'' کی مانوس اور مستعمل تراکیب کو چھوڑ کر ''قبلہ دیں'' اور ''حامئ عالم'' کہا ہے جو اسی قضیے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے'' (ص ۱۸۲)۔ اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ میر انیسؔ کو امجد علی شاہ کی طرف سے انعام و اکرام تو کبھی

کبھار ملتا رہا ہو مگر وہاں سے کسی مستقل وظیفے کی سند نہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ جس وقت میر انیسؔ نے لکھنؤ میں اپنی خواندنی شروع کی اس زمانے میں مرزا دبیرؔ سدرۃ المنتہٰی پر تھے اور ملکہ زمانی اور دربار سے انھیں لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی تھی۔ امجد علی شاہ اور خود واجد علی شاہ بھی مرزا دبیرؔ کے ہی معتقد تھے۔ نواب واجد علی شاہ اخترؔ کا ایک شعر:

میں کمسنی سے عاشق نظم دبیرؔ ہوں
واللہ لطف شعر میں اس کے اسیر ہوں

یہی شعر کہیں کہیں اس طرح بھی ملتا ہے:

بچپن سے ان کے دام سخن کا اسیر ہوں
میں کمسنی سے عاشق نظم دبیرؔ ہوں

اس شعر کے علاوہ مرزا دبیرؔ کی خواندنی اور واجد علی شاہ کی وہاں موجودگی سے متعلق ایک اور واقعہ:

۔۔۔ایک روز جب مرزا دبیرؔ، واجد علی شاہ کے یہاں مجلس پڑھ رہے تھے، ہَوا کے ایک تیز جھونکے کے سبب منبر کے اوپر تنا ہوا شامیانہ منتشر ہو گیا اور سورج کی سیدھی کرنیں مرزا دبیرؔ کے چہرے پر پڑنے لگیں۔ یہ دیکھ کر واجد علی شاہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنی چھتری طلب کی۔ اختتام مرثیہ تک خود ہاتھ میں چھتری لیے مرزا دبیرؔ کے چہرے اور جسم کو آفتاب کی تمازت سے بچاتے رہے۔ یہ واقعہ واجد علی شاہ کے دفتر میں کچھ اس طرح درج ہے:

''روزی در مجلس بالای منبر، بہ حضور اعلیٰ حضرت بخواند مرثیہ، اتفاق افتاد۔ یکسو شد و عکس آفتاب بہ روی آن جناب اوفتادہ۔ فی الفور ظل اللہ چتر خود طلبیدہ و چوبش بہ دست خود گرفتہ، قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند۔'' (شمس الضحیٰ، مولوی صفدر حسن، صفحہ ۱۶۶)۔

واجد علی شاہ کے درج بالا ایک شعر اور پھر اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دربار میں مرزا دبیرؔ کی کیا قدر و منزلت رہی ہوگی۔ اس کے بعد مزید تبصرہ کرتے ہوئے موصوف ان کے حالات بیان کرتے ہوئے میر انیسؔ کی ایک مجلس میں نجات حسین عظیم آبادی کی شرکت (ص ۱۸۲) کا ذکر کرنے کے بعد میر خلیقؔ کے آخری زمانے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ آزادؔ (آب حیات صفحہ ۱۷۔۳۷۰) کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ خلیقؔ کی وفات ۸/جمادی الاول ۱۲۶۰ھ مطابق ۲۶/مئی ۱۸۴۴ء کو ہوئی (صفحہ ۱۸۸)۔ خلیقؔ کی تدفین میر انیسؔ کے مکان شیدیوں کے احاطے سٹھٹی سے متصل ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی (صفحہ ۱۸۹۔۱۸۸)۔

میر انیسؔ کی آئندہ زندگی کا تذکرہ پروفیسر نیر مسعود 'انیس: خلیقؔ کے بعد' کے عنوان سے کرتے ہیں۔ چند مجلسیں پڑھنے کے بعد ہی انیسؔ کا چرچہ لکھنؤ اور قرب و جوار میں اس شدت سے ہونے لگا کہ وہ چند مجلسوں میں خواندنی کے بعد ہی پورے شد و مد کے ساتھ مرزا دبیرؔ کے سب سے بڑے مد مقابل تصور کیے جانے لگے اور خواندنی کے آغاز سے ہی لکھنؤ انیسیوں اور دبیریوں کے دو گروہوں میں منقسم ہو گیا۔ ''معرکۂ انیسؔ و دبیرؔ کے آغاز'' کے عنوان سے نیر مسعود، شادؔ کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ایک بڑی مجلس (۱) میں سارے اعیان و شرفائے شہر کا جم غفیر جمع تھا اور بعض با اختیار خواجہ سرا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خواجہ سرا (۲) مرزا دبیرؔ مغفور کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے، وہ بھی موجود تھے کہ کسی شخص (۳) نے جوش میں آ کر میر انیسؔ کی تعریف میں یہ کلمہ پکار کر کہہ دیا کہ اس کلام (۴) کے آگے مرثیہ کہنا بے حیائی ہے۔ مرثیہ گویوں کو اگر شرم ہے تو چاہیے کہ اپنے مرثیے دریا میں ڈال دیں۔ یہ کلمہ خصوصاً اس خواجہ سرا کو تیر کی طرح لگ گیا۔ پیچ و تاب کھایا کیا، جب مجلس ختم ہوئی تو خواجہ سرا نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور سخت زبانی کے ساتھ رد و بدل ہونے لگی۔ کچھ لوگ جنبہ کش خواجہ سرا کے اور کچھ طرف دار اس شخص کے ہوئے۔ تا دیر یہی رد و بدل رہی۔ صاحب خانہ (۵) نے دونوں کو بہ مشکل اس تکرار سے روکا۔ اُسی وقت سے اس مخاصمت (معرکہ انیسؔ و دبیرؔ) کی جڑ قائم ہوئی'' (صفحہ ۱۹۸)

مخاصمت کے سلسلے میں درج بالا بیان چند خاص وجوہات سے الحاقی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ واقعہ بہت اہم تھا۔ اس واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ہر قاری یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ '۔۔۔ایک بڑی مجلس میں۔۔۔ایک خواجہ سرا۔۔۔کسی شخص نے۔۔۔اِس کلام۔۔۔'' کہہ کر اشاروں میں ہی تمام واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ معرکے کے ضمن میں یہ سب سے اہم واقعہ ہے، جیسا کہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ''۔۔۔اسی وقت سے اس مخاصمت (معرکہ انیسؔ و دبیرؔ) کی جڑ قائم ہوئی۔'' اس واقعے میں پانچ اہم ترین باتوں کا ذکر ہے۔ ان پانچوں کی وضاحت ناگزیر ہے۔ نمبر (۱) 'ایک بڑی مجلس میں' کا ذکر ہے مگر اس بڑی مجلس کا کوئی حوالہ موجود نہیں کہ مذکورہ مجلس کس تاریخ کو اور کس امام باڑے یا کس مقام پر منعقد کی گئی تھی۔ (۲) 'ایک خواجہ سرا' جو کہ مرزا دبیرؔ کے معتقد تھے، جنھیں بات اتنی ناگوار گزری تھی کہ بعد ختم مجلس انھوں نے 'اس شخص' کا ہاتھ پکڑ لیا اور تا دیر رد و بدل جاری رہی۔ (۳) کسی شخص کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہ وہ شخص تھا جو ہزاروں کے مجمعے (میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی خواندنی میں ہزاروں سامعین کا جمع ہونا عام بات تھی) میں علی الاعلان اتنی بڑی بات کہنے کا جگرا رکھتا تھا، وہ کوئی معمولی آدمی ہرگز نہ رہا ہوگا۔ وہ پڑھا لکھا اور اکابر شہر میں سے ہی کوئی ایک رہا ہوگا جو دبیرؔ سمیت لکھنؤ کے تمام مرثیہ گویوں کی شان میں اتنا بڑا جملہ کہنے کی ہمت رکھتا تھا۔ اس شخص کے ساتھ اس مجلس میں اس کے طرف دار بھی موجود تھے۔ گو کہ وہ کوئی معمولی اور عام آدمی نہیں تھا، پھر بھی اس شخص کا نام اور تعارف اس اہم واقعے سے ندارد ہے، جو اس واقعے کی صداقت کے لیے نہایت ضروری تھا کیونکہ کوئی با اختیار خواجہ سرا کسی 'ایرے غیرے کی پھبتیوں اور جملہ کشی پر اتنی توجہ ہرگز نہیں دے گا جو اتنا بے وقعت ہو کہ تذکرہ نویس اس کے نام تک سے واقف نہ ہو۔ (۴) 'اس کلام' کا ذکر تو کیا گیا ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کون سا مرثیہ تھا جسے میر انیسؔ نے اس روز پڑھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی عمدہ اور مشہور زمانہ مرثیہ رہا ہوگا جس کی تعریف میں 'ایک شخص' نے اتنا بڑا جملہ کہہ دیا کہ ''۔۔۔اس کلام کے آگے مرثیہ کہنا بے حیائی ہے۔ مرثیہ گویوں کو اگر شرم ہے تو چاہیے کہ اپنے مرثیے دریا میں ڈال دیں۔'' جب یہ کلام اتنا بلند پایہ اور بلند مرتبہ تھا تو اس کے شروع کا بند یا کم از کم پہلے مصرعے کا ذکر اس واقعے کی

صداقت کے لیے بھی ناگزیر تھا۔ (۵) 'صاحب خانہ' سے مراد یہ ہے کہ یہ مجلس کسی امام باڑے میں منعقد نہیں کی گئی تھی بلکہ کسی شخص کے گھر پر ہی اس مجلس کا انعقاد ہوا تھا۔ میر انیسؔ سے اپنے گھر پر مجلس پڑھوالینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ 'صاحب خانہ' کوئی عام آدمی نہ رہا ہوگا۔ کوئی بڑا شاعر، ادیب یا رئیس شہر بلکہ اکابر شہر میں سے ہی رہا ہوگا، جس کی مداخلت اور کوششوں سے ہی اس قضیے میں مصالحت ممکن ہوسکی۔ خواجہ سرا اور اس شخص نے بھی صاحب خانہ کی باتوں کا احترام کیا۔ پھر ایسے شخص کا نام جاننے کا اشتیاق بھلا قارئین کو کیوں نہ ہوگا۔ ہاں اس مجلس کے انعقاد کے زمانے کے تعلق سے پروفیسر نیر مسعود نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ ''اس بیان میں زمانے کا تعین نہیں ہے، لیکن نجات حسین عظیم آبادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امجد علی شاہ کے عہد میں انیسؔ و دبیرؔ کے تقابل اور ایک پر دوسرے کی ترجیح کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہاں یہ بھی غور طلب ہے کہ اودھ کے آخری تاجدار، واجد علی شاہ ۲۶ر صفر المظفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ر فروری ۱۸۴۷ء کو تخت نشین ہوئے (صفحہ ۲۰۶)۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی خاص دن خاص واقعے کے بعد یہ معرکہ چھڑا ہو، البتہ اس معرکہ میں شدت واجد علی شاہ کے زمانے میں اور سنگینی انتزاعِ سلطنت کے بعد پیدا ہوئی (ص ۱۹۸)۔

معرکہ کے ذکر کے بعد ارسطو جاہ کی مجلس، علمائے لکھنؤ سے مراسم، مفتی میر محمد عباس اور انیسؔ (مفتی میر محمد عباس کا شمار لکھنؤ کے مذہبی، علمی، ادبی تینوں حیثیتوں سے اکابر کی پہلی صف میں ہوتا تھا)، بیٹی کا عقد ہمراہ صابرؔ، انیسؔ کے داماد صابرؔ، جیسے عناوین چند چھوٹے موٹے واقعات کے ساتھ قلمبند کرنے کے بعد خواجہ آتشؔ کی وفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ موصوف نے خواجہ حیدر علی آتشؔ کی وفات کی تاریخ کے علاوہ وفات سے متعلق دوسری اہم باتوں کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ ہاں 'آب حیات' کے حوالے سے آتشؔ کی نماز والا لطیفہ ضرور نقل کیا ہے، مگر یہاں بھی آتشؔ کے اس اہل سنت شاگرد کا نام نہیں بتایا جس نے انھیں سنیوں والی نماز سکھائی تھی۔

زیر بحث کتاب کے چھٹے باب میں نیر مسعود نے نواب واجد علی شاہ کے عہد کے ذکر کے ساتھ دونوں سرفہرست مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس باب میں موصوف نے چند اہم معلومات فراہم کرائی ہیں۔ اس باب میں شاہی خاندان کی منظوم تاریخ، انیسؔ کا مشاہدہ، انیسؔ اور نواب علی نقی خاں، انیسؔ اور دیانت الدولہ، بحر اور انیسؔ، ولادت رشیدؔ اور مانوسؔ، نخاس کی سکونت (اس عنوان کے تحت موصوف نے ایک اہم جانکاری یہ دی ہے کہ میر انیسؔ ۱۲۶۷ھ میں اپنا شیدیوں کے احاطے والا مکان چھوڑ کر نخاس والے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں سن کی دلیل کے ساتھ موصوف یہ فرماتے ہیں کہ ''کوفے میں جب حرم حضرت شبیرؑ آئے'' والے مرثیہ کے سرورق پر ۱۲۶۷ھ اور ساکن شہر لکھنؤ، مکان نخاس بازار صفحہ ۲۱۶ تحریر ہے)، مفتی صاحب (مفتی میر عباس)، تجدید مراسم، سٹھٹی میں سکونت، شاہی مجلس: انیسؔ و دبیرؔ کی یک جاخواندگی؟ اس عنوان کا آغاز ہی سوالیہ نشان (؟) سے کیا گیا ہے۔ گوکہ عنوان سے ہی تذبذب کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ موصوف خود ہی فرماتے ہیں کہ ''۔۔۔ہم تک اس کی اتنی مختلف روایتیں، وہ بھی تردیدوں کے ساتھ، پہنچی ہیں کہ اصل صورت واقعہ کا یقین کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے۔۔۔'' (ص ۲۳۳)۔ اس کے بعد وہ تمام حوالے نقل کیے جن

سے کبھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حضرات نے یک جاخواندگی کی اور کبھی یہ کہ نہیں کی۔ اس معاملے پر شروع سے آخر تک تذبذب قائم رہتا ہے۔ قارئین کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکے کہ واقعہ سچ ہے یا نہیں۔ مقیم الدولہ کی معتوبی کی روایت؟، ضمیرؔ کی مجلس سویم، انیسؔ کی ایک مجلس کا مرقع، کے تفصیلی ذکر پر اس باب کا اختتام ہوتا ہے۔

متذکرہ کتاب کے ساتویں باب کا آغاز 'انتزاعِ سلطنتِ آشوب ۱۸۵۷ء' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ موصوف نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے لکھنؤ پر چھ اہم اثرات بتائے ہیں۔ اس کا اثر ہر کس و ناکس پر پڑا۔ پھلتے پھولتے لکھنؤ کی بربادی کے ساتھ موصوف نے جن اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) ''۲۹ر جمادی الاول ۱۲۷۲ھ (۷ر فروری ۱۸۵۶ء) کو انگریزوں نے واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ پر اپنے قبضے کا اشتہار جاری کر دیا۔۔۔ خود اپنا مقدمہ برطانوی پارلیامنٹ میں پیش کرنے کے لیے لندن جانے کے ارادے سے ۵ر رجب المرجب ۱۲۷۲ھ (۱۲ر مارچ ۱۸۵۶ء) کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے جہاں پھر انھیں آنا نصیب نہیں ہوا۔۔۔'' (ص ۲۵۲۔۲۵۱)

(۲) ''کلکتے پہنچ کر بادشاہ کو وہیں مقیم ہوجانا پڑا اور ان کی بقیہ زندگی اسی شہر میں گزری۔۔۔'' (ص ۲۵۲)۔

(۳) لکھنو میں انگریزوں نے اپنا بندوبست شروع کر دیا اور اودھ پر قبضہ کرنے میں ان کو مزاحمت (ص ۲۵۳) کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن فضا میں اندر اندر ایک بے چینی سی تھی جسے وہ خود بھی محسوس کر رہے تھے۔

(۴) ''۔۔۔عوام نے حکومت کی تبدیلی قبول نہیں کی ہے۔۔۔ اس طرح انگریزی حکومت کا یہ پہلا محرم بے رونق گزرا۔'' غم ہمیں اپنی تباہی کا نہیں اے مومن، ہے یہ صدمہ کہ عزاداری شبیر گئی۔ (صفحہ ۴۔۲۵۳)

(۵) اودھ کی معیشت پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور اس خوش حال صوبے کی دولت اب لندن پہنچ رہی تھی۔۔۔'' (صفحہ ۲۵۵)۔

(۶) ''اب انگریز اور ہندوستانی فوجوں میں کھل کر تصادم شروع ہو گیا۔۔۔ ہندوستانیوں نے موقع پا کر انگریزوں کو قتل کیا۔ انگریزوں نے بھی بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو پھانسیاں دیں'' (صفحہ ۲۵۶)۔

(۷) ''۔۔۔واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی سرداری میں ان کے کم سن بیٹے برجیس قدر (۱۲ر ذیقعد ۱۲۷۳ھ/ ۵ر مئی ۱۸۵۷ء) بادشاہ بنا دیے گئے۔ شہر میں لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے (صفحہ ۲۵۷)۔

(۸) ۳/ صفر ۱۲۷۴ھ (۲۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء) کو ایک بڑی انگریزی فوج لکھنؤ میں داخل ہوگئی اور اب وہ خوں ریز جنگ شروع ہوگئی جو لکھنؤ نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔۔۔'' (صفحہ ۲۵۸)۔

(۹)''آخر ۴؍شعبان ۱۲۷۴ھ (۲۱؍مارچ ۱۸۵۸ء) کو لکھنؤ میں امن کی منادی ہوئی۔ رعایا کا قتل عام موقوف ہوا اور اعلان کیا گیا کہ شہر سے بھاگے ہوئے لوگ ۹؍اپریل تک اپنے گھروں میں واپس آجائیں۔ جو نہ آئے گا اس کا گھر ضبط ہو کر نیلام ہو جائے گا'' (صفحہ ۲۔۲۶۱)۔

(۱۰)''ایکا ایک شہر کھدنے لگا۔۔۔'' (۲۶۲)

ان تاریخی حقائق کے بعد 'آشوب اور انیسؔ' کے عنوان سے موصوف مختلف حوالوں کے ساتھ جو کچھ لکھتے ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی بربادی کا میر انیسؔ اور ان کی شاعری پر کتنا گہرا اثر پڑا تھا۔ ایک انگریز کمانڈر کی آمد کی اطلاع سن کر انیسؔ نے یہ بیت پڑھی:

لاکھوں ہیں، کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب عمر سعد آئے گا

انتزاع سلطنت کے بعد لکھنؤ کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد انیسؔ بھی جس طرح دربدر ہوئے اس کا خلاصہ:

'منصور نگر میں قیام': ''یہ وہ زمانہ تھا جب سٹھی (انیسؔ کی قیام گاہ) کے آس پاس کا علاقہ محاذِ جنگ بنا ہوا تھا۔ اس علاقے کے زیادہ تر شہری وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ ان شہریوں میں میر انیسؔ بھی تھے۔۔۔ آشوب غدر کے بعد میر صاحب نے چند روز محلہ منصور نگر میں بھی قیام کیا تھا'' (صفحہ ۲۶۶)۔ اس دربدری کے عالم میں میر انیسؔ نے کبھی کاکوری کا رخ کیا تو کبھی سٹھی والے مکان میں مقیم ہوئے تو کبھی چوبداری محلے والے مکان میں رہے۔ اس کے بعد راجہ بازار اور پھر پنجابی ٹولہ میں بھی رہے'' (صفحہ ۲۶۶)۔

'انیسؔ کی عمارتوں کا انہدام اور زمین کی ضبطی': اس عنوان کے تحت موصوف بیان فرماتے ہیں:

''۔۔۔انگریزوں نے اس علاقے کی بہت سی عمارتیں گرادی تھیں جہاں انیسؔ کا مسکن تھا۔۔۔ ان میں امیر مینائی کا مکان بھی تھا۔۔۔ انیسؔ کا امام باڑہ اور مکان بھی سٹھی میں تھے اور انھیں بھی منہدم کر دیا گیا۔۔۔ کاکوری سے واپس آکر انیسؔ کا سٹھی کے بجائے پھر منصور نگر میں قیام کرنا بتاتا ہے کہ ان کی عمارتیں انگریزوں کی فتح سے پہلے ہی منہدم کی جاچکی تھیں (صفحہ ۲۶۸)۔

'سلیسؔ فرزند انیسؔ کا قید ہونا': یہ عنوان تین صفحات پر مشتمل ہے۔ سلیسؔ کی گرفتاری پھر ان کے لیے انیسؔ کی مناجات۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ انیسؔ کے بیٹوں میں سلیسؔ چونکہ سب سے چھوٹے تھے اس لیے کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ ان کا یہ بگڑنا گھر والوں کے لیے رہا ہوگا اس کا انگریزی حکومت سے کیا سروکار۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ بھی انقلابی ہندوستانیوں میں شریک رہے ہوں گے۔ اس سلسلے میں نیر مسعود کا یہ جملہ قابل غور ہے''۔۔۔ سلیسؔ پر جس جرم کے ارتکاب، مثلاً انگریزوں کے خلاف کسی کارروائی کا الزام تھا اس میں وہ ذاتی طور پر اور براہ راست شریک نہیں تھے لیکن جرم کے مرتکب فریق یا واردات سے یکسر بے تعلق بھی نہیں تھے اور یہی ان کا قصور تھا۔ اسی اندیشے کے تحت وہ لکھنؤ سے باہر تھے اور وہیں کہیں قید کر لیے گئے۔ اس دارو گیر میں

ماخوذ ملزم سلیسؔ کے باپ کی حیثیت سے انیسؔ کو اپنی املاک کے باب میں خاموش رہنا ہی تھا'' (صفحہ ۲۷۱)۔

'بیٹی کی وفات': اس عنوان کے تحت مصنف فرماتے ہیں کہ لکھنؤ چھوڑنے سے انیسؔ کی بیٹی عباسی بیگم نے اپنا مال و دولت گھر کے صحن میں دفن کر دیا تھا۔ واپسی پر انھیں کچھ نہ ملا۔ چھپایا ہوا مال ڈھونڈ نکالنے والوں نے سب نکال لیا تھا۔ وہ اس غم کی تاب نہ لاسکیں اور خفقان میں مبتلا ہو گئیں جس کے سبب ان کے پیٹ میں پھوڑا بن گیا جو ان کی موت کا سبب بنا۔

'محمد حسین آزادؔ اور انیسؔ کی ملاقات': اس عنوان سے موصوف نے کئی اہم معلومات فراہم کرائی ہیں۔ نیر مسعود، ملاقات کا وقفہ ۵۸۔۱۸۵۷ء بتاتے ہیں۔ جا بجا آزادؔ سے انیسؔ کی ملاقات کا حوالہ ''آب حیات'' سے دیا گیا ہے، جو مستند ہے۔ اسی عنوان کے تحت انھوں نے میر انیسؔ کی کئی رباعیاں اور ایسے اشعار نقل فرمائے ہیں جن میں اجڑے ہوئے لکھنؤ اور انگریزوں کی بربریت کی داستان صاف نظر آتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی غدر میں انگریزوں کی اتنی بڑی کامیابی کا راز محض ان کی فوجی طاقت نہ تھی۔ اس سے زیادہ بلکہ ہندوستانیوں کی ناکامی یا انگریزوں کی کامیابی کی اصل وجہ وہ لاتعداد بے ایمان، ضمیر فروش، لالچی اور بزدل ہندوستانی بھی انگریزوں کے خوف، ظلم، لالچ اور ڈر سے ان کے ہم رکاب بن بیٹھے تھے۔ ایسے غداروں کے تئیں عام ہندوستانیوں کی نفرت جگ ظاہر ہے۔ میر انیسؔ بھی ایسے ہندوستانیوں سے کس درجہ متنفر تھے، اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں نیر مسعود، واقعات انیس (صفحہ ۸۴) کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ایک روز میر انیسؔ (احسنؔ کے) غریب خانے پر تشریف رکھتے تھے کہ ایک رئیس کی گاڑی سامنے سے گذری۔ رئیس نے کوچوان سے اشارہ کیا کہ گاڑی آہستہ آہستہ لے چلو تاکہ میر صاحب متوجہ ہوں تو سلام کر دیں۔ میر صاحب نے فوراً ارادہ سمجھ لیا اور اس جانب سے منہ پھیر کر کسی اور شخص سے گفتگو کرنے لگے، مگر کن انکھیوں سے دیکھے جاتے تھے اور والدِ مرحوم سے پوچھتے جاتے تھے کہ میر حسن علی کی گاڑی نکل گئی؟ جب والد نے عرض کیا کہ حضور، ہاں، تو فرمایا، لاحول ولاقوۃ، کیا میں پریشان ہوا ہوں۔ والدِ مرحوم نے کہا کہ حضور، وہ منتظر تھے کہ سلام کر لیں۔ کیا مضائقہ تھا جو آپ اس طرف توجہ فرماتے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اِس شخص کی صورت سے مجھے نفرت ہے۔ اس نے سلطنت سے بے ایمانی کی ہے اور ہزاروں بے گناہوں کی گردن پر چھری پھیری ہے۔ میں کیا ہوں رحمتِ خدا نے بھی ایسے لوگوں کی جانب سے منہ پھیر لیا ہے۔'' (صفحہ ۷۷۔۷۸)

'انتزاع کے بعد انیسؔ کے قدرداں اور احباب': انتزاع سلطنت اور لکھنؤ کی ویرانی و بربادی کے بعد جب اس کی رونق بتدریج واپس آنے لگی، اس زمانے میں بھی میر انیسؔ کا گزر بسر انھیں رؤسائے لکھنؤ کی داد و دہش پر تھا مگر انتزاع سلطنت کے بعد انیسؔ کے قدردانوں کی تعداد گھٹ گئی تھی جس کا اثر انیسؔ کے معاشی حالات پر بھی پڑا۔ انیسؔ، کسمپرسی کے عالم سے گزر رہے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد لکھنؤ کے حالات سدھرنے

کے ساتھ رفتہ رفتہ ان کے قدردانوں کی تعداد بھی بڑھی اور ان کی معاشی حالت قدرے بہتر ہونے لگی (صفحہ ۷۹۔۱۷۸)۔ حالات کی بہتری کے بعد موصوف نے جن عناوین پر مختصر بحث کی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

آغا علی خاں ناظم عرف آغائی صاحب، امجد علی خاں، نواب حامد علی میر، زکی علی خاں، سید علی دلھی پوری حکیم، (اس عنوان کے تحت موصوف نے میر انیسؔ کی بنارس اور دولھی پور آمد اور خوانندگی کا ذکر بھی دوسرے عناوین کی مانند ہی دلچسپ اور معلوماتی انداز سے کیا ہے۔) دولھی پور (بنارس کے نزدیک) کے رئیس حکیم میر سید علی اور ان کے بھائی سید صادق، میر انیسؔ کے بڑے مداحوں اور قدردانوں میں تھے۔ ان حضرات کو میر انیسؔ کے پورے خانوادہ سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ ان تمام روایات اور تذکروں کے ذریعہ موصوف نے چشم دیدوں اور انیسؔ کے خطوط کو بنیاد بنایا ہے جو واقعات انیسؔ کا اہم حصہ ہیں۔ عالی جاہ، والا جاہ، نواب میر محمد حسین خاں، مرزا محمد عباس، محمد محسن ذوالقدر انیس کے شیدائی تھے۔ سید محمد محسن ذوالقدر جونپور کے اکابر اور انیسؔ کے شیدائی تھے۔ میر انیسؔ کے متعدد کلام انھیں حفظ تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی کم وبیش ویسا ہی تھا جیسا [مختلف تذکروں کے مطابق] میر انیسؔ کا تھا۔ وہ خود مرثیے کہتے اور پڑھتے تھے۔ (راقم السطور نے محسنؔ صاحب جونپوری کو سب سے پہلے بنارس کے حکیم کاظم صاحب مرحوم کے امام باڑہ، واقع محلہ دالمنڈی پر اس وقت دیکھا اور سنا تھا جب میری عمر کوئی دس برس کی رہی ہوگی۔ حکیم صاحب کے یہاں ہر برس ماہ ربیع الاول کے پہلے سنیچر کو ایک شب بیداری بڑے پیمانے پر منعقد کی جاتی ہے، جس میں ہندوستان بھر کے بڑے علما مدعو ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں منعقد شدہ اسی شب بیداری میں راقم بھی موجود تھا جب محسنؔ صاحب جونپوری نے وہاں مرثیہ پڑھا تھا، اس وقت میری عمر کوئی دس برس رہی ہوگی۔ مجھ میں نہ تو اشعار کی گہرائی اور گیرائی سے متاثر ہونے کی سمجھ تھی نہ ہی خوانندگی کے نکات سے واقفیت، پھر بھی موصوف کی خوانندگی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی تو معلوم ہوا کہ نواب محسن ذوالقدر صاحب ہر سال ۱۷ر صفر المظفر کو صبح ۸ ربجے جونپور میں اپنی حویلی پر ایک طولانی مرثیہ ضرور پڑھتے ہیں۔ میں موصوف کی خوانندگی سے اس قدر متاثر تھا کہ ہر برس معینہ تاریخ اور وقت پر، بنارس سے جونپور پہنچ جاتا تھا۔ موصوف کی حویلی جونپور کے محلہ دریبہ (ملحق پرانی بازار) میں آج بھی خستہ اور بوسیدہ حال میں موجود ہے۔ ۱۷ر صفر کو محسن صاحب جونپوری کی خوانندگی میں جونپور اور قرب وجوار کے بیشتر علما، شعرا اور اکابر شہر بھی موجود رہا کرتے تھے۔ وہاں موجود بڑے مجمع میں راقم نے جن شعرا اور اکابر کو دیکھا ہے، ان میں حضرت وامقؔ جونپوری، حضرت ہوشؔ جونپوری، شاعرؔ جمالی، شعلہؔ جونپوری، سلامؔ مچھلی شہری، احمد نثارؔ جونپوری، نسیمؔ واسطی، فضاؔ جونپوری وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ موصوف کی خوانندگی کا اندازہ یہ تھا کہ ان کے امام باڑے سے لے کر دالان، صحن اور آنگن تک کم از کم تین ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ذرا سی بھی تاخیر سے پہنچنے والوں کو اکثر جوتیوں کے پاس ہی جگہ ملتی یا ایسے لوگ عام طور پر دیوار سے لگ کر کھڑے نظر آتے۔ ایک مرتبہ راقم السطور کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ بات ۱۹۸۰ء کی ہے۔ میں گھر سے نکلا تو صحیح وقت پر مگر بنارس سے جونپور جانے والی جس بس میں بیٹھا تھا وہ راہ میں

خراب ہوگئی جس کے سبب مجھے بس تبدیل کرنا پڑی اور بجائے صبح ۸ ربجے کے میں مجلس میں آدھ گھنٹے تاخیر سے پہنچا تھا۔ محمد محسن ذوالقدر صاحب منبر پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ ابھی مرثیے کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا بلکہ وہ قطعات پڑھ رہے تھے۔ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ میرا منبر کے قریب پہنچ سکنا تقریباً ناممکن تھا۔ موصوف مجھے پہچانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ میں محض ان کی خوانندگی کے لیے بنارس سے ہر سال حاضر ہوتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے بیچ میں رک کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے سامعین سے گزارش کی کہ وہ مجھے منبر کے قریب آنے دیں۔ آج تقریباً چھتیس برس گزر جانے کے بعد بھی مجھے وہ واقعہ بھولا نہیں)۔

'ممتاز العلما سید تقی صاحب مجتہد': سید تقی صاحب کے مختصر تعارف کے ساتھ اس باب کا اختتام ہوتا ہے۔

کتاب کے آٹھویں باب کا آغاز 'انگریزی عہد میں' کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس باب کا آغاز موصوف نے میر انیسؔ کو انگریزی حکومت سے ملنے والے وظیفے سے کیا ہے۔ شریف علما کے ایک خط کی چند سطریں نقل کی ہیں:

''از طرف سرکار دولت مدار گورنمنٹ مبلغ ۱۵ر روپیہ بہ صلہ این کہ نبیرۂ مصنف بدر منیری باشند، عطامی شود۔''

(سرکار دولت مدار گورنمنٹ کی جانب سے مبلغ ۱۵ر روپے اس کے صلے میں عطا ہوتے ہیں کہ وہ مثنوی بدر منیر کے مصنف (میر حسن) کے پوتے ہیں۔)

رؤسا اور نوابین کی طرف سے میر انیسؔ کی آمدنی تقریباً بند ہو جانے کے بعد انھیں انگریزی گورنمنٹ کی جانب سے ۱۵ر روپے کا جو وظیفہ جاری کیا گیا تھا، وہ بذات خود، ان کے باکمال شاعر ہونے کے سبب نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسنؔ کے پوتے تھے اور یہ مثنوی فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل اور وہاں کی مطبوعات میں شامل تھی (صفحہ ۲۹۰)، یہ عطیہ غالباً اسی کی رائلٹی رہا ہوگا۔

'آشوب کے بعد پہلی مجلس': انتزاع سلطنت اور شہر کے حالات معمول پر آجانے کے بعد میر انیسؔ نے اپنی پہلی مجلس میں یہ مرثیہ' جاتا ہے شیر بیشۂ حیدر فرات میں' پڑھا تھا۔ اس مجلس میں میر انیسؔ کو زیادہ مجمع کی امید ہرگز نہیں تھی مگر وہاں پر سامعین کی تعداد کا اندازہ انیسؔ کی ذیل رباعی سے کیا جا سکتا ہے:

امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی
اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
آنکھوں کو کہاں کہاں بچھاؤں میں انیسؔ
ملتی نہیں جا بزم میں تل دھرنے کی

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد موصوف نے میر انیسؔ کے عظیم آباد کے پہلے سفر کا ذکر (۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء /صفحہ ۱۹۱) کیا ہے۔ میر انیسؔ کے لکھنؤ سے دور دراز شہروں کے سفر کی سب سے خاص وجہ یہ تھی کہ اب ان کی آمدنی بہت کم ہو چکی تھی۔ موصوف نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ ایسی افراتفری اور بدحالی کے فوراً بعد میر انیسؔ کا عظیم

آباد جا کر مجلس پڑھنا بعید از قیاس تو معلوم ہوتا ہے لیکن خارج از امکان نہیں کہا جا سکتا (صفحہ ۱۹۲)۔ انیسؔ اپنی زندگی میں ایک سے زائد بار لکھنؤ سے دور (بنارس، عظیم آباد، حسین گنج اور حیدر آباد) خوانندگی کی غرض سے گئے تھے۔ یہ سفر انھوں نے لوگوں کے اصرار اور اپنی ضرورت کی وجہ سے اختیار کیا ہوگا، کیونکہ لکھنؤ سے تو ان کی آمدنی بہت کم ہو چکی تھی۔ اس باب میں بیشتر، انیسؔ کے بنارس، حسین گنج اور عظیم آباد میں مجلسیں پڑھنے اور اس سے وابستہ واقعات نقل فرمائے ہیں۔

عظیم آباد سے انیسؔ کی یافت: اس عنوان کے تحت موصوف، یہاں سے انیسؔ، اُنسؔ اور اُنسؔ کو ملنے والے نذرانوں کے بارے میں رقم کیا ہے جو مفصل اور مدلل بھی ہے۔

لکھنؤ میں ترک مرثیہ: یہ اس باب کا آخری عنوان ہے۔ یہاں موصوف نے لکھنؤ میں میر انیسؔ کے مرثیہ ترک کرنے کی بہت سی وجوہات، مع مستند حوالوں کے بیان فرمائیں ہیں مگر وہ خود بھی کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ آخر ترک مرثیہ کا اصل سبب کیا تھا۔ وہ لکھنؤ والوں سے کسی وجہ سے کبیدہ خاطر تھے، اس لیے مرثیہ خوانی صرف لکھنؤ میں ترک کیا تھا مگر بنارس، عظیم آباد اور حیدر آباد میں خوب مرثیے پڑھے۔

نویں باب کا آغاز نیر مسعود نے انیسؔ کی راجا بازار سکونت سے کیا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ انتزاع سلطنت اور کشت و خونریزی کے خاتمے کے بعد انیسؔ نے لکھنؤ کے بیگم گنج محلے میں سکونت اختیار کی جو پنجابی ٹولہ اور راجا بازار کے ایکدم قریب تھا۔ اس کے بعد موصوف نے جن عناوین پر قلم اٹھایا ہے وہ درج ذیل ہیں:

'مرثیوں کی چوری، سیاں شہدا اور انیس' (وہ انیسؔ کے ہی محلے میں رہتا تھا، عزاداری کرتا تھا اور سبیل لگاتا تھا۔ اس کے اصرار پر انیسؔ نے اس کے یہاں مجلس پڑھی اور ہر سال پڑھنے کا وعدہ بھی کیا)، سیاں شہدے کی سبیل، نسف اللغہ (رشکؔ کی مرتب کردہ لغت، جو ادیبؔ کو انیسؔ کے کتب خانے سے ملی تھی۔ اس کا کچھ حصہ میر انیسؔ کے ہاتھوں کا نقل کیا ہوا ہے (صفحہ ۳۱۲)، ولادت جلیسؔ، ولادت عارف، سالکؔ سے ملاقاتیں، داماد انیسؔ کی وفات، ترک کے بعد لکھنؤ میں خوانندگی، (اس عنوان پر موصوف نے گیارہ صفحات کا احاطہ کیا ہے) فارغ سیتاپوری شاگرد انیسؔ، ریاضؔ، وقارؔ، شاگردان انیسؔ (سیتاپور، زیدپور)، دولہا صاحب عروجؔ کی ولادت کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ''۴ر رجب ۱۲۸۲ھ/ ۲۳ر نومبر ۱۸۶۵ء کو انیسؔ کے اس پوتے (فرزند نفیسؔ) کی ولادت ہوئی جو مرثیہ گوئی اور اس سے زیادہ مرثیہ خوانی میں انیسؔ کی وراثت کا آخری امین ثابت ہوا'' (صفحہ ۳۲۹)۔ اس باب کا اختتام دولہا صاحب عروجؔ پر ہوتا ہے۔

دسویں باب کا آغاز 'انیسؔ کی آخری آرام گاہ': (چوب داری محلہ، سبزی منڈی، چوک، محلہ آئینہ سازاں)، سے کیا گیا ہے۔ اس عنوان میں سب سے اہم انیسؔ کا اپنی تدفین کے لیے زمین خریدنا اور اجازت ہے۔ مونسؔ کا الگ مکان، میر عشقؔ سے رنجش، رئیسؔ کا عقد ثانی، عماد الملک اور انیسؔ، ایک اور ترک مرثیہ خوانی، وفیات (بیگم جان، علی اوسط رشکؔ، نواب علی جاہ، غالبؔ، ارسطو جاہ، دیانت الدولہ) اس عنوان کے تحت سب سے اہم بیان یہ ہے کہ مرزا غالبؔ کی وفات (۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء) کی خبر سننے کے بعد انیسؔ نے انھیں خراج

عقیدت میں ذیل قطعہ کہا تھا، جو بڑی اہمیت کا حامل ہے:

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداح علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے

پروفیسر نیر مسعود، دولہا صاحب عروجؔ کے سوانح نگار کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''میر انیسؔ صاحب ہر وقت زانو پر بٹھائے رکھتے تھے اور پیار سے فرماتے تھے کہ اب تو مرثیہ پڑھے گا؟ یہ جواب دیتے تھے کہ جی ہاں، پڑھوں گا۔ (انیسؔ) فرماتے تھے کہ عورتوں کی بولیاں اور جانوروں کی بولیاں سیکھو۔ اور جناب میر نفیسؔ صاحب سے میر انیسؔ صاحب نے فرمایا کہ ان کو جانوروں کی بولیاں سکھاؤ اور جو شخص جانوروں کی بولیاں بولتا ہو اسے نوکر رکھو۔'' کہتے ہیں کہ سوانح نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ دولہا صاحب کو 'صغر سنی سے مرثیہ کی تعلیم' دی جانے لگی تھی۔ یقینی سمجھنا چاہیے کہ انیسؔ نے بھی اپنے چہیتے پوتے کو مرثیہ خوانی کی کچھ نہ کچھ عملی مشق کرائی تھی (ص ۳۳۰)۔

تعزیت والدۂ حکیم سید علی، وثیقۂ نجف کا قضیہ، (ترک خوانندگی کے بعد بیشتر آمدنی بند ہو جانے کے بعد ایک قضیہ کی وجہ سے نجف کے وقت کا ۴۰ر روپے ماہوار کا وظیفہ بھی بند ہو گیا جس کے سبب انیسؔ کی پریشاں حالی مزید بڑھ گئی)، حیدر آباد کا سفر (اس سفر کی خاص وجہ نواب تہور جنگ کی طرف سے انیسؔ کو باقاعدہ دعوت نامہ (صفحہ ۳۴۸) اور مالی تنگ دستی سے وقتی نجات حاصل کرنا تھا۔ اس سفر کا احاطہ بھی نیر مسعود نے پوری وضاحت کے ساتھ مدلل کیا ہے، جو قارئین کی معلومات میں گراں قدر اضافے کرتا ہے۔ میر انیسؔ کا حیدر آباد کا سفر ۲۶ر صفحات پر محیط ہے جس سے بہت سی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں)، انسؔ سے بگاڑ، اور پھر ان کا کسی طرح (ڈرامائی انداز میں) (صفحہ ۳۷۶) انیسؔ کے مان جانے کے ساتھ یہ باب ختم ہوتا ہے۔

گیارہواں باب میر انیسؔ کی زندگی کے آخری ایام پر محیط، اہم ترین باب ہے۔ اس باب میں جن عناوین کا ذکر ہے وہ: انیسؔ کی عکسی تصویر، میر اشرف مسیح کی سفارش (میر انیسؔ اور میر مونسؔ کی مفارقت کے اسباب کا ذکر ہے)، وفیات (نواب علی تقی خاں صفحہ ۸۹۔۱۲۸۸ھ، سید تقی صاحب مجتہد ۲۶ر نومبر ۱۸۷۲ء: یہ حضرات میر انیسؔ کے قدرداں تھے)، مدرسۂ ایمانیہ کے طلبہ اور انیسؔ (معرکہ انیسؔ و دبیرؔ کا ذکر تفصیل اور اشعار کے حوالے سے بڑے ہی پر لطف طریقے سے کیا گیا ہے)، تپ وبائی ۱۲۸۹ھ (انیسؔ سمیت ان کا تمام خاندان اس بخار میں مبتلا ہو گیا تھا)، آخری برسوں کی مرثیہ گوئی اور مجلس (بیماری اور نقاہت کے سبب انیسؔ کی مرثیہ خوانی بہت کم ہو گئی تھی۔ متعدد خطوط کے حوالے سے وضاحت کی ہے)، انیسؔ کی آخری مجلس: (میر انیسؔ کی آخری مجلس کے سلسلے میں موصوف نے آٹھ حوالے دیے ہیں مگر یہ بات صاف نہ ہو سکی کہ انھوں نے آخری مجلس کہاں پڑھی اور وہ مرثیہ کون سا تھا) اشہرؔ، احسنؔ اور انیسؔ: (انیسؔ کے دو مستند سوانح نگاروں کے حوالے سے

ان کی آخری مجلس اور ملاقات کا ذکر کیا ہے)۔ یہ باب یہیں تمام ہو جاتا ہے۔

بارہواں اور آخری باب: میر انیسؔ کی بیماریاں، مرض موت اور ان کی وفات پر محیط یہ باب بھی اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ''حیدرآباد سے آنے کے بعد ان کی بیماریوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو مختصر وقفوں اور کمی بیشی کے ساتھ ان کے آخر وقت تک جاری رہا (صفحہ ۳۹۲)۔ اس کے بعد متعدد خطوط کے حوالے سے ان کی مختلف بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خطوط انسؔ، مونسؔ اور نفیسؔ کے ہیں، جسے مستند کہا جا سکتا ہے۔ میر انیسؔ کے آخری وقت کی کیفیت درج کرنے کے بعد ان کی وفات کے ذکر میں تقریباً ۱۶؍حوالے دیے گئے ہیں۔ مختصراً۔۔۔ جمعرات ۲۹؍شوال ۱۲۹۱ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء) کو قریب شام، انیسؔ کی آنکھیں نزع کی حالت میں بند تھیں۔ بالکل آخری وقت میں ان کی آنکھیں کھلیں، ہونٹوں پر ہنسی کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور دم نکل گیا (صفحہ ۴۰۲)۔ شب جمعہ کے خیال سے اسی رات سورج نکلنے سے پہلے تدفین ہو گئی۔ (مرگ انیسؔ) قبر اسی باغ (پرانی سبزی منڈی، چوک) میں ہے جہاں خاندان کی قبروں کے لیے انیسؔ پہلے سے ہی اجازت نامہ حاصل کر چکے تھے۔ (صفحہ ۴۰۳)

میر انیسؔ کے سب سے بڑے حریف اور مدمقابل سمجھے جانے والے مرزا دبیرؔ کو ان کی وفات بہت گراں تھی۔ اس سلسلے میں موصوف فرماتے ہیں کہ دبیرؔ کا بھی یہ آخر وقت تھا۔ عظیم آباد کی مجلسوں کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ انیسؔ کی تاریخ کہہ چکے تھے (صفحہ ۴۰۷)۔

آسماں بے ماہ کامل، سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ، منبر بے انیسؔ

ماحصل:

گیارہ ابواب، ۱۵۱؍عناوین کے ساتھ ۴۲۷؍صفحات کا احاطہ کیے ہوئے میر انیسؔ کی زندگی کے تمام نشیب و فراز پر لکھی گئی یہ واحد کتاب ہے جسے میر انیسؔ کی سوانح کے تعلق سے بھرپور معلومات فراہم کرانے والی ایک مکمل کتاب کہا جا سکتا ہے۔ راقم السطور کی دانست میں میر انیسؔ کی زندگی کے متعلق شاید کوئی گوشہ باقی رہ گیا ہو۔ دیگر خصوصیات کے ساتھ اس کی ایک سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ میر انیسؔ کے تعلق سے اس میں جتنی بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کے مستند حوالے موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆

Waseem Haider Hashmi
MG 1/4, Kabeer Colony,
Banaras Hindu University Campus,
Varanasi-221005,
Mob. 9451067040, 9580698805,
E-mail: whh55bhu@gmail.com

حفیظؔ بنارسی کی نظم نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

شمیم احمد

حفیظؔ بنارسی کا شمار ان معتبر شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے لیے نظم کو حرز جاں بنا لیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز نظموں سے ہی کیا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے ہی شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں موضوعاتی تنوع اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ جب جس طرح کی ضرورت محسوس ہوئی اور جذبات نے انگڑائیاں لیں یا کسی واقعے یا حادثے نے متاثر کیا تو قلم برداشتہ نظمیں کہہ دیں۔ وہ ذہین اور حساس طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کو بدلتی ہوئی دنیا میں قدم جمانے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں انسان دوستی، حب الوطنی، انسانی قدروں کی پامالی، سماجی اور معاشرتی کشمکش، سیاسی مفاد اور سامراجی نظام وغیرہ کو نہ صرف اپنی شاعری کا موضوع بنایا بلکہ ان موضوعات کی پیش کش میں اپنے ہم عصروں سے سبقت بھی لے گئے۔

حفیظؔ نے ان موضوعات کو برتنے میں صرف رسم ادائیگی ہی نہیں کی بلکہ ان کا فنی خلوص بھی ہر جگہ شامل رہا۔ انھوں نے اپنی بصارت و بصیرت سے ایک نئے جہان فکر کی دریافت کی۔ جہاں انھوں نے غزلوں کی طرح نظموں میں اپنی کلاسیکی میراث سے استفادہ کیا وہیں اپنے عمیق مطالعے اور مشاہدے کی بدولت اپنی شاعری کو نئی جہت بھی عطا کی، فنی قدروں کو مجروح ہونے سے بچایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں اپنے موضوعات، بندش کی چستی اور طرز ادا میں اپنے معاصرین کی نظمیہ شاعری سے بالکل مختلف نظر آتی ہیں۔

حفیظؔ بنارسی تمام عمر ان طاقتوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے جو انسانی قدروں کو پامال کر رہی تھیں۔ قوموں کے درمیان ہم آہنگی، امن عالم کی تلقین، اخلاقی قدروں کی بازیابی اور تحفظ انسانیت ان کا مقصد حیات تھا۔ انھوں نے اپنی نظموں کے مجموعے 'قول وقسم' میں 'آغاز سخن' کے تحت اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ نظموں سے میری دلچسپی ایمان کی حد تک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غزل میری محبوب صنف سخن ہے اور بہت حد تک میری شہرت اور مقبولیت کا باعث بھی۔ مگر نظموں سے میری دلچسپی کچھ کم نہیں۔ جو لوگ مجھ سے اور میری شاعری سے واقف ہیں انھیں اس بات کا بخوبی علم ہوگا کہ میں نے مختلف دور میں مختلف عنوانات پر کافی تعداد میں نظمیں کہی ہیں.......... یہاں اس حقیقت کا بھی انکشاف کر دوں کہ میں نے اپنی شاعری کا آغاز دراصل نظم گوئی ہی سے کیا تھا۔ شروع میں کچھ عشقیہ اور رومانی اشعار کہے تھے مگر میری پہلی شعری تخلیق جسے مکمل کہہ سکوں ایک قومی نظم ہی تھی جو میں نے آزادیٔ وطن کے بعد کہی تھی''۔ (آغاز سخن، قول وقسم، ص۸)

حفیظؔ بنارسی نے یوں تو بہت سی نظمیں لکھی ہیں جن میں کچھ تو ابھی بھی شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ ان کی مطبوعہ

نظموں کی فہرست کچھ اس طرح ہے ۔نذر وطن ،مہر آزادی ،قول وقسم ،یوم جمہوریہ ،ترانۂ کشمیر ،اے وطن تجھ پہ قربان جائیں گے ہم ،نذر عقیدت ،اے ہند کے سپاہی ،فتح کا جشن منالوں تو غزل چھیڑوں گا ،عزم جواں ،ترانۂ یک جہتی ،خراج تحسین ،امر شہید عبدالحمید ،جاگتے رہو ،نغمۂ بیداری ،ترانۂ محبت ،دنیا کے سربراہوں کے نام ،جان چمن جاتا رہا ،کب تک؟ احوال واقعی ،ساز جمہور ،فقیر ہند ،پیام گرونانک ،آہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ،دل کی آواز ،شرنارتھی ،بہ یاد مولانا مظہر الحق مرحوم ،اردو کا پیام ،آزادیٔ ہند کے جشن سیمیں کے موقع پر ،نگار سخن ،احترام وقت ،تاج محل ،صبح بنارس ،دعائے خیر ،پیغام عید ،ابتدائے سفر ،جوانی ،شاہد بازار ،التماس و جواب التماس ،ہم صفیر ،فتنۂ شر ،آخری امید ،نذر غالبؔ ۔ان کے علاوہ بہت سی نظمیں ابھی اشاعت کی منتظر ہیں ۔

چونکہ وہ سماج اور معاشرے کے ہی ایک فرد تھے اس لیے انھوں نے فرد اور معاشرہ ،ادب و سیاست اور ذات و کائنات کو کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھا ۔وہ بہت حساس واقع ہوئے تھے اس لیے سماج میں پائی جانے والی نابرابری اور عدم مساوات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ،نباض فطرت کی طرح ان کی انگلیاں تار احساس کو چھیڑتی رہیں ۔تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے فتنہ وفساد اور منافرت کی وجہ سے جو فضا مسموم ہوگئی تھی وہ دور غلامی سے زیادہ تباہ کن تھی ۔ان حالات سے دیگر شعرا کی طرح حفیظؔ بنارسی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔جن واقعات و حادثات نے بہت سارے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہجرت پر مجبور کیا ان سے حفیظؔ کا بھی سابقہ پڑا مگر انھوں نے سرزمین ہند کو چھوڑنا گوارا نہ کیا ۔گویا محبتِ وطن جزو ایمان بنی رہی اور اسی نے ان کے اندر مذہب پسندی اور وطن پرستی کو پروان چڑھایا ۔گوپی چند نارنگ نے سچ کہا ہے :

’’حفیظ بنارسی صاحب کی قومی ،وطنی شاعری اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ انھوں نے بغیر کسی خارجی دباؤ کے لہک لہک کر اس دھرتی کے گیت گائے ہیں ،حب الوطنی ایسی قدر ہے جس کی اہمیت کسی دور میں کم نہیں ہوئی ۔حفیظؔ بنارسی صاحب نے قومی یکجہتی پر بھی توجہ صرف کی ہے اور فرقہ پرستی کے خلاف کھل کر لکھا ہے ۔وہ مذہب کی غلط تعبیر ،رنگ ونسل کے امتیاز ،تنگ نظری اور تعصب کے مخالف ہیں یہ بہت بڑی سعادت ہے ‘‘ (بحوالہ تجلیات حفیظ ،ص ۳۷۰)

فرقہ پرستی اور تعصب وتنگ نظری کے خلاف اگر ان کا قلم نہیں اٹھتا تو پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسا قدآور نقاد اپنی رائے اتنی کشادہ قلبی سے کیوں پیش کرتا ۔حفیظ بنارسی قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر اپنی نظموں کے ذریعہ فضا کو سازگار اور ماحول کو خوش گوار بنانے میں ہمیشہ کوشاں رہے ۔’نذر وطن‘ ان کی ایسی نظم ہے جس میں ہنگامی حالات ، پرشور جذبات اور تاثراتی فضا تمام حدود وقیود سے بالاتر ہوکر سامنے آتے ہیں ۔نظم کے ابتدائی دو بند پیش کیے جا رہے ہیں ۔

دیار لالہ و سرو سمن سلام تجھے حریم لیلیٔ شعرو سخن سلام تجھے
مہ و نجوم کی بزم کہن سلام تجھے سلام وادی گنگ و جمن سلام تجھے

مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

ہمیشہ تو نے اٹھائی صدا صداقت کی دکھائی راہ زمانے کو مہر و الفت کی
گواہی دیتی ہے تاریخ تیری عظمت کی مئے حیات کی بزم کہن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

پوری نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وطن کا حسن و جمال غزل کے رنگ وآہنگ میں پوری طرح ڈھل گیا ہے ساتھ ہی احترام وطن کا بھی مظہر ہے ۔یہ مادر وطن کے تصور کو گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ تقدس بھی عطا کرتا ہے ۔زمانے کو مہر والفت کی راہ دکھانا ،صداقت کی آواز اٹھانا ،ایسے جذبات ہیں جسے تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کرلیا ۔پوری نظم میں اثر آفرینی کی فضا قائم ہے ۔’مہر آزادی‘ ان کی وہ نظم ہے جسے قطعات کی شکل میں پیش کر کے معنوی ارتباط کا شعور پیش کیا ہے ۔

ظلمت قید الم ہند سے کافور ہوئی نگہ شوق سے تاریکیٔ غم دور ہوئی
رنگ لاکر ہی رہا خونِ شہیداں اے دوست آخرش ملک سے رخصت شب دیجور ہوئی

☆☆

جذب آزاد گرفتار سلاسل کب تک حق پسندوں پہ بھلا قبضۂ باطل کب تک
آخرش ہٹ ہی گئے دشمن انساں کے قدم طاقت ظلم اہنسا کے مقابل کب تک

☆☆

مژدہ اے تشنہ لبو! دور میں جام آہی گیا آخرش اپنی مسرت کا پیام آہی گیا
مرحبا ذوقِ نظر آفریں اے چشم طلب آرزو جس کی تھی وہ حسن مقام آہی گیا

☆☆

پرچم شانِ وطن روکش انوار ہوا کب سے سویا تھا مقدر جو وہ بیدار ہوا
قید افرنگ کا دیرینہ فسوں ٹوٹ گیا مہر آزادیٔ جمہور ضیا بار ہوا

پہلے چار مصرعوں میں آزادیٔ ہند کی خوشی کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے ۔جیسے ظلمت ہند سے قید الم کافور ہونا ،تاریکی غم کا نگاہ شوق سے دور ہونا ،شہیدوں کے خون کا رنگ لانا ،ملک سے اندھیری رات کے دور ہونے کی پیش بندی ،ان چار مصرعوں کے ذریعہ مژدۂ حیات کا کام لیا گیا ہے ۔فیض احمد فیضؔ کہتے ہیں :

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

مگر حفیظؔ بنارسی بالکل مثبت پہلوؤں میں اس کا خیر مقدم کرتے ہیں :

مژدہ اے تشنہ لبو! دور میں جام آہی گیا آخرش اپنی مسرت کا پیام آہی گیا
مرحبا ذوق نظر ،آفریں اے چشم طلب آرزو جس کی تھی وہ حسن مقام آہی گیا

ان اشعار کے ذریعے جہاں وہ مژدۂ جاں فزا سنانے میں کامیاب وکامراں ہیں وہیں ان کے یہ اشعار آزادی کی ضیا بار کرنوں سے منور ہندوستان کی سرزمین سے محبت کی دلیل بھی ہیں ۔ان کا شمار ان بے باک اور

صاف گو شعرا میں ہوتا ہے جن کی عظمت کا اعتراف اپنے تو اپنے اغیار بھی کرتے ہیں۔

حفیظؔ بنارسی حب الوطنی اور یگانگت سے اس قدر ہم آہنگ تھے کہ کہیں بھی ہوں نا اتفاقی کا ان پر شائبہ تک نہیں ہوتا، ہر موڑ پر مادرِ وطن سے محبت کا اظہار گویا وطن کے ذرّے ذرّے سے محبت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ان کی نظم 'قول وقسم' کے چند بند ملاحظہ ہوں:

شاداب و جواں سال نگاروں کا وطن ہے　　فطرت کے دل آویز اشاروں کا وطن ہے
انوار کے بہتے ہوئے دھاروں کا وطن ہے　　خوش رنگ و خوش انداز دیاروں کا وطن ہے
پیارے ہیں جو سب کو انھیں پیاروں کا وطن ہے
یہ دیش محبت کی بہاروں کا وطن ہے

اس دیش میں فطرت ہے ازل ہی سے درخشاں　　ذروں میں ہے وہ حسن کہ خورشید پشیماں
ملتا ہے یہاں روح کی تسکین کا ساماں　　ہر خطۂ پاکیزہ ہے فردوس بداماں
پہلے اسی گیسو کو محبت نے سنوارا
قدرت کے اس آئینے کو ہر رخ سے نکھارا

گوتم کو یہیں بیٹھ کے گُن گیان ملا ہے　　جو ایک ہے نانک کو وہ بھگوان ملا ہے
سنسار کو اس دیش سے سمّان ملا ہے　　گاندھی سا اسی دیش کو انسان ملا ہے
یہ پریم کا مندر ہے محبت کا شوالا
پہنچا ہے اسی دیش سے دنیا میں اجالا

ہیں پریم کے نغموں سے بھری اس کی فضائیں　　چلتی ہیں یہاں خلد کی جاں بخش ہوائیں
دیکھے تو کوئی صبح بنارس کی ادائیں　　نادر ہیں اجنتا کی، ایلورا کی گھٹائیں
مشہور زمانہ ہے ہر اک شام اودھ کی
بھولی نہیں دنیا ابھی تاریخ مگدھ کی

سولہ بند کی اس نظم سے صرف چار بند اس لیے پیش کیے گئے ہیں تا کہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکے کہ حفیظؔ بنارسی کا تصور حب الوطنی کس قدر بلند ہے۔ مذکورہ بندوں کے مطالعے سے ان کے مطالعے کی گہرائی، فکر کی گیرائی، مضامین کی پیشکش پر غیر معمولی قدرت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ ملکہ ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم 'یوم جمہوریہ' کو مذکورہ تصور سے ہٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ بظاہر اس نظم میں لفظوں کے تانے بانے 'قول وقسم' سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں مگر معانی و مفاہیم اور جذبات کے اعتبار سے دونوں میں بعد المشرقین ہے، مگر حب الوطنی کا جذبہ دونوں میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نہ صرف انسانی سوچ اور فکر بدلتی ہے بلکہ اس کے زیر اثر ادب پارے اور اس کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کسی بھی مذہب، ملک، سماج اور فرد کا یہ

نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا کہ ہم صرف اپنے ہاتھ میں تلوار اٹھائے پھرتے رہیں۔ مگر کبھی کبھی صالح معاشرے کے قیام کی خاطر یا آفتوں کے دفاع کے لیے اگر صبر اور اس کی تلقین کارگر ثابت نہ ہو تو طاقت کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہ صرف حفیظؔ بنارسی کا ہی نقطۂ نظر نہیں ہے بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اور انسانی دل و دماغ کی تشکیل نو کی خاطر کبھی کبھی اس طرح کے اقدامات ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ ''نوائے وقت'' ان کی ایسی ہی نظم ہے جس کی اہمیت ایک کمانڈر سے کم نہیں جو دشمنوں کے مقابل اپنے سپاہیوں کو حوصلہ دینے کا کام کرتا رہتا ہے۔ اس کے ایک ایک مصرعے سے خلوص، ہمدردی، حب الوطنی کے ساتھ ساتھ نوجوانانِ وطن کو مشکل سے مشکل مقامات میں تلخ حقیقتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی دیا گیا ہے۔

خواب غفلت سے اٹھو انگڑائیاں لیتے ہوئے　　عزم نو کی، جذبۂ بیدار کی باتیں کرو
حریت کے گیت گاؤ، سایۂ شمشیر میں　　سایۂ گیسو نہ زلف یار کی باتیں کرو
زندگی ہے شورش طوفاں سے ٹکرانے کا نام　　دامن ساحل نہیں منجدھار کی باتیں کرو
میکدہ خطرے میں ہے اس وقت اے بادہ کشو!　　شیشہ و ساغر نہیں، تلوار کی باتیں کرو
سنت منصور دہراؤ نئے انداز سے　　چھیڑ دو ساز اناالحق، دار کی باتیں کرو
لاج رکھ لو مادر ہندوستاں کی اے حفیظؔ　　پھر کسی مہوش، کسی گلنار کی باتیں کرو

حفیظؔ بنارسی اپنی شاعری میں ظلم و استبداد کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے ہیں۔ سماج کی اصلاح کی دعوت دینا، بھید بھاؤ کی مذمت کرنا، انسانی رشتوں کا احترام سکھانا ان کی شاعری کے چند نمایاں اوصاف ہیں، حالانکہ وہ نہ کوئی سیاسی آدمی تھے اور نہ کسی ازم سے ان کا تعلق تھا۔ وہ اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا دردمند دل رکھتے تھے۔ وہ حساس، باشعور، گہرا مشاہدہ اور وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی نظموں میں قدروں کا زوال، تہذیبی انحطاط اور اخلاقی بحران کی نشاندہی قدم قدم پر ملتی ہے۔ جمہوری اصولوں کی پامالی، مہذب اور نیک لوگوں کی حق تلفی دیکھ کر وہ تڑپ جاتے تھے۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ آزادی کی نعمت کے حصول کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی لعنتوں سے بھی سابقہ پڑا جس کا ملال آج بھی ہے اور وہ ہے ملک کی تقسیم، جس کی بنیاد فرقہ واریت پر ہے۔ یہی نہیں کہ ملک کی تقسیم کے لیے مذہب کو بنیاد بنایا گیا بلکہ اس کا الزام اردو کے سر بھی مڑھ دیا گیا۔ جس کی وجہ سے تعصب و تنگ نظری اور فرقہ واریت کو اور بھی شہ مل گئی۔ حفیظؔ بنارسی اپنی نظموں کے ذریعہ اس تنگ نظری کی گرد کو دھونے اور کھائیوں کو پاٹنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے جیسا کہ 'مہر آزادی' میں ذکر ہو چکا ہے۔ 'ترانۂ یکجہتی' سے دو بند ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

انسانیت کا گیت سناتے چلے چلو
شمع خلوص دل میں جلاتے چلے چلو
مہر و وفا کے پھول کھلاتے چلے چلو
دنیا کو رشک خلد بناتے چلے چلو

ساز وفا پہ جھوم کے گاتے چلے چلو

آپس کے اتحاد میں پنہاں ترقیاں
آپس کے اتحاد میں ہیں سر بلندیاں
آپس کا اتحاد علاج غم جہاں
دنیا کو رشک خلد بناتے چلے چلو
ساز وفا پہ جھوم کے گاتے چلے چلو

حفیظؔ بنارسی نے اپنی نظم ''نغمۂ بیداری'' میں سرزمین ہند کی اہمیت بتاتے ہوئے اس کی گود میں پرورش پانے والی نعمتوں کا جہاں ذکر کیا ہے وہیں اسے مشترکہ کلچر بتاتے ہوئے متحد ہوکر اسلاف کے کارناموں کا اعتراف کرنا سکھایا ہے۔

حفیظؔ بنارسی نے قومیت و وطنیت ،خاک وطن کا ہر ذرہ پیارا ہے کی روشنی میں ابنائے وطن کو بھی اپنی نظموں میں نہ یہ کہ صرف جگہ دی بلکہ پوری پوری نظم لکھ کرانھیں خراج عقیدت بھی پیش کیا۔مہاتما گاندھی کی صد سالہ برسی کے موقع پر''فقیر ہند'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھ کران کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے لوگوں کواسی راہ پر چلنے کی دعوت دی۔

بادۂ حب وطن سے زندگی تیری تھی مست تو نے اپنے دشمنوں کو دی محبت سے شکست
تجھ کو تھا منظور ایسا انتظام وبند و بست جو مٹادے امتیاز نقشۂ بالا و پست
داغ نفرت کا ترے آئینۂ دل میں نہ تھا
فرقِ رنگ ونسل ومذہب تیری محفل میں نہ تھا

اس کے علاوہ''احترام وقت'' ان کی وہ شاہکارنظم ہے جس میں وقت کی قدرو قیمت کے تعین کے مختلف زاویوں کواس انداز سے پیش کیا ہے کہ لگتا ہے حفیظؔ بنارسی اپنی آپ بیتی سنا رہے ہیں۔کہتے ہیں:

وقت بہتی ہوئی ایک چنچل ندی
موج در موج ہے وقت کا بانکپن
وقت شام و سحر کا حسیں سلسلہ
وقت کی داستاں انجمن انجمن

ایک حالت میں دیکھا نہیں وقت کو
وقت شعلہ بھی ہے، وقت شبنم بھی ہے
وقت خنجر بکف، وقت قاتل ادا
وقت ہی زخم دوراں کا مرہم بھی ہے

وقت نے ڈھا دیئے کتنے اونچے محل

کتنے ایوان نذر زمیں ہوگئے
وقت کی مہربانی سے کتنے گدا
تاجور بن گئے شہہ نشیں ہوگئے

وقت گذرا تو پھر ہاتھ آتا نہیں
ناظم وقت کا ہے عجب انتظام
وقت کرتا نہیں ہے کسی کو معاف
وقت لیتا ہے ناقدر سے انتقام

مذکورہ بندوں میں وقت کے مختلف رنگ وروپ اورکارنامے پیش کیے گئے ہیں۔وقت کوئی رشتہ نہیں رہنے دیتا اس لیے ہمیں چاہیے کہ وقت رہتے کوئی رشتہ قائم کرلیں جووقت کے دھارے پہ چل کرمنزل عرفاں کا پتہ دے۔

حفیظؔ بنارسی نے مختلف شخصیات کے ساتھ ساتھ کچھ علاقوں اورشہروں پر بھی نظمیں کہی ہیں جیسے کشمیر پہ نظم کہی۔''صبح بنارس'' بھی ان کی مشہور نظم ہے۔عمارتوں میں تاج محل کی خوبصورتی پراردو کا کون شاعر ہوگا جس نے دو چار اشعار نہ کہے ہوں۔ساحرؔ لدھیانوی کی نظم 'تاج محل' کا چرچا آج بھی شعردوست افراد کے نوک زبان ہے۔سینکڑوں شعرانے تاج محل پہ نظم لکھی مگر جوشہرت ساحرؔ کو ملی وہ بہت کم کے مقدر میں آسکی،لیکن حفیظؔ بنارسی کی نظم 'تاج محل' اس سے قدرے مختلف ہے۔یہاں بھی انھوں نے اپنی چابک دستی ،زندہ دلی،فن مصوری اور لفظوں سے بت تراشی کا کام لیا ہے۔تاج محل کوانھوں نے کہیں ابروئے حسینہ کہا ہےتو کہیں فردوس کا زینہ، بے مثال نگینہ، جمنا کے کنارے چاندنی کا سفینہ،دودھ کی نہر،کرنوں کا شانہ،آب کوثر کا چھلکتا ہوا پیمانہ،حورلب جو،بت مہ رو،ٹپکا ہوا آنسو،بے نام خوشبو،نغمۂ بربط،چادرنور،گنجینۂ تنویر،شاداب جوانی،زندۂ جاوید کہانی اور مزدور کی محنت کی نشانی۔ان تراکیب کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حفیظؔ بنارسی نے اپنے مطالعے کا تمام فیضان یہاں انڈیل دیا ہے۔مزدور کی محنت کی نشانی اچھے اچھوں کے ذہن میں آنا مشکل امر تھا۔اس نظم سے حفیظؔ بنارسی کی شہرت ومقبولیت میں اور اضافہ ہوا۔ان کی نظمیں جمالیاتی قدروں،فکروشعور کی بالیدگی،معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے برمحل استعمال اورنئی نئی تراکیب کے اختراع کی وجہ سے آج بھی قارئین کا دل موہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

Shameem Ahmad
Research Scholar, Dept. of Urdu,
Banaras Hindu University, Varanasi 221005,
Mob. 8090121488,
Email: shameemasri@gmail.com

انقلاب کا مطرب کاملؔ شفیقی جونپوری

عارف حسین جونپوری

یادش بخیر! آج سے تقریباً ۲۵؍سال قبل کاملؔ شفیقی جب ایک بلند آہنگ کے ساتھ مشاعروں میں سامعین سے مخاطب ہوتے تھے تو بڑے بڑے شہروں کے وسیع پنڈال کا مجمع ہمہ تن گوش ہوجاتا تھا:

میں انقلاب کا مطرب ہوں زندگی کا نقیب   ضمیر قوم کا نیلام کر نہیں سکتا
پلاؤ زہر کا ساغر سجاؤ دار و رسن   میں ہوں عوام کا شاعر، میں مر نہیں سکتا

کاملؔ شفیقی ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معزز گھرانے کے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد حسن انٹر کالج جونپور سے تعلیمی فراغت حاصل کر کے میونسپل بورڈ جونپور میں ملازم ہوگئے۔ ان کی زندگی کا کچھ حصہ انگریزی سامراج کے آخری دور میں اور پھر ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے دور میں گذرا۔ یہ دور ادبی اعتبار سے ترقی پسند ادب کے عروج کا زمانہ بھی تھا۔ اس پس منظر میں کاملؔ صاحب ذہنی سفر کے محرک رہے۔ یوں تو وہ فخر مشرق علامہ شفیقؔ جونپوری کے شاگرد تھے، اپنے استاد سے انھوں نے رموز ونکات سخنوری میں دسترس اور زبان و بیان پر قدرت ضرور حاصل کی مگر اپنی فکری راہیں خود ہی بنائیں۔ ان کے چاروں طرف غربت، مایوسی، افلاس اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والی نئی جماعتوں کے رہبران تھے جن کا طرز عمل ان سے اس طرح کے شعر کہلوا رہا تھا۔

کشتی نواز تم کو نہیں جانتے ہوئے   ہم نے خوشی خوشی تمھیں پتوار سونپ دی
اب زندہ رہنے دو ہمیں یا قتل تم کرو   ہم نے تو اقتدار کی تلوار سونپ دی

☆☆

اٹھنے والے نئے طوفاں کی خبر بھی رکھنا   گاؤں سے دور کی مسجد پہ نظر بھی رکھنا
تم کو وادیٔ شہادت سے گذرنا ہے ابھی   اس سفر کے لیے کچھ زاد سفر بھی رکھنا
جھونپڑی قطرۂ شبنم کو ترس جاتی ہے   جو گھٹا آتی ہے محلوں پہ برس جاتی ہے
ہو جہاں طالب جاں معرکۂ حق کاملؔ   بارلعنت ہے وہاں دوش پہ سر بھی رکھنا

کاملؔ شفیقی نے اپنے مختصر دور زندگی میں ادب اور عوام دونوں پہ اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ ایک طرف جہاں مشاعروں کے باعث ان کی شخصیت اور ان کا تیور، بلند بانگ لہجہ آج بھی لوگوں کے دل و دماغ میں محفوظ ہے وہیں انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام ''نئی آواز'' جو نظموں کا مجموعہ ہے (جس پر فراقؔ اور وامقؔ کا تبصرہ شامل ہے) اور نعت کے مجموعے 'تجلیٔ فاراں' اور 'جلوۂ فاراں' کے ذریعہ ادبی اور فنی زاویے سے ادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ کاملؔ کا ایک مجموعہ 'نغمۂ ہلال' تو واقعی 'چیزے دیگری' کی صف میں آتا ہے، یعنی

سماج کے مختلف طبقوں کی عید کی منظرکشی جس میں مزدور، کسان، استاد، دیگر طبقہ اور امرا و رؤسا کی عید کے سامان کی منظرکشی کی گئی ہے، میرے خیال میں ایسا کسی ایک ہی مجموعہ میں کسی شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ یہ کامل کی فنی اور فکری انفرادیت ہے۔

کاملؔ شفیقی کی فنی اور فکری انفرادیت کی روشن دلیل ان کی نظم 'تاج محل' ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں ساحرؔ کی نظم کا اب تک کوئی جواب نہیں ہوسکا۔ اکثر شعرا نے تاج محل اور شاہجہاں کی مدافعت ضرور کی، اس میں شفیقؔ جونپوری اور محسن رضا جونپوری بھی شامل ہیں مگر یہ سب نظمیں روایت کا شکار ہوگئیں پھر بھی کاملؔ کی نظم ساحرؔ کی نظم کے مدمقابل رکھی جاسکتی ہے:

سنگ مرمر سے تراشی ہوئی تخلیق وفا   آج جس شکل میں ہے کل تو نہ رہ جائے گی
قلزم ہستیٔ پانی کو جب آئے گا جلال   شورش وقت کے طوفان میں بہہ جائے گی
اک نیا تاج محل پیش نہیں کر سکتے   اس لیے دوریٔ محبوب گوارہ کرلیں
ہم کہ مفلس ہیں تہی دست ہیں بے مایہ ہیں   کیا فقط اس لیے الفت سے کنارہ کرلیں
ایک سرمایے کا جادو ہے عمارت کا فسوں   منظر تاج حسیں حاصل طاؤس و رباب
سیم گوں نقرئی محراب و فصیل و در و جام   کون ہے ان میں غریبوں کی محبت کا جواب
اک طرف خون جگر دوسری سمت آب گہر   جوئے شیر ایک طرف تاج گراں ایک طرف
شاہ عالی نے رعایا کی لٹا کر دولت   اپنے محبوب کی گر کی ہے وصیت پوری
اپنی ہی قوت بازو کو بنا کر تیشہ   ایک مزدور نے کی شرط محبت پوری
کون افضل ہے محبت میں بتائے دنیا   کوہ کن ایک طرف شاہجہاں ایک طرف

اس طرح کاملؔ نے ساحرؔ کے مدمقابل ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ اپنے دور میں یہ نظم بھی بڑی مقبول ہوئی مگر رفتہ رفتہ عوام کے حافظے سے محو ہوگئی۔ کاملؔ کا زیادہ تر کلام غیر مطبوعہ ہے۔ ان کی دنیا سے اتفاقیہ رخصت نے بہت سا کام ادھورا چھوڑ دیا۔ ان کا انتقال بمبئی میں ۲۹؍دسمبر ۱۹۸۷ء کو ہوا جہاں وہ ایک محفل مشاعرہ میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ مہاراشٹر حکومت میں اس وقت کے وزیر شہری ترقیات سید احمد صاحب ایم۔ ایل۔ اے نے بہ اہتمام ان کا جسد خاکی بذریعہ طیارہ روانہ کروایا اور جونپور میں ۳۱؍دسمبر کو آبائی قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

کاملؔ صاحب کو ان کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی ''شاعر انقلاب'' کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ (اگرچہ یہ لقب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے لیے مخصوص ہے) کاملؔ کے یہاں سماج کی لعنتوں کو بدل دینے کا جو عزم پایا جاتا ہے اس کے لیے وہ بجا طور پر اس لقب سے یاد کیے جانے کے حقدار ہیں۔ انھوں نے تمام اصناف ادب پر طبع آزمائی کی جس میں قصیدہ، نوحہ، غزل، نظم، رباعی سبھی کچھ شامل ہیں۔ مذہبی انجمنوں کے اراکین کاملؔ صاحب کو ہمیشہ نوحہ اور نظم لکھنے کے لیے گھیرے رہتے تھے تو دوسری طرف آل انڈیا سطح کے

مشاعرے اور محافل منقبت کے اراکین ان کے استقبال میں اسٹیشن پہ راتیں گزار دیتے تھے۔

ان کے حالات زندگی اور ان کا کچھ کلام ان کے صاحبزادے عاقلؔ جونپوری سے مجھے ملا۔ اکثر لوگ جو کاملؔ کو دیکھ اور سن سکے ہیں، ان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے اس لیے راقم نے یہ مضمون تحریر کیا۔ اگر عوام نے دلچسپی لی تو ان کا غیر مطبوعہ کلام شائع ہوگا اور وہ اپنے عہد کے ایک ناقابل فراموش شاعر تصور کیے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

Arif Husain Jaunpuri,
Ext. Lucturer Abul Kalam Inter College,
Pratapgarh U.P.-230001

نوٹ:

فاضل مضمون نگار ابوالکلام انٹر کالج پرتاب گڑھ میں اردو کے استاد تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ہی اچھی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ فارسی زبان و ادب سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے اور قدیم و جدید فارسی شعرا کے دواوین ان کے زیر مطالعہ تھے۔ حقیر کی ان سے پہلی اور آخری ملاقات کوپا گنج ضلع مئو میں 17 اگست 2015 کو ایک شادی میں ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے دیوان امام خمینی کا مطالبہ کیا لیکن افسوس کہ چند ہی مہینوں بعد 28 فروری 2016 کی صبح کو میرے پاس فون آیا کہ اچانک دیر رات گئے، حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مدیر

عہد زرّیں کی شاعری اور قائمؔ چاندپوری

ریاض احمد

قائم چاندپوری کا شمار اٹھارہویں صدی عیسوی کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ، خدائے سخن میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ جیسے سربرآوردہ شعرا کے علاوہ خانِ آرزو اور مرزا مظہر جانِ جاناں بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ قائمؔ نے ان سبھی شعرا سے کسی نہ کسی طور پر کسب فیض کیا ہے۔

قائم کے نام اور ان کی ولادت کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں کے درمیان بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے ان کا نام قیام الدین علی، بعض نے محمد قیام الدین اور کچھ نے محمد قائم لکھا ہے۔ منعم سعیدی، پدم سنگھ شرما اور مولوی عبدالحق نے ان کا نام محمد قیام الدین اور تخلص قائم بتایا ہے۔ جب کہ مالک رام، غلام حسین شورش، وجیہہ الدین عشقی، کچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، مرزا علی لطفؔ، ابوالحسن امیر الدین امیر الہ آبادی، سید راس مسعود، شبیر علی خاں شکیب رام پوری، مولوی قدرت اللہ شوق سنبھلی رام پوری، میر حسن اور میر تقی میرؔ وغیرہ نے قائم کا اصل نام محمد قائم لکھا ہے۔ مصحفی نے ''عقد ثریا'' میں ان کا نام محمد قائم لکھا ہے لیکن اپنے دوسرے تذکرے ''تذکرۂ ہندی'' میں انھوں نے قائم کو قیام الدین عرف محمد قائم لکھا ہے۔ قائم کے پڑپوتے مولوی شاہد حسن نے بتایا ہے کہ والد نے ان کا نام محمد قائم اور نانا نے قیام الدین رکھا تھا۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے یہ دلیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ قائمؔ کے دادا کا نام محمد اکرم، والد کا نام محمد ہاشم اور حقیقی بڑے بھائی کا نام محمد منعم تھا۔ اس بنیاد پر ان کا اصل نام محمد قائمؔ ہونا چاہیے۔ لیکن اقتدا حسن نے اس قافیے کی بنیاد کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو قائمؔ کی اولاد میں بھی سبھی کے نام اسی قافیے پر مشتمل ہوتے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ شاہ محمد کمال، مجنوں گورکھپوری، مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی، مولوی کریم الدین، سعادت علی خاں ناصر اور اقتدا حسن وغیرہ نے اصل نام قیام الدین بتایا ہے۔ قدرت اللہ قاسم اور احد علی یکتا وغیرہ نے قیام الدین علی لکھا ہے تو امتیاز علی خاں عرشی نے ان کا نام قائمؔ اور لقب قیام الدین تحریر کیا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے ''مخزن نکات'' میں اپنا نام قیام الدین قائم لکھ کر اپنے دونوں ناموں کو تسلیم کیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نام قیام الدین قائم تھا۔

جائے پیدائش کے سلسلے میں سب سے پہلے ڈاکٹر محمد امین نے مولوی عبدالحق کے حوالے سے قائمؔ کا مولد چاندپور بتایا ہے۔ پنڈت پدم سنگھ شرما جو موضع نایک نگلہ تیاگی، پرگنہ چاندپور کے رہنے والے تھے اور ایک عالمی شہرت کے مالک ہوئے ہیں، کا جو مضمون ماہنامہ ''نقوش'' (لاہور) (شمارہ جولائی ۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا تھا اس کی رو سے قائم موضع محدود میں پیدا ہوئے جو چاندپور سے محض ۱۰ کلومیٹر شمال کی جانب واقع ہے۔

یہاں ان کے خاندان کے کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں۔ اسی بیان کی رو سے شبیر علی خاں شکیبؔ نے یہ قیاس لگایا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ قائم محدود میں پیدا ہوئے ہوں اور بعد میں چاند پور چلے آئے ہوں۔ جب کہ اقتدا حسن کے مطابق قائم باتفاقِ رائے چاند پور میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ لیکن انجینئر سمیع الدین صاحب پنڈت پدم سنگھ شرما کے بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پدم سنگھ شرما نے محدود کے بارے میں جو تحریر کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ احقر اس علاقے میں ہو آیا ہے۔ محدود میں قائم کے خاندان کا کوئی بھی فرد نہ رہتا ہے اور نہ کبھی رہا ہے۔ البتہ قائم بذاتِ خود محدود میں رہ چکے ہیں''۔ (قائمؔ چاند پوری، مرتبہ انجینئر سمیع الدین، ص ۴۲)

سنِ ولادت کا بھی یہی حال ہے۔ جہاں ایک طرف محمد امین نے قائمؔ کی پیدائش ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء میں تحریر کیا ہے تو دوسری طرف مصحفی نے عقد ثریا (۱۱۹۹ھ) تالیف کرتے وقت ان کی عمر ساٹھ سال بتائی ہے اور اپنے دوسرے تذکرے ''تذکرۂ ہندی'' (۱۲۰۹ھ) میں لکھا ہے کہ جب ۱۱۸۵ھ میں وہ قائم کے ساتھ ٹانڈہ میں تھے تو قائم کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ انھیں دونوں حوالوں کی بنیاد پر شبیر علی خاں شکیبؔ نے قائم کا سنِ ولادت ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء) اور ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) کا درمیانی عرصہ مانا ہے۔

قائم کی اولاد میں ان کے پڑپوتے مولوی شاہد حسن نے بتایا ہے کہ ان کے دادا مولوی ریاض الدین کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے کہ قائم کی وفات اسّی سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ جس کی رو سے دیکھا جائے تو ان کا سنِ ولادت ۱۱۲۸ھ (۱۷۱۵ء) میں قرار پاتا ہے۔ خالد علوی نے بتایا ہے کہ چونکہ تذکرہ لکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی ہے لیکن ''مخزنِ نکات'' جس معیار کا ہے اس کے لحاظ سے اس کو شروع کرنے کی عمر کم سے کم پچیس سال تو ضرور ہونی چاہیے کیوں کہ قائمؔ ایک نیم دیہی زراعتی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بنیاد پر خالد علوی نے قائمؔ کے سنِ ولادت کا اندازہ ۲۰-۱۷۱۹ء لگایا ہے۔ لیکن اقتدا حسن نے کافی حوالوں کے ساتھ ان کی ولادت کا سال ۱۱۳۵ھ سے ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۲ء۔ ۱۷۲۵ء) کا درمیانی عرصہ قرار دیا ہے۔

قائم کے ایک بڑے بھائی محمد منعم تھے جو دہلی میں ہی رہتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ کئی تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے جن میں میر حسنؔ بھی شامل ہیں۔ محمد منعم کی شاکر ناجی سے اچھی خاصی دوستی تھی، ممکن ہے کہ محمد منعم کے ذریعے ہی قائمؔ کی رسائی سوداؔ اور دردؔ جیسے برگزیدہ شعرا تک ہوئی ہو۔ ''مخزن نکات'' سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ قائم دہلی میں کافی عرصے تک رہے۔

قدرت اللہ قاسم اور خوب چند ذکا نے اپنے تذکروں میں اشارہ کیا ہے کہ دہلی آنے کے بعد قائمؔ نے سب سے پہلے ہدایت کی شاگردی قبول کی لیکن کسی بات پر ان سے ان بن ہو جانے کی وجہ سے قائمؔ نے ہدایت کی ہجو لکھ ڈالی۔ ہدایت کی شاگردی کی بات کسی اور تذکرے میں نہیں ملتی اور نہ ہی شاہ ہدایت نے ایسا کوئی دعویٰ کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بھی یہ کہانی یہیں سے اٹھائی ہے اور بے بنیاد بات کو حسب عادت اپنے دلکش انداز میں پیش کر دی ہے۔ دراصل قدرت اللہ قاسم کو ہدایت سے بے پناہ محبت تھی اور انھیں قائم کی گستاخی بری لگی اور ایک کہانی بنا دی۔

مصحفی نے قائم کو دردؔ کا معتقد بتایا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ قائم نے دردؔ کو اپنا کچھ کلام ابتدا میں دکھایا ہو اور اصلاح بھی لی ہو لیکن باقاعدہ شاگردی قبول نہ کی ہو۔ اقتدا حسن نے خیال ظاہر کیا ہے:

''قائم نے میر دردؔ سے استفادہ سخن ضرور کیا لیکن کچھ عجب نہیں کہ اس نوجوان شاعر کی افتادِ طبع کو دردؔ نے بھانپ لیا ہو اور خود انھی نے سوداؔ کی شاگردی اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو۔''

(کلیات قائم، حصہ اول، ص۔ ۱۳)

سوداؔ کی شاگردی قائم کے لیے نعمت ثابت ہوئی اور قائم نے وہ مقام حاصل کیا کہ ان کا شمار عہد زرّیں کے مشاہیر شعرا میں ہونے لگا۔ استاد اور شاگرد دونوں کے ذہن میں ایسی مماثلت و ہم آہنگی تھی جس کی مثال دینا آسان کام نہیں ہے کیوں کہ دونوں نے ہجو یہ اور فحش شاعری کے علاوہ اعلیٰ درجے کی غزلیں بھی کہی ہیں۔

سیاسی افراتفری کے باوجود قیام دہلی قائم کی زندگی کا سنہرا دور ہے لیکن یہ فارغ البالی قائم کی زندگی میں زیادہ وقت تک قائم نہ رہ سکی اور انھیں دہلی چھوڑنا پڑا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ ہجو یہ ''شہر آشوب'' کی وجہ سے انھیں دہلی کو خیر باد کہنا پڑا۔ کیوں کہ ''شہر آشوب'' میں انھوں نے شاہ عالم کی ہجو لکھی تھی۔

دہلی سے نکلنے کے بعد قائم نے ٹانڈہ کا رُخ کیا اور ٹانڈہ کے نواب محمد یار خاں امیرؔ سے وابستہ ہو گئے۔ سوداؔ بھی اس وقت ٹانڈہ میں ہی موجود تھے۔ کچھ عرصے بعد جب وہاں کے بھی حالات خوش گوار نہ رہے تو انھیں ٹانڈہ کو بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد رام پور چلے گئے اور نواب فیض اللہ کے دربار میں ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد وہ لکھنؤ چلے گئے، لکھنؤ سے واپسی کے دوران اپنے وطن چاند پور ہوتے ہوئے رام پور آ گئے جہاں ان کا ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) میں انتقال ہو گیا۔ جرأت نے تاریخ وفات کہی:

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات یکتائی کے ساتھ   قائمؔ بنیاد شعر ہندی نہ رہی کیا کہیے اب آہ!

۱۲۰۸=۱+۱۲۰۷

محمد یار خاں امیرؔ کے مقبرے کے پاس محلہ مدرسہ کہنہ میں دفن ہوئے۔ قائم کی قبر مقبرے کے مغربی حصے میں ملا حسن فرنگی محل کی قبر سے تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر موجود مسجد و مدرسہ سعیدیہ کی دیوار کے برابر پختہ لیکن زمین سے کافی نیچے ہے۔ ایک زمانے تک کوڑا پڑنے سے قبر کا نشان باقی نہیں ہے۔

قائمؔ کے آبا و اجداد نے سبزوار سے ہندوستان آ کر چاند پور میں رہائش اختیار کی۔ جناب حکیم کوثرؔ چاند پوری اس طرح رقم طراز ہیں:

''محمد ہاشم مذہباً اثنا عشری تھے۔ قائمؔ بھی ابتدا میں اسی مسلک سے وابستہ رہے۔ آخر میں شاہ ضیاء اللہ صاحب سے حسن عقیدت پیدا ہو گیا تھا اور عقائد میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، لیکن قائمؔ کے بعض ظریفانہ اور شاعرانہ مقولے جو بزرگوں سے سنے گئے اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ آزاد منش صوفی تھے اور ظاہری رسوم کے زیادہ پابند نہیں تھے۔ لکھوری اینٹوں سے بنا ہوا یہ مکان اب بھی اسی حالت میں ہے۔ مولوی شاہد حسن اسی میں رہتے ہیں۔ قائمؔ کی یادگار ایک کنوان بھی

ہے جوانھوں نے شاہ ضیاء اللہ کے ارشاد پر کھدوایا تھا۔''(آجکل، جون ۱۹۹۲بحوالہ قائم چاندپوری حیات وخدمات، مرتبہ شاہد ماہلی)

قائمؔ نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جس کا نام''مخزنِ نکات'' ہے۔ یہ تذکرہ اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔اس تذکرے کی مقبولیت کا مقام یہ ہے کہ اسپرنگر نے اسے ہندوستانی ادب کی ابتدائی تاریخ کی سب سے زیادہ قیمتی تصنیف کہا ہے۔امتیاز علی خاں عرشی کا خیال ہے:

''قائم نے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا۔اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۴ء ملتی ہے۔اس وقت اردو گوشعرا کا کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳۔۵۴) میں احمد شاہ کے معزول ہو جانے اور عالم گیر ثانی کے تخت نشین ہونے کے بعد اس بیاض نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام''مخزنِ نکات'' رکھا جس سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔اس تاریخ کے بعد بھی اس تذکرے میں جا بجائی کا سلسلہ ۱۱۷۶ھ(۱۷۶۲ء) تک جاری رہا۔کتاب کا دیباچہ بجز نام کے، آغاز تصنیف بیاض کے وقت کا ہے اور خاتمہ جس میں مصنف نے انقلاب سلطنت کا ذکر کیا ہے، ۱۱۶۸ھ کا لکھا معلوم ہوتا ہے۔''(دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی عرشی، ص ۵۹، بحوالہ قائمؔ چاند پوری از خالد علوی، ص ۱۷۱)

''مخزنِ نکات'' اردو کا سب سے قدیم (آغاز ہونے والا) تذکرہ ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کو پورا ہونے میں تاخیر ہوگئی۔قائمؔ نے جب اس تذکرے کی شروعات کی تھی تو اس وقت تک کسی دوسرے اردو کے تذکرے کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔قائمؔ نے مخزنِ نکات کے دیباچے میں اس بات کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ''مخزنِ نکات'' شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔اس سے پہلے کسی نے ریختہ گویانِ ہند کا تذکرہ نہیں لکھا ہے۔چونکہ عرشی صاحب کے بقول، قائمؔ نے اپنے تذکرے کا دیباچہ تذکرے کے آغاز کے وقت ہی لکھ لیا تھا اس لیے قائمؔ کا اولیت کا دعویٰ بے جا نہیں ہے۔

میرؔ کے تذکرے کے مقابلے میں قائمؔ کے یہاں ذہن کی تیزی تو نہیں ہے لیکن غیر جانبداری ضرور نظر آتی ہے۔قائمؔ نے اپنے تذکرے میں نہ تو کسی کی بے جا تعریف کی ہے اور نہ ہی مخالفین کی پگڑی اچھالی ہے۔دوسری طرف میرؔ کے یہاں یہ ساری باتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔اس بنیاد پر ہم یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قائمؔ کا تذکرہ میرؔ کے تذکرے کا ہم عصر تو ضرور ہے مگر ہم مزاج قطعی نہیں ہے۔

عہد زرّیں کے شاعروں میں بے شک میرؔ و سوداؔ کا مقام سب سے بلند ہے لیکن اس زمانے کی پوری تصویر ان کے ہم عصر شعرا دردؔ، قائمؔ، مصحفیؔ، میر حسنؔ اور نظیرؔ کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ان میں سے قائمؔ کی شاعری کا قصّہ سب سے الگ ہے۔وہ اپنے دور کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اس دور سے آگے کے بھی شاعر ہیں۔ شاید اسی لیے قائمؔ صرف تذکروں کی زینت نہیں ہیں بلکہ ان کے ہم عصروں نے بھی ان کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔مرزا سوداؔ اور میر دردؔ سے تو ان کے روابط تھے ہی، میرؔ، مصحفیؔ اور میر حسنؔ نے بھی قائمؔ کی خوش فکری کو

سراہا ہے۔ایک اہم بات یہ ہے کہ قائمؔ کا دور ختم ہونے کے بعد، ان کی قدر شناشی میں اضافہ ہوا ہے کیوں کہ بیسویں صدی کے شاعر بالخصوص فراقؔ، جون ایلیا اور ناصر کاظمی کی غزل کے مزاج اور آہنگ کی سطح پر، اس عہد میں قائمؔ کی شاعری نئے سرے سے توجہ کا مرکز بنی ہے۔اس بنا پر ان کی حیثیت''استاذ الشعرا'' کی ہوجاتی ہے۔اپنی کم گوئی کے باوجود قائمؔ کی غزل نے اپنے بعد کی روایت پر جو اثرات مرتب کیے ہیں ان کا سلسلہ نو کلاسیکی غزل سے لے کر نئی غزل تک پھیلا ہوا ہے۔آخر میں چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں:

نہ دل بھرا ہے، نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھو جو روئے تھے، خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

قائمؔ اس باغ میں بلبل تو بہت ہیں لیکن
دل کھلے نالہ سے جس کے وہ ہم آواز کہاں

حالِ دل صبح و شام کیا کہیے
ایک قصّہ مدام کیا کہیے

کر بھروسہ مرا نہ تو قائم
صبح کے وقت کا چراغ ہوں میں

دردؔ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں
کہیے ہم اعتبار کرتے ہیں

رو برو میرے غیر سے تو ملے
یہ ستم تو سہا نہیں جاتا

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی بتنگ
کن نے میرے مزار پر لا کر چڑھائے گل

سیکھے ہو کس سے سچ کہو پیارے یہ چال ڈھال
تم اک طرف چلو ہو تو تلوار اک طرف

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کھا
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

آہ اے مرغِ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ شیخ
گل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر، باغباں نے کیا کہا

☆☆☆☆☆

Reyaz Ahmad
Research Scholar, Dept. of Urdu,
Banaras Hindu Universuty Varanasi,
Mob. 8115415393,
E-Mail: vnsreyaj@rediffmail.com

اقبال کی شاعری کے رموز

آصف علی صفوی

اقبال ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب مشرق ومغرب میں زندگی اوراس کے مختلف شعبوں میں عجیب وغریب انقلاب رونما ہورہا تھا۔مشرق کی جہاں ستانیاں ختم ہو چکی تھیں اور مغرب کی سیاسی فتحمندیوں کے قدم بقدم ذہن وفکر کی فتوحات کا سلسلہ بھی بیٹھ رہا تھا۔ہر شعبۂ حیات میں مغرب کی تقلید فرض عین بن گئی تھی۔مشرق کی اس بے چارگی نے اقبال کے نہاں خانہ دماغ میں خیالات کی ایک نئی بستی کی بنیاد رکھی جس میں مشرق و مغرب کے افکار کے آزادانہ مقابلے اور موازنے کی آمیزش تھی۔وہ مسلمانوں کے زوال پر پیچ وتاب کھاتے ہیں۔اورانھیں جوش دلاتے ہیں کہ اپنی گئی گذری ہوئی حالت کو سدھاریں۔اقبال نے اپنے شعری سفر کی شروعات میں داغ اور امیر مینائی کو چند دنوں تک اپنا آئیڈیل بنایا۔لیکن ان کی طبیعت میں دراکی و بیباکی تھی اوران کی فکر جذبات کی ان لہروں سے آگے جانا چاہتی تھی لہٰذا یہ وابستگی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔اقبال نے اردو شاعری میں فکر کے زاویوں ہی کو نہیں بدلا بلکہ اس کو نئی وسعتیں بھی عطا کیں۔ان کی شاعری نہ صرف یہ کہ مشرقی تہذیب اور طرز احساس کے معیار کی علامت ہے بلکہ اپنے زمانہ کے شعور کی ترجمانی کا جو کام اس شاعری نے انجام دیا اس کی کوئی مثال ہمیں اپنی روایت میں نہیں ملتی۔اقبال کی شاعری،شاعری سے بلند تر کوئی اور چیز ہے۔ان کی شاعری وہ دوراہا ہے جہاں ایک نقطے پر پابندی اور آزادی دونوں متصل ہوئے ہیں۔وہ بیسویں صدی کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں نئے انسان کے ذہنی،سماجی،اخلاقی اور روحانی مسائل کا احساس ملتا ہے،ساتھ ہی ساتھ اقبال کا رشتہ اپنی شعری روایت سے بھی مضبوط اور مستحکم ہے۔وزیر آغا نے اقبال کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری میں فرد کے داخلی ہیجانات اور اس کے انفرادی اور سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے،،(۱)

اس سلسلہ میں صلاح الدین احمد کا خیال بھی توجہ طلب ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کی شاعری کا آغاز عالم سکون میں ہوا تھا۔اس لیے لازم تھا کہ ابتدائی دور میں وہی عناصر فروغ پائیں جو شاعر کی فطرت کے ساتھ خلق کیے گئے ہیں۔یہاں ہمیں شاعر کی ان تخلیقات سے بحث نہیں جو خالصتاً اس کی داخلی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں یا جن کے مظاہر نے عالم رنگ و بو سے مختلف انفرادی صورتیں اختیار کرلیں۔بلکہ ہمیں صرف اس کی ان تخلیقات سے غرض ہے جنھیں اس کے بنیادی جذبات نے اجتماعی محبت کا جامہ پہنایا۔اس انداز نظر سے جب ہم اقبال کی

ابتدائی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو قدرت اور عورت کے حسن کی پرستش کے بعد جو جذبہ ہمیں سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ وطن کی پرستش ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شاعر کی جبلت میں اس جذبہ کی تخلیق اور فروغ دونوں ایک فطری اور وہبی حیثیت رکھتے ہیں،،(۲)

اقبال نے شعر کو ایک ایسا لب و لہجہ عطا کیا جو اردو اور فارسی شاعری میں کہیں اور نہیں ملتا۔معلوم و معروف بحروں میں جب اقبال شعر کہتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی بحر ہے۔ان کی شاعری میں ایک ایسا تموج ہے جو پڑھتے پڑھتے خون میں درآتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسی قوت کے نرغے میں ہیں جس سے آپ نہ نکل سکتے ہیں نہ نکلنا چاہتے ہیں۔ان کی شاعری قوت ونشاط کا ایک ایسا مربوط تاثر پیدا کرتی ہے جو کسی اور شاعر میں مشکل سے نظر آتا ہے۔اس لحاظ سے اقبال بے حد منفرد ہیں،نہ ان کے پہلے اس کا انداز کہیں ہے اور نہ ان کے بعد۔بحیثیت فنکار اقبال نے اپنے تصورات اور خیالات کو اتنے فنکارانہ انداز میں اور لفظوں کے موزوں قالب میں پیش کیا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کی روح کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں۔اقبال اس شعری روایت کے امین تھے جہاں شاعری کو روح پیغمبری سمجھا جاتا تھا۔یہاں شاعری سے مراد وہ اعلیٰ شاعری ہی تھی جو فلسفہ اور مذہب سے ہم آہنگ ہوکر تصور انسان،کائنات اور خدا کے باہمی ارتباط کو اپنا موضوع بناتی ہے۔کلام اقبال ہمیں ایک نئی زندگی دینے کا بھرپور سامان فراہم کرتا ہے۔اگرچہ اپنی شاعری کا آغاز انھوں نے غزل سے کیا لیکن بعد میں ایک مدت تک فقط نظم ان کی توجہ کا مرکز رہی۔اقبال کو کسی خاص صنف سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی خاص صنف میں طبع آزمائی کی کوشش کرتے تھے،وہ کسی بھی صنف کا تعین محض اپنے فکری مقاصد کے پیش نظر کرتے تھے۔انھیں نظم کی کسی خاص ہیئت سے سروکار نہ تھا بلکہ وہ اپنے افکار کے ابلاغ کے لیے بعض اوقات مروجہ اصناف میں تصرف سے بھی کام لیتے رہے۔اقبال کی شاعری آفاقی صداقتوں سے سروکار رکھتی ہے اور تاریخ کی بہ نسبت زیادہ موثر انداز میں فلسفیانہ اسلوب کو سامنے لاتی ہے۔

اقبال نے مقصد،دلچسپی اور دردمندی کو اس طرح یکجا کردیا کہ ان کی شاعری جہد وعمل کی نقیب بن گئی۔انھوں نے یقین کو شعار بناتے ہوئے شعر وادب کے وسیلے سے ادب کو وسیع معنی عطا کیے۔ان کی شاعری،زندگی کے بارے میں ارفع شعور عطا کرتی ہے اور بے یقینی کی مسموم فضا کو ختم کر کے یقین کی برکات سے آشنا کرتی ہے۔وہ قدامت پسندی کے خلاف تھے۔وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار،نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جانے کا باعث ہے،یہی قدامت پسندی ہے۔رشید احمد صدیقی اردو شاعری کی پوری تاریخ میں اقبال کو سب سے زیادہ صاحب علم و دانش انسان سمجھتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''اقبال سے پہلے کوئی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے قوموں کی تقدیر اور انسانیت کے تقاضوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہو جتنا اقبال نے۔وہ ہمارے تمام شعرا سے زیادہ لکھے پڑھے شاعر تھے۔ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا علوم وفنون کا ہی نہیں،یزداں،انسان،شیطان سبھی کا۔ان کی نظر میں وہ تمام تہلکے اور تحریکیں تھیں جن سے زندگی دوچار تھی اور انسانیت معرض خطر میں۔ایسے وقت میں یا

تو پیغمبر پیدا ہوتے ہیں یا شاعر،،(۳)

اقبال کی شاعری کی خاصیت یہ ہے کہ وہ محض خیالی اور خواب آور ترانوں کی لن ترانی نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں ایک خاص قسم کی تعمیری اور انسانیت ساز سوچ اور فکر کا پتہ چلتا ہے۔اقبال کی اردو شاعری میں نظم، غزل، رباعی، قصیدہ، مثنوی، گیت اور مرثیہ وغیرہ ہر طرح کی اصناف سخن شامل ہیں۔موضوع کے اعتبار سے ان کی شاعری میں قومی شاعری بھی ہے اور وطنی اور ملی شاعری بھی۔فلسفیانہ رنگ بھی ہے اور اصلاحی ڈھنگ بھی۔ مگران سب کا ماحصل انسانی وتہذیبی اقدار رہی ہیں۔بقول پروفیسر سراج الدین:

''اقبال دراصل اس ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی پیداوار تھے جس کا آغاز انیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ہوا۔اس نشاۃ ثانیہ کے قائدوں میں وویکانند، سوامی دیانند سرسوتی، تلک، ٹیگور اور جیمنی رائے جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ان لوگوں کا نصب العین اپنے تاریخی وتہذیبی رشتوں کی دریافت اور ماضی کی بازیافت تھا۔ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی تہذیب اور فلسفے کی مغربی علم وادب کی روشنی میں نئی تفسیر کے متلاشی تھے۔یعنی اپنی روحانی اور تہذبی اقدار کی دریافت و بازیافت۔اگر انھوں نے اپنے سارے روحانی وتہذیبی رشتے اسلام اور اس کی تعلیمات میں پائے تو ان کو کس طرح قصوروار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔انھوں نے اپنی ذات کے ساتھ وہی ایمانداری برتی جو ٹیگور نے ''گیتانجلی،، لکھتے وقت اپنے ساتھ برتی،،(۴)

ان کے لہجے میں خطابت کی گونج سنائی دیتی ہے۔وہ پوری دنیا کے انسانوں سے ہر ہر قدم پر خطاب کرتے ہیں کیونکہ وہ ساری دنیا کو اپنا وطن قرار دیتے تھے اور عالم بشریت کو ایک ملت گردانتے تھے۔وہ روشن فکر اور بلند پایہ شاعر اور فلسفی تھے۔ان کے بیانات بالکل سپاٹ نہیں ہوتے بلکہ ان میں تہ داری کے سبب فکر میں ارتعاش پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔جو ایک خاص قسم کی فضابندی کرتی ہے۔

ایک مفکر اور فلسفی ہونے کے ناطے ان کے یہاں اس لہجہ کی نمود کثرت سے ہوئی ہے۔ان کے حکیمانہ لہجے میں داخلی جذبات واحساسات اور پیغام آفرینی کے تقاضوں نے اس قدر رنگ بھر دیئے ہیں کہ اس ایک لحن میں بھی حد درجہ تنوع پیدا ہو گیا ہے۔اقبال جب زبان کھولتے ہیں تو ہمیں خود بخود احساس ہوتا ہے کہ ایک عظیم الشان شخصیت ہم سے مخاطب ہے۔اقبال نے اردو زبان کو ایک ایسا جلالی لہجہ عطا کیا ہے جس کی وجہ سے یہ زبان ہر طرح کے مفاہیم ادا کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔اس لب ولہجہ کی تشکیل میں ان کے مخصوص استعارات اور نظام علامات نے اصل کردار ادا کیا ہے۔ان کے اس اسلوبی کمال کا اعتراف شمیم حنفی نے اس انداز میں کیا ہے:

''فارسی کی نسبتاً نامانوس تراکیب اور قرآنی آیات یا عربی مرکبات کا بے تکلفانہ استعمال اور غزل کی سرگذشت میں کم وبیش ایک انہونے واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔فلسفہ، تہذیب، اور سماجی علوم کے مختلف شعبوں کی اصطلاحیں جو اقبال کی فکر سے گذر کر ان کے شاعرانہ وجدان تک آ گئی تھیں بال جبرئیل کی غزلوں میں جابہ جا بکھری ہوئی ہیں۔اقبال کی یہ کوشش غزل کے نقاد کے لیے

ایک نیا مسئلہ ہے۔اور اس سے ایک نئی بوطیقا کا تقاضہ کرتا ہے،،(۵)

اقبال کی تخلیقی بصیرت اور غیر معمولی دانشورانہ ذہنیت کا انکار ناممکن ہے۔وہ ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر اپنے دور کے علمی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی واقعات وحالات کے گہرے شعور سے متصف تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی آگہی پیدا کرتے ہوئے اس کی زمانی اور مکانی حد بندیوں کے اسیر نہ ہوئے بلکہ ایک آفاقی فکر ونظر پر محیط ہو گئے۔

حوالہ جات

(۱)اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ، شمیم حنفی، ص ۲
(۲)تصورات اقبال، مولانا صلاح الدین احمد، ص ۲۷۴
(۳)اقبالیات، اقبال اکیڈمی پاکستان، ص ۱۲۱
(۴)مطالعہ اقبال چند نئے زاویے، پروفیسر سراج الدین، ص ۶۔۵
(۵)اقبال کا حرف تمنا، ڈاکٹر شمیم حنفی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ص ۱۰۷

☆☆☆☆☆

Dr. Asif Ali
179/14 Amima Villa, Baroodkhana,
Golaganj Lucknow-226018,
Mob. 9838605279
Email: asifsafvi92@gmail.com

مشتاق احمد یوسفی: اردو طنز و مزاح کا یوسفِ لاثانی

اطہر حسین

مشتاق احمد یوسفی کا شمار اردو کے صف اول کے طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی زبان، ان کا اسلوب بالکل جداگانہ ہے۔ان کا ثانی کم از کم بیسویں صدی میں کوئی دوسرا مزاح نگار نظر نہیں آتا۔موجودہ دور میں اردو نثر کو جو فروغ حاصل ہوا ہے اس میں مزاح نگاری کو شگفتگی اور شائستگی، آرائش و زیبائش سے آراستہ کرنے کا کام مشتاق احمد یوسفی نے جس فنکارانہ مہارت، بصیرت و ذہانت سے انجام دیا ہے اس کے متعلق ہر بڑا فنکار و نقاد رطب اللسان ہے کہ یہ عہد مشتاق احمد یوسفی کا عہد ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے نظریے کے مطابق:

> "جدید نثر کے بے تاج بادشاہ مشتاق احمد یوسفی ہی قرار پاتے ہیں۔اردو نثر کو جو تہ داری، بلاغت، دردمندی اور کیفیت آفرینی کی قوت یوسفی کی تحریروں سے ملی اس کی نظیر کم سے کم اردو کی ادبی تاریخ میں موجود نہیں۔یوسفی کا قلم چاہے یوہنسا کے مار ڈالے اور چاہے تو عین اس وقت جب قہقہہ پوری طرح ختم بھی نہ ہوا ہو وہ موڑ دے کہ آنکھیں اشکبار ہو جائیں، دل درد سے دو نیم ہو کر رہ جائے۔یہ قدرت، قضا و قدر کے علاوہ کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی کو جو لوگ طنز نگار یا مزاح نگار کہہ کر ٹالنا چاہتے ہیں، وہ اردو نثر کے ساتھ ساتھ خود اپنے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں، کیوں کہ اس طنز یا مزاح کے پیچھے میں عصر حاضر کی ساری حسّیت اور دانشوری اس طرح سمٹ آئی ہے، جیسے الیسن اور برنارڈ شا کے طربیوں میں تنقید حیات، اور بڑی محرومی ہوگی اگر کوئی اس تہ داری اور خیال انگیز نثر کو محض قہقہہ خیز سمجھنے پر قناعت کر لے اور ہنسی ہنسی میں ٹال دے۔یہ ٹلنے والی نثر نہیں، یہ چپک جانے والی اور رگ و پے میں اتر جانے والی نثر ہے، یہ احساس سے پھوٹتی اور فکر و دانش کو اپنی گرفت میں لیتی چلی جاتی ہے۔یوسفی نے احساس کو نئی دھنک اور فکر کو نیا گداز ہی نہیں بخشا، اردو نثر کو ایک نیا انوکھا، منفرد، تیکھا، تہ دار اسلوب بھی بخشا۔میر تقی میؔر نے شاعری میں جس انداز کو ابہام کے بدلے شیوہ بیانی کے نام سے اختیار کیا تھا۔مشتاق احمد یوسفی نے یہ کارنامہ نثر میں کر دکھایا۔" (عصری ادب محمد حسن، شمارہ ۶۶ جنوری ۱۹۹۲)

پروفیسر محمد حسن نے بڑے ہی کھلے دل سے مشتاق احمد یوسفی کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔سب سے بڑی بات یہ کہ غالب اور برنارڈ شا کی ذکاوت و ندرت کے ساتھ ساتھ میر تقی میؔر نے جو کام شاعری میں کیا ہے، وہی کام مشتاق احمد یوسفی نے اردو نثر میں کر دکھایا۔یہ مشتاق احمد یوسفی کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ڈاکٹر محمد حسن نے ایک اور پہلو پر منصفانہ بات کی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی نثر اردو نثر کی معراج ہے، اس سے بڑھ کر اعزاز ایک نثر نگار اور ایک مزاح نگار کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔مزید لکھتے ہیں کہ اب ہم اردو مزح کو

عالمی مزاحیہ ادب کے روبرو فخر سے رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ فقط مزاحیہ نثر ہی نہیں بلکہ اس میں آگہی، بصیرت، فکر و دانش کے اوصاف پنہاں ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کا اسلوب ایک نئے اور منفرد ذائقے کا حامل ہے۔کیوں کہ ان کے مزاح میں صرف آگہی اور بصیرت ہی نہیں، اسلوب کی رمز شناسی اور تہ داری بھی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ان کی تحریر پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے اپنے انشائیوں پر برسوں محنت کی ہے۔الفاظ کی نشست، خیالات کی ترتیب، زبان کی نوک پلک پر اتنی توجہ دی ہے کہ لکھنے والے کی قلم سے پڑھنے والوں کی آنکھوں تک آتے آتے برسوں کا عرصہ بیت گیا ہے۔

> "صاحب طرز ادیب اور نثر نگار اردو میں اور بھی ہیں مثلاً خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، ابن انشا، قرۃ العین حیدر، وغیرہ مگر مشتاق احمد یوسفی ایک الگ مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔انھوں نے جو طرز ایجاد کی ہے، وہ اردو کے مروجہ اسالیب ہی کے بطن سے پھوٹی ہے۔مگر انھوں نے اسے منقلب کر کے ایک نیا رنگ روپ دے دیا اور یہی یوسفی کا کمال فن ہے۔انشا پردازی کی حیثیت سے فقرہ تراشنے، بات سے بات پیدا کرنے، شعر و ادب کے حوالوں سے نئے نقش و نگار بنانے اور قول محال یا دور بظاہر مختلف الابعاد اشیا میں تشبیہ کا علاقہ ڈھونڈنے میں رشید احمد صدیقی بہت چوکس نظر آتے ہیں، مگر اس ضمن میں بھی مشتاق احمد یوسفی ان سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔کسی خاص ادبی مرکز سے متعلق نہ ہونے کے باوجود یوسفی کو زبان اور اس کے تمام نئے اور پرانے اسالیب پر جیسا عبور حاصل ہے اور جس مہارت سے وہ اپنے مزاح پاروں میں زبان کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کا جواب اب تک طنزیہ و مزاحیہ ادب کی ساری تاریخ نہیں پیش کر سکی۔اس نے ان کو دور حاضر کا عہد ساز مزاح نگار بنا دیا ہے۔" (آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح، نامی انصاری)

نامی انصاری نے بالکل صحیح کہا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کا اسلوب اردو کے مروجہ اسالیب سے ہی پھوٹا ہے، مگر یہ ان کی صلاحیت ہے کہ اسی اسلوب میں ایک نیا رنگ و روپ بخشا، یہ مشتاق احمد یوسفی کی کامیابی ہے۔جس طرح غالب نے نثر کو زندگی بخشی، موجودہ دور میں مشتاق احمد یوسفی نے اردو نثر کو ایک بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا ہے۔یہاں نامی انصاری نے مشتاق احمد یوسفی کے مقام کو متعین کرتے ہوئے پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی پر ترجیح دیتے ہوئے ثبوت بھی پیش کیے ہیں اور درجہ بندی بھی کی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی اب تک پانچ تصانیف زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔انھوں نے اپنی تصانیف میں جن اصناف کا استعمال کیا ہے، وہ ہیئت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔مثلاً 'چراغ تلے' انشائیوں کا ایک مجموعہ ہے، "خاکم بدہن" میں انشائیہ اور خاکے ہیں 'زرگزشت' طنزیہ و مزاحیہ انداز میں لکھی ہوئی داستان زندگی ہے، جو سوانح عمری تو نہیں لیکن سوانح کے قریب تر ہے۔اسی طرح "آب گم' پر ایک

ناول کا گمان ہوتا ہے،لیکن مختلف اصناف میں لکھی گئی ان چاروں تصانیف میں طنز ومزاح کا رنگ غالب ہے۔ ان کی پانچویں اور آخری تصنیف "شام شعر یاراں " ہے۔ یہ ساری کتابیں اپنی تمام تر مزاحیہ چاشنی کے ساتھ اردو زبان وادب کے قارئین کو مسحور کیے ہوئے ہیں۔ یوسفی کا نام اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے بھی ہجرت کی کربناکیوں کو اپنی تصانیف میں اپنے تخلیقی شعور کے ذریعے طنزیہ ومزاحیہ ادب کا حصہ بنا دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں انشائیے، خاکے، آپ بیتی اور پیراڈی سب کچھ شامل ہیں اور ان سب میں طنز ومزاح کی وہ پرلطف روانی موجود ہے جن کو پڑھ کر مزاحیہ ادب کا ہر قاری مشتاق احمد یوسفی کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ان کی تصانیف میں سماج کی بدلتی قدروں اور ماضی کی یادوں، باتوں کا ایسا منظر نامہ موجود ہے جس سے مہاجرین کے حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کی کتابوں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اکثر اپنے آبائی وطن راجستھان کا بار بار ذکر کیا ہے۔ جب کبھی بھی کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو راجستھان سے اس کی نسبت جوڑ دیتے ہیں۔

''راجستھان کے راجپوتوں کا الٹا دستور ہے، اونٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کے انداز نشست کو دیکھ کر ایک میل دور سے بتلا سکتے ہیں کہ وہ سوار بہن ہے یا بیوی ہے۔ بہن کو راجپوت پٹھان ہمیشہ آگے بیٹھاتے ہیں تاکہ خدانخواستہ گر پڑے تو فوراً پتہ چل جائے، بیویوں کو پیچھے بیٹھاتے ہیں اور محبوبہ کو اغوا کے لیے دیسی گھوڑوں کا استعمال کرتے ہیں'' (زرگزشت، ص150)

انھوں نے اردو طنز ومزاح کو جو رفعت، عظمت و وقار عطا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ان کا اسلوب ایک نئے اور منفرد طرز کا حامل ہے۔ دراصل ان کے فن کی عظمتوں اور رفعتوں کا راز ان کے اسلوب وزبان پر کامل قدرت نیز انسانی زندگی کے گہرے مطالعے اور مشاہدات میں پنہاں ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے الفاظ وتراکیب ہی نہیں، محاورات، اشعار وافکار کی تحریف وتقلیب سے اسلوب میں ایک ایسی طرحداری اور دلکشی پیدا کی ہے جس سے قاری مسحور ومتحیر ہوجاتا ہے اور یہ تحیر فوراً ہی قہقہے یا مسکراہٹ میں تبدیل ہوکر قاری کے لیے انبساط اور ذہنی انشراح پیدا کرتا ہے۔ان کی تحریریں بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں اور ہر مرتبہ ان میں کچھ نئے گوشوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مظہر:

"جہاں تک مشتاق احمد یوسفی کے فن کا تعلق ہے تو یہ انکشاف بہت پہلے ہو چکا ہے کہ وہ موجودہ دور کے سب سے بڑے مزاح نگاروں میں سے ایک ہیں۔تقریباً تمام بڑے نقادوں نے ان کے ادبی مرتبے کو پہچانا ہے اور انھیں طنز ومزاح کے رمز شناس کی حیثیت دی ہے۔انھیں اردو کا برنارڈ شا بھی کہا گیا ہے اور موجودہ دور کو دور یوسفی سے منسوب کر کے ان کی پذیرائی کی گئی ہے۔"

"انھیں عہد جدید کا غالب بھی کہا گیا ہے۔ دراصل مشتاق احمد یوسفی کا طنز ومزاح ایک انٹلیکچول کا طنز ومزاح ہے۔غالب نے اردو شاعری کو دماغ عطا کیا اور اسے فلسفہ اور منطق کا ہم پلہ کر دیا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کا فن تفنن کے ساتھ تفکر کو ہم آہنگ کر کے شگوفہ ہائے نو بہ نو کھلانے کا

فن ہے۔ان کی یہ خوبی انھیں تمام ہم عصر مزاح نگاروں میں امتیاز بخشتی ہے۔(مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ، ڈاکٹر مظہر، 182۔185)

مشتاق احمد یوسفی کا تعلق جس عہد سے ہے اس میں کئی اہم شخصیتیں طنز ومزاح کے افق پر نمودار ہوئیں اور اپنے طرز فکر سے آراستہ کیا۔ بلاشبہ طنز ومزاح پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور ابن انشا جیسے زینے طے کرتا ہوا مشتاق احمد یوسفی تک پہنچا ہے اور یہ سفر ایک ارتقائی عمل سے گزر کر مشتاق احمد یوسفی تک پہنچا ہے۔ کسی بھی فنکار کی تخلیقات ہمیں اس کے فن اور اس کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں مگر ادبی تخلیقات سمجھنے کے لیے عام قاری کو ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت ضروری ہے۔اس کے لیے تنقیدی مضامین مددگار ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔تنقید ادب کے ان گوشوں کو اجاگر کرتی ہے، جنھیں سمجھنے سے ایک عام قاری قاصر رہتا ہے۔یعنی ایک عام قاری ادب سے وہ حظ نہیں اٹھا سکتا جو ایک تربیت یافتہ ذہن سمجھ سکتا ہے اور اردو کے قارئین کی بات ہی دیگر ہے وہ تو شاعری میں سوائے غزل کے، اور نثر میں سطحی ادب (افسانہ، ناول، داستان) کے عادی بن گئے ہیں۔ایسے قارئین مشتاق احمد یوسفی کو کیسے سمجھ سکتے ہیں، جسے زبان واسلوب میں لطافت، بلاغت، ذہانت اور حلاوت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ لفظوں کے صوتی اثرات، الفاظ کی محرف تراکیب سازی سے مزاح پیدا کرنے میں ید طولی حاصل ہے۔مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں مزاح نگاری کے نادر نمونے ہیں۔ یہاں فکر وفن کی ندرت اور افتاد طبع کی جدت اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔دیگر عظیم فنکار کی طرح مشتاق احمد یوسفی اپنے فن سے کہیں زیادہ واقف ہیں، مزاح کے جوہروں سے آشنا ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیق میں مزاح نگاری کے متعلق بڑی جامع پر مغز اور معنی خیز آرا کا اظہار کرتے ہوئے اردو مزاح کے باب میں جس قسم کی پیش رفت کی وہ قابل داد ہے۔انھوں نے اپنی مزاحیہ تحریر کو گہرائی اور وسعت وتہ داری کا خوگر بنا کر نئے افق پر کمندیں ڈالی ہیں۔انھوں نے طنز ومزاح کے فن اور اردو تاریخ کا ہی مطالعہ نہیں کیا بلکہ وہ عالمی معیار کے مزاح سے بھی بخوبی واقف ہیں۔مارک ٹوئن، اسٹیفن لیکاک اور سوئفٹ جیسے عالمی سطح کے مزاح نگاروں سے متاثر ہیں۔مزاح کے متعلق اگر مشتاق احمد یوسفی کے نظریات کا احاطہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مزاح بڑا نازک فن ہے۔

''بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلاوجہ چڑھتے ہیں، حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں، وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔'' (چراغ تلے پہلا پتھر، ص ۱۳)

''دنیا میں جتنی بھی لذیذ چیزیں ہیں، ان میں سے آدھی تو مولوی صاحبان نے حرام کر رکھی ہیں اور باقی ڈاکٹر صاحبان'' (شام شعر یاراں، 36)

''اب تم جس نظروں سے مرغیوں کو دیکھنے لگے ہو ایسی نظروں کے لیے تمہاری بیویاں برسوں سے ترس رہی ہیں'' (شام شعر یاراں، 36)

مذکورہ بالا اقتباس اور ایسے ہی دیگر اقتباسات کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کا مزاح ہر قسم

کے الجھاؤ، پیچیدگی اور ثقالت سے پاک ہے۔ان کے مزاح میں سادگی اور فطری پن کے ساتھ ہی بے ساختگی و برجستگی بھی ہوتی ہے۔کہیں مسکراہٹ کا احساس ہوتا ہے تو کہیں بلند بانگ قہقہوں کی آواز سنائی دیتی ہے،لیکن مشتاق احمد یوسفی کے مزاح کی نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ تضحیک و تحقیر اور کبیدگی و کدورت سے مبرا ہوتا ہے۔

''مشتاق احمد یوسفی کا کمال یہ ہے کہ ان کا مزاح اردو زبان اور اردو کلچر سے جڑا ہوا ہے۔مشتاق احمد یوسفی اپنی تحریر میں ایک لفظ بھی غیر ضروری استعمال نہیں کرتے اس لیے ان کی تحریر میں ایک ایسا رچاؤ ہے جو دوسرے مزاح نگاروں کے یہاں نظر نہیں آتا۔مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اردو زبان وادب پر گہرا عبور رکھتے ہیں بلکہ انگریزی زبان وادب کے علاوہ برصغیر کی کئی بولیوں کا بھی گہرا ادراک رکھتے ہیں۔'' (مجتبیٰ حسین، ماہنامہ کتاب نما، اکتوبر ۱۹۹۲)

صاحب قلم اور مزاح نگار کے یہ کلمات حقیقت پر مبنی ہیں۔مجتبیٰ حسین نے مشتاق احمد یوسفی کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کی فنکارانہ عظمت کا برملا اعتراف بھی کیا۔یوسفی کی تحریروں نے اردو کے مزاحیہ ادب کو وہ مقام عطا کیا جہاں سے اردو مزاح کسی بھی بڑی زبان کے مزاحیہ ادب سے آنکھ ملا کر بات کر سکے۔پھر ان کی ملاقات کو اعزاز سمجھنا یقیناً مشتاق احمد یوسفی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خراج عقیدت ہو سکتی ہے۔خاکم بدہن کے پیش لفظ ''دست زلیخا'' میں بھی انھوں نے مزاح نگاری کے بارے میں چند کلمات کہے ہیں۔

''مزاح نگار کے لیے نصیحت و فضیحت اور فرمائش حرام ہیں یا یوں تو مزاح مذہب اور الکحل ہر چیز میں آسانی سے مل جاتے ہیں بالخصوص اردو ادب میں،لیکن مزاح کے اپنے تقاضے اپنے ادب و آداب ہوتے ہیں۔شرط اوّل یہ ہے کہ برہمی، بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے۔مزاح نگار اس وقت تک تبسم زیر لب کا سزاوار نہیں جب تک اس نے دنیا اور اہل دنیا سے رچ کر پیار نہ کیا ہو۔ان کی بے مہری اور کم نگاہی سے ان کی سرخوشی و ہوشیاری سے،ان کی تردامنی اور تقدس سے۔ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گستاخ ضرور ہے مگر مشتاق و آرزومند بھی ہے۔'' (خاکم بدہن، پیش لفظ، دست زلیخا)

مزاح نگار کے نزدیک برہمی بیزاری کا ہونا مزاح کو پست اور سطحی بنا دیتا ہے۔کرید جو کدورت بن کر انسانی کمزوریوں کو عریاں کر دیتا ہے۔ایک اچھے مزاح نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ہمدردی ہو۔مشتاق احمد یوسفی کے نزدیک دنیا اور اہل دنیا سے پیار کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اسی شخص سے کچھ امید لگائی جاتی ہے جس سے ہمدردی کرتے ہوں اور جواب میں وہ بھی آپ سے پیار سے ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی طنز ہے وہاں مزاح ضرور پایا جاتا ہے، ورنہ اصلاح کی جگہ فسادات برپا ہوں گے۔مشتاق احمد یوسفی کے یہاں نہ نصیحت کا اسٹاک ہے اور نہ اصلاح معاشرہ کا دعویٰ۔اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ مزاح نگار کے لیے ناصح ہونا مناسب نہیں۔وہ زندگی کی تلخیوں کا شناسا تو ہوتا ہی ہے، مگر ان تلخ حقیقتوں اور اپنے درمیان قہقہوں کی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔یعنی وہ ہنسی میں ان کمیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ہماری شعری دنیا کی طرح اس میں بھی رمز و ایجاز کی کیفیت ہوتی ہے، اس کا وار براہ راست نہیں ہوتا، اس لیے قارئین و سامعین کے لیے

اوّل وقت میں بات کی گہرائی تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔مزاح کی یہ میٹھی مار بھی کبھی خالی نہیں ہوتی۔

''میرا عقیدہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ پر جی کھول کر ہنس سکتی ہے وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتی'' (چراغ تلے، ص ۱۵)

مشتاق احمد یوسفی نے بہت سارے حربوں سے مزاح پیدا کیا ہے۔اشعار، الفاظ اور جملوں کی تحریف، کرداروں کی گفتگو اور کرداروں کے فلسفوں، واقعوں، صنائع و بدائع کے استعمال سے مزاح پیدا کیا ہے۔غرض کہ بہت سارے حربے ہیں جن سے یوسفی نے مزاح پیدا کیا ہے۔یہاں اختصار کے ساتھ چند حربوں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں تا کہ یوسفی کی مزاح نگاری کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔مشتاق احمد یوسفی نے مزاح کی تخلیق کے لیے بلاغت کے اجزائے تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کی تحریروں میں مزاح بھی ادبی شان کا حامل ہو گیا ہے۔ادب اور مزاح کا یہ سنگم یوسفی کا خاصہ بن چکا ہے۔انھوں نے سب سے زیادہ تشبیہ سے کام لیا ہے۔وہ دو بالکل ہی متضاد چیزوں یا کیفیتوں میں معمولی سی مماثلت کی بنا پر ایک دوسرے کو مشابہ بنا کر مزاح پیدا کرتے ہیں:

''ہماری شادی تو اس طرح ہوئی جیسے لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔اچانک بغیر مرضی کے'' (شام شعر یاراں)

''یہ پھل مقفیٰ و مسجع نثر کی مانند ہوتا ہے۔گودا نہ ہونے کے برابر۔اس کی خاطر دیر تلک بیجوں کو پپولتے اور چچوڑتے رہیے'' (شام شعر یاراں)

''آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا'' (آب گم)

''چال جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی۔پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی'' (خاکم بدہن)

''لیکن یہ لکھنو کا مشاعرہ نہیں۔ملازمت کا انٹرویو تھا'' (زرگزشت)

کبھی کبھی تو اعداد اور ہندسوں سے کافی دلچسپ مثالیں دیتے ہیں۔

''ایک دن میں اپنے دائیں ہاتھ کو ۲/ کے ہندسے کے مانند استادہ کیے، ہتھیلی پر تھوڑی رکھے کچھ دل گرفتہ سا، کچھ سوچ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا'' (شام شعر یاراں)

''وہ یوں کہ کراچی میں وہ دوپٹے کو چادر کی طرح اوڑھتی ہے پھر اس چادر کو اپنے اوپر اس ہنرمندی سے تانتی ہے کہ دور سے اردو کی ۸ کی شکل کی چھولدار (چھوٹا تکونا خیمہ) نظر آتا ہے'' (شام شعر یاراں)

ان تمام مثالوں سے مشتاق احمد یوسفی کی ذہانت، باریک بینی، گہرے مطالعے اور مشاہدے کا اندازہ ہوتا ہے۔کہنے کو تو صرف چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، مگر اپنے اندر معنی کا بحر لیے ہوئے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی کے متعلق محمود ایاز لکھتے ہیں:

''یوسفی کے قلم میں وہ قوت ہے، ان کا مشاہدہ اتنا گہرا اور دور رس ہے، حالات اور واقعات سے چیزوں سے بلند ہو کر، انھیں ایک فاصلے سے دیکھ سکنے کی ایک ایسی زبردست صلاحیت ان میں موجود ہے۔انسانی فطرت کے روشن اور تاریک پہلوؤں اور ان کے عمیق ترین

گوشوں تک ان کی رسائی ایسی ہے کہ وہ جم کے بیٹھ جائیں تو اردو کا ایسا ناول دے سکتے ہیں جو ابھی تک قرۃ العین حیدر نہیں دے پائیں''۔(سوغات تیسرا دور، شمارہ نمبر ۲، صفحہ نمبر ۹ محمود ایاز)

اردو کے مزاحیہ ادب میں سب سے بڑا ہتھیار زبان ہے، جس کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کو زبان کے شگوفے کھلانے کا ہنر معلوم ہے، ان کے جملے حاضر جوابی اور فلسفیانہ استدلال کے حامل ہوتے ہیں۔ بات کو مختصر اور جامع کہنے کی غرض سے انھوں نے چھوٹے چھوٹے جملے وضع کیے ہیں جن کو موقع و محل کے اعتبار سے استعمال کرتے رہتے ہیں جن کو مزاحیہ ادب میں اقوال یوسفی یا فلسفہ یوسفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج مشتاق احمد یوسفی مزاحیہ ادب کا معیار ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اقوال:

آج تک سوائے انسان کے کسی ذی روح نے اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر خودکشی نہیں کی۔(چراغ تلے)

گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور اس کی بات سے لگایا جا سکتا ہے۔(چراغ تلے)

مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔(خاکم بدہن)

مزاح مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حاصل ہو جاتے ہیں۔(خاکم بدہن)

عورت کی ایڑی ہٹاؤ تو اس کے نیچے سے کسی نہ کسی مرد کی ناک ضرور نکلے گی۔(زرگزشت)

عورت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے مرد، جو بیک وقت اس کا بہترین دوست اور بدترین دشمن ہے۔(شام شعر یاراں)

لندن کے فلیٹوں کے زینے اتنے تنگ ہیں کہ آدمی خود کو زینے کے ناکے میں پرو کر چڑھتا اترتا ہے۔ دوسرے کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی عورت نیچے آ رہی ہو اور اسی وقت نیچے سے مرد اوپر جا رہا ہو تو درمیان میں نکاح کے سوا کوئی مہذب صورت نظر نہیں آتی۔(شام شعر یاراں)

غرض یہ کہ مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آب گم، شام شعر یاراں ایسے اقوال اور فلسفوں سے بھری پڑی ہیں۔ ہر صفحے پر اس کی مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ مشتاق احمد یوسفی نے کرداروں کی زبانی اور کبھی بزبان خود اس کا استعمال کیا ہے، جس سے ان کی زبان دانی اور جملہ علوم پر گہری دسترس کا علم ہوتا ہے۔ جس کا ثبوت ڈاکٹر مظہر کی ترتیب کردہ تصنیف ''اقوال یوسفی'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ یوسفی صاحب کا ہر قول نفسیاتی طور پر سچ اور معنی کا طلسم لیے ہوئے ہے۔ جو ان کی تصانیف میں مزاحیہ عنصر پیدا کرنے کا ایک اہم حربہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی ایک الگ پہچان ہے۔

یوسفی کا ایک اہم حربہ پیراڈیوں کا برمحل استعمال ہے، جو ان کی کسی ایک تخلیق میں نہیں بلکہ ہر ایک میں کثرت سے برتا گیا ہے۔ جس کے اظہار کے لیے انھوں نے اشعار، محاورے، ضرب الامثال اور مصرعوں سے مدد لی ہے۔ یہ بھی کمال فن یوسفی ہے کہ وہ خاص و عام اشعار، مصرعوں میں صرف ایک حرف، لفظ، حرکت اور نقطے بدل کر اسے مزاح کی بھرپور کیفیت کا حامل بنا دیتے ہیں، جب تک اس پر غور نہ کیا جائے اصل بات سمجھ میں نہیں آتی اور جب سمجھ میں آ جائے تو قاری خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ انھوں نے اقبالؔ، غالبؔ، میرؔ جیسے بڑے شعرا

کے کلام کی محرف سازی کی ہے، کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اصل شعر اسی مقام کے لیے وضع کیا گیا تھا، یعنی ان کی پیراڈی بسا اوقات بیت الغزل کا درجہ رکھتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

غزل کھا گئی نوجواں کیسے کیسے

☆☆☆

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری سزا کیا ہے

☆☆☆

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

☆☆☆

ایسا بھی کوئی ہے کہ برا جس کو سب کہیں

☆☆☆

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے قینچی کے سوا

☆☆☆

وہ انتظار تھا جس کا وہ یہ شجر تو نہیں

☆☆☆

اب تو گھبرا کے وہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے

☆☆☆

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ان تمام مصرعوں سے یوسفی کی اشعار فہمی اور زبان دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے صرف اشعار اور مصرعوں میں ہی نہیں بلکہ جملوں، الفاظ، تراکیب، ضرب الامثال، کہاوتوں وغیرہ میں اپنی تحریف و تصرف سے مزاح پیدا کیا اور قارئین کو مسرّت بخشی ساتھ ہی مزاح نگاری کے باب میں ایک نئی روایت کی بھی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو کچھ لمحے کے لیے غموں سے چھٹکارے کا سامان فراہم کیا۔ مجموعی طور پر مشتاق احمد یوسفی ایک کامیاب مزاح نگار ہیں اور مزاح پیدا کرنے کے لیے انھوں نے بہت سارے حربوں کا استعمال کیا ہے، جس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے یوسف لاثانی ہی نہیں، شہنشاہ طنز و مزاح بھی ہیں۔

☆☆☆☆☆

Athar Husain
Research Scholar, Dept. of Urdu,
MANU University, Hyderabad,
Mob. 9700846616,
E-Mail: arkhannadwi143@gmail.com

عصمت چغتائی......ایک تاثر

ظہیر حسن ظہیرؔ

بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہی اُردو میں تانیثی ادب کی تخلیق کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔اس دور میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد ''تہذیبِ نسواں'' اور ''نیرنگِ خیال'' میں خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ان میں عظمت النسا، سیدہ فضل فاطمہ، رضیہ ناصرہ، شریمتی یشودا دیوی اور شیورانی دیوی وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔

اس دور کی دو اہم خواتین افسانہ نگار ایسی ہیں جن کے ذکر کے بغیر افسانہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ان میں نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی تاج کا نام سرِ فہرست ہے۔نذر سجاد حیدر نے رومانی قسم کے افسانے لکھے لیکن حجاب امتیاز علی تاج نے اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے افسانہ نگاری کو نیا موڑ دینے کی کامیاب کوشش کی اور رشید جہاں تک آتے آتے اس کا کینوس اور وسیع ہوگیا۔رشید جہاں پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کیا۔انھوں نے بے بس و مجبور لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور عہدِ عصمت چغتائی میں افسانہ نگاری کی فضا یکسر بدل گئی۔اسی دور میں افسانوں کے مجموعے ''انگارے'' کی اشاعت ہوئی، انھوں نے اس کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا، وہ اس سے بے حد متاثر ہوئیں اور ایک سماجی حقیقت نگار کے طور پر ابھریں۔حالانکہ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں پر رومانیت غالب ہے لیکن جلد ہی وہ رومان و تخیل کی وادی سے باہر آ گئیں۔

عصمت بچپن سے ہی ذہین اور حساس طبع واقع ہوئی تھیں۔ان کی حساسیت انھیں ہمہ وقت بے چین رکھتی تھی۔انھیں سماجی رسوم و قیود بالکل پسند نہ تھے، وہ ہر جگہ نمایاں رہنا چاہتی تھیں۔ان کا بچپن بھی بڑے آزادانہ ماحول میں گزرا۔فطرت نے عصمت کو باغیانہ ذہن عطا کیا تھا۔یہی باغیانہ ذہن عصمت کی پہچان بنا۔انھوں نے نہ صرف اپنے گھر اور خاندان والوں سے بغاوت کی بلکہ اس سماج سے بھی بغاوت کی جس میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔کسی بھی ادیب کا اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر ہونا فطری ہے چنانچہ عصمت بھی اپنے عہد کے سماجی معاملات و مسائل سے متاثر ہوئیں اور جو کچھ اپنے آس پاس دیکھا محسوس کیا اسے لفظوں کے وسیلے سے کہانیوں کی شکل میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی۔ان کے اس باغیانہ رویّے نے پورے اُردو ادب میں ہلچل پیدا کردی۔لیکن انھوں نے نتیجے کی پرواہ کیے بغیر وہ سب کچھ لکھا جو ان کے ہم عصر افسانہ نگار نہ لکھ سکے۔ایک بے باک اور سچے فن کار کی یہ خوبی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے ہی اپنے فن میں پیش کرنے کی کاوش کرتا ہے خواہ دنیا اسے تسلیم کرے یا نہ کرے۔اس ضمن میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''لکھیے ضرور، جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں وہ ضرور لکھیے۔نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے ڈریئے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا''۔(یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے، عصمت چغتائی، مطبوعہ (خصوصی شمارہ ''اردو دنیا'' اگست ۲۰۱۵،ص:۴۳)

عصمت نے ادب کی مختلف اصناف مثلاً رپورتاژ، خاکہ، ڈرامہ وغیرہ میں کامیاب تجربے کیے لیکن ان کے اصل جوہر افسانے اور ناول میں ہی ظاہر ہوئے ہیں۔انھوں نے جن اصناف ادب میں تجربے کیے ان میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہیں۔عصمت نے اپنی تحریروں میں جاگیردارانہ کلچر اور سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑے ہوئے انسانوں کو موضوع بنایا ہے۔ایک طرف انگریز ہندوستانیوں پر ظلم کررہے تھے تو دوسری طرف ہندوستانی خود ہندوستانیوں پر ظلم کر رہے تھے۔کمزوروں، مزدوروں اور گھریلو عورتوں پر ظلم وستم جاری تھا۔اس جاگیردارانہ کلچر میں مردوں کی بالادستی قائم تھی۔چنانچہ ان کا شعور جب بالغ ہوا تو انھوں نے گھر کی چہار دیواری کے اندر ہورہی ظلم و زیادتی دیکھی اور اسے اپنے افسانوں کے ذریعہ اُجاگر کیا۔وہ اس نظام کو جس میں عورت محکومی اور غلامی کی زندگی گزار رہی تھی اور مرد آزادانہ طور پر رنگ رلیاں منا رہے تھے، نیست و نابود کردینا چاہتی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ اگر مردوں کو آزادانہ طور پر زندگی گزارنے کا اختیار حاصل ہے تو عورتوں کو بھی اپنے حدود میں رہ کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔کیونکہ عورت بھی اسی سماج کا ایک حصہ ہے۔اپنے دلی درد و کرب کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہیں:

''جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں وہ لڑکیوں کو کب پسند آ سکتا۔مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے''۔(یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے، عصمت چغتائی، مطبوعہ (خصوصی شمارہ ''اردو دنیا'' اگست ۲۰۱۵،ص:۴۳)

عصمت کے یہاں جو حقیقت پسندانہ رویہ ملتا ہے وہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ترقی پسند تحریک کا جو مینوفیسٹو تھا وہ اس سے بے حد متاثر ہوئیں اور اپنے افسانوں اور ناولوں کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہیں۔جو باتیں دنیا کی نظروں سے اب تک پوشیدہ تھیں عصمت نے انھیں عام کردیا جس کے سبب ادب میں کہرام مچ گیا۔ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے لیکن ان کی جرأت و بے باکی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ان کی تحریروں میں صرف عریانیت نہیں تھی بلکہ اس میں اصلاح کا پہلو بھی پوشیدہ تھا مگر لوگوں کی نظریں اس کو نہ دیکھ سکیں۔وہ ایک جگہ لکھتی ہیں :

''چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور ان کے دل و دماغ پر نقش کرگئی۔باقی باتیں مطلب کی معلوم نہ ہوئیں لہٰذا نظرانداز کردیں، مگر عریاں جملے یقیناً سو سو بار رٹے، ذرا غور کیجیے عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں اور لکھنے والا برا''۔(یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے، عصمت چغتائی، مطبوعہ ماہنامہ ''اردو دنیا'' خصوصی شمارہ اگست ۲۰۱۵ء،ص:۴۲)

ادیب اگر جانبدار ہوجائے تو اس کی شخصیت اور فن دونوں مجروح ہوجاتے ہیں، اس لیے کہ اس کے کاندھے

پر پورے سماج کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ صرف دوسروں کے معاملات ومسائل حل کرنے کی کوشش کرے اور اپنے گھر آنگن کے مسائل سے بے اعتنائی برتے تو اس پر جانبدار ہونے کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عصمت کی شخصیت اس سے مبرا ہے۔ انھوں نے جہاں دوسروں کے گھر آنگن کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بڑی دلیری کے ساتھ اجاگر کیا وہیں اپنے گھر آنگن پر بھی بھرپور نظر ڈالی، جس کی زندہ مثالیں ''بچھو پھوپھی'' ''دوزخی'' ہیں۔

عصمت نے مسلم معاشرے کے متوسط طبقے کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ اس طبقے میں بے کاری، غربت، جنسی بے راہ روی اور جنسی نا آسودگی کی وبا عام تھی۔ یہ موضوع ان کے افسانوں اور ناولوں کا خاص موضوع ہے اور انھوں نے اس موضوع کو اپنی کہانیوں میں بڑے سلیقے سے پیش بھی کیا ہے۔ منٹو اور عصمت کے افسانوں کا خاص موضوع جنس ہے، لیکن دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ منٹو نے خارجی جنسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور عصمت کے مسائل ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات پر مبنی ہیں۔ لیکن ان دونوں نے جنس کو ایک نفسیاتی مسئلے کے طور پر پیش کیا ہے نہ کہ عریانیت اور تلذذ کے لیے۔ انھوں نے اس زمانے میں ایک عورت ہوتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھایا جس کے بارے میں سوچنا بھی گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا، اور یہ موضوع شجرِ ممنوعہ کے مترادف تصور کیا جاتا تھا۔ چونکہ ان کی اَنا پسند طبیعت میں بغاوت کا عنصر غالب تھا اس لیے انھوں نے فرسودہ نظام کو توڑ کر ایک نئی راہ اختیار کی۔ ایک ایسی راہ جس پر چلنا ہر کس وناکس کے بس کا نہیں تھا اور انھوں نے اس راہ پر چل کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان کے اندر ہمت وحوصلہ ہو تو کوئی بھی طاقت اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔

عصمت ایک تعلیم یافتہ گھرانے کی پروردہ تھیں، خود بھی تعلیم یافتہ تھیں اور غور وفکر کرنے والا ذہن رکھتی تھیں۔ علی گڑھ کی تعلیمی فضا اور آزادانہ ماحول ان کو راس آیا۔ رفتہ رفتہ ان کے فن میں پختگی آتی گئی۔ علی گڑھ کی تعلیم کے دوران ہی انھوں نے ''لحاف'' جیسا افسانہ لکھا۔ یہ ان کا ایسا افسانہ ہے جس کے شائع ہوتے ہی ہر طرف واویلا مچ گیا۔ اس لیے کہ یہ افسانہ ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا تھا جس پر ابھی تک اردو کے کسی افسانہ نگار نے توجہ نہیں کی تھی۔ سب کے لیے یہ موضوع بالکل اچھوتا تھا۔ اس افسانہ پر لاہور کی عدالت میں مقدمہ بھی چلا۔ گھر کی چہار دیواری سے لے کر ادب کی محفلوں میں اس پر خوب چرچے ہوئے۔ اس کہانی پر جو ردِعمل ہوا اس کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں:

''جب اخباروں میں خبر نکلی تو میرے سسر جی کا فون آیا دلہن کو سمجھاؤ، کچھ اللہ رسول کی باتیں لکھیں کہ عاقبت درست ہو مقدمہ اور وہ بھی فحاشی پر، ہم لوگ بہت پریشان ہیں اللہ رحم کرے''

عصمت کو مسلم گھرانوں کے متوسط طبقے کی عورتوں سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ ان کے دکھ درد اور مسائل سے بھی واقف تھیں اور اس میں تبدیلی کی خواہاں بھی تھیں۔ چونکہ عصمت خود ایک عورت تھیں اور انھوں نے ان دبی کچلی اور حالات کی ماری عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر انھیں عزت ووقار عطا کیا اور ان پر ہو رہے ظلم وجبر کے خاتمے کے لیے حتی الامکان کوشش بھی کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئیں۔ ان کی کوئی کہانی بے مقصد اور بے کار نہیں ہوتی ہے، چاہے وہ جنسی مسائل پر ہو یا معاشرتی۔ ان کے افسانوں میں انسانی سماج کی بھلائی کا کوئی نہ

کوئی پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ بظاہر لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس میں سماج پر طنز کیا گیا ہے لیکن اس طنز میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس بارے میں وہ ایک جگہ خود تحریر کرتی ہیں:

''ویسے میں قصداً جنسی موضوع اٹھا کر نہیں لکھتی، اس کے پیچھے میرا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ انسان کی آزادی کا، عورت کی آزادی کا سوال ہوتا ہے جس کو میں حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں'' (گوشۂ عصمت چغتائی، شاعر ممبئی ۱۹۷۶ء، ص ۱۳)

عصمت نے جنسی موضوعات کے ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے مسائل ومعاملات کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی کہانیوں میں عشق ورومان کی پر کیف فضا بھی ہے اور بمبئی کی مصروف شہری زندگی کی خودغرضانہ گہما گہمی کی عکاسی بھی۔ جنس اگرچہ ان کا خاص موضوع اور پہچان تصور کیا جاتا ہے لیکن اس خاص موضوع میں بھی عصمت کی جدت پسند طبیعت نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ ان کے افکار ونظریات سے اختلاف کرنے والے ناقدین بھی اس کے قائل ہو گئے۔ معروف فکشن نگار وناقد عزیز احمد لکھتے ہیں:

''اگر ان کی جنس پرستی میں ذرا روک اور ٹھہراؤ پیدا ہو، ذرا اور توازن ہو اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو وہ ان کی جگہ پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں تو یقین ہے کہ اپنی جدت پسند تحریر، اپنی قوتِ مشاہدہ، اپنی بے جھجک حرارت کی وجہ سے وہ درحقیقت اپنے لیے اردو ادب میں جگہ پیدا کر سکیں گی''۔ (ماہنامہ ''نگار'' نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۱ء، ص ۲۸؛ ترقی پسند ادب، عزیز احمد، ص ۱۲۷)

عصمت جس عہد میں سانس لے رہی تھیں اس عہد کی کریہہ صورت ان کی کہانیوں میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ لحاف، گیندا، دو ہاتھ، ننھی کی نانی، بھول بھلیاں، موکھا، بچھو پھوپھی، چھوئی موئی، لال چیونٹے، کچے دھاگے، سونے کا انڈا، یہ عصمت کے وہ افسانے ہیں جو اس عہد کے بھرپور عکاس ہیں۔ افسانہ ''گیندا'' بقول عصمت ان کا پہلا افسانہ ہے جس کی اشاعت بعد میں ہوئی۔ اس افسانے کا شمار ان کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ عصمت انسانی نفسیات کے پرکھنے اور اسے پیش کرنے میں بڑی مہارت رکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا کینوس محدود ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ انھیں فرسودگی سے نفرت تھی۔ وہ فرسودہ موضوعات میں بھی اپنی فطری صلاحیتوں کی بدولت ایسی توانائی بھر دیتی ہیں کہ اس میں تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

''انھیں نت نئی زندگی اور اس کی مختلف کیف سامانیوں کی تلاش رہتی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ اس محدود کینوس کے باوجود موضوعات میں تنوع پیدا کر لیتی ہیں''۔

بے باکی اور عریانی میں انھوں نے مرد افسانہ نگاروں کو بھی مات دے دی۔ چنانچہ معروف ناقد پروفیسر مجنوں گورکھپوری ان کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''عصمت نے جس بے باکی اور جرأت کے ساتھ ان پردوں کو فاش کرنا شروع کیا ہے ہمارے ادب میں اس کی کمی تھی اور اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ عصمت

نے بے باکی اور عریانی میں مردوں کے بھی کان کاٹے ہیں‘‘۔

عصمت نے زبان و بیان کی سطح پر بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں اس زمانے کے متوسط گھرانے کی عورتوں کی زبان کا غلبہ ہے۔ وہ ٹکسالی لفظیات، محاوروں، تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی بڑی ہنرمندی سے کرتی ہیں۔ وہ جیسا کردار تخلیق کرتی ہیں اسی کے مطابق زبان بھی استعمال کرتی ہیں اور تکنیک و اسلوب بھی۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی:

> ’’ان کے افسانوں سے اردو لغت میں نئے الفاظ، نئے محاورات اور نئی تشبیہات و علامات کا اضافہ ہوا ہے۔ جو محض عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ بار بار سنے ہوئے ہیں، لیکن انھیں پہلی بار اردو افسانوں میں دیکھ کر، ان میں چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ عصمت کا ایسا کارنامہ ہے جو اردو افسانہ نگاروں میں ان کی انفرادیت کو متعین کرتا ہے‘‘۔

عصمت کے افسانوں کے موضوعات محدود تھے۔ لیکن انھوں نے ان محدود موضوعات میں بھی جس انداز اور جس نوعیت کے افسانے لکھے ہیں وہ اتنے اہم اور لائقِ توجہ ہیں کہ موضوعات کی محدودیت کے باوجود ان کی ادبی اور فنی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محدود موضوعات میں ایسا تنوع پیدا کر دینا کہ قاری بغور پڑھنے اور متاثر ہونے پر مجبور ہو جائے، فن کار کی اہمیت و عظمت کی دلیل ہے۔

☆☆☆☆☆

Zaheer Hasan Zaheer
Research Scholar Dept. of Urdu,
AMU Aligarah 202001,
Mob. 8736992810,
E-Mail: zaheerhasanmau@gmail.com

بِچھو پھوپھی یا بُچھو پھوپھی

ناظر حسین

عام طور پر عصمت کے اس افسانے کو طلبہ بُچھو پھوپھی کہتے ہیں، اساتذہ سے پوچھنے پر یہی پتا چلا کہ اصل میں یہ لفظ بُچھو ہے لیکن پھوپی کے نازیبا کلمات یا اس کی گالیاں جو کہ ڈنک کی طرح ہیں، کی وجہ سے اس کو بُچھو پھوپھی کہا جانے لگا۔ اس لیے یہ مضمون خصوصاً طلبہ کے لیے ہے جس کے ذریعہ اِن نئے لوگوں کو جو لفظ بُچھو اور بِچھو کی کشمکش میں مبتلا ہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دراصل یہ لفظ بُچھو نہیں بلکہ بِچھو ہے۔ کیوں کہ بِچھو ایک زہریلا کیڑا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اس کے ڈنک سے لوگوں کی موت بھی ہو جاتی ہے۔ اگر ہم اس کردار کو بِچھو تسلیم کرتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ نے بِچھو کی شکل میں جس کردار کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ زہریلی ہوگی یعنی اس کی باتوں میں زہر بھرا ہوگا۔ جب وہ بولتی ہوگی تو صرف اور صرف برا ہی بولتی ہوگی اور سب سے بڑی بات نہ صرف زبانی اعتبار سے وہ برا بولتی ہوگی بلکہ عملی طور پر بھی برا چاہتی ہوگی، ٹھیک اسی طرح جس طرح ڈنک مارنے کے بعد بِچھو کا زہر عملی طور پر بھی کام کرتا ہے۔ عنوان بِچھو کی مناسبت سے افسانے کا یہی مطلب اخذ ہونا چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم اپنے افسانے، خاکے، انشائیے یا دیگر چیزوں کا عنوان ’آستین کا سانپ‘ رکھیں تو ایک ایسے شخص کا کردار پیش کریں گے جو آستین کا سانپ ہو۔ اگر ہم اپنا عنوان ’احسان فراموش‘ رکھیں تو ایک ایسے انسان کو موضوع بنائیں گے جو احسان فراموش ہو۔ مختصر یہ کہ جو عنوان ہوگا اسی حوالے سے بحث کرتے ہوئے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں ہم بِچھو تسلیم کر کے اس افسانے کا تجزیہ شروع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ افسانہ کہاں تک عنوان بِچھو پر کھرا اترتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے افسانے میں مصنفہ کے ذریعہ بِچھو کا تعارف کیسے کروایا گیا ہے، کو موضوع بناتے ہوئے اس پر بحث کرتے ہیں۔ افسانے کا آغاز ہی مصنفہ اس جملے سے کرتی ہیں:

> ’’جب پہلی بار میں نے انھیں دیکھا تو وہ رحمن بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں‘‘

ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ نے ایک ایسے کردار کو موضوع بنایا ہے یا اس کا تعارف اس انداز میں کرایا ہے جو گالیاں دے رہی ہے۔ اس کے تعارف کا آغاز ہی اس کی گالیوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کردار افسانے کے آغاز سے ہی قاری پر منفی اثر مرتب کرنے کے لیے آمادہ ہے یا مصنفہ کے ذریعہ اس کا کردار منفی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ اس تجزیے میں ہم عنوان کو بِچھو تسلیم کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ بعد ازاں تھوڑے وقفے کے بعد دوبارہ اس کردار کے حوالے سے چند الفاظ کہے گئے ہیں:

> ’’یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمن بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں دیا کرتی تھیں‘‘

اس کردار کا پھر سے وہی منفی پہلو، پھر سے اس کو یہ کہہ کر بتایا گیا ہے کہ وہ گالیاں دینے والی ہے۔اس سے قاری تھوڑی دیر کے لیے اس بھرم میں آجاتا ہے کہ یہ عنوان ''بچھو' ہی ہوگا۔

افسانے میں ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ مصنفہ جس کردار کا تعارف اس شکل میں کرا رہی ہیں کہ وہ ہمیشہ گالیان ہی بکتی ہے اصل میں وہ ہے کون؟ اسی اقتباس کے فوراً بعد اس کردار کا اصل تعارف ان الفاظ کے ذریعہ کرایا جاتا ہے:

''اس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپھی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جارہی تھیں''

یہاں یہ کردار اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مصنفہ کی پھوپھی ہیں، مگر مصنفہ نے یہاں بھی انھیں گالیاں دینے والا ہی بتایا ہے۔آیئے دیکھیں کہ پھوپھی کی گالیاں اور کوسنا کن الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے:

''وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعہ کہلواتے ''کیوں پھوپھی آج کیا کھایا ہے؟''

''تیری میّا کا کلیجہ۔''

یہ جواب پھوپھی اپنے بھائی کو دے رہی ہے۔ یہ بحث مزید آگے بڑھتی ہے یعنی:

۔۔۔ابا پھر جواب دلواتے۔

''ارے پھوپھی جب ہی منہ میں بواسیر ہوگئی ہے۔جلاّب لو جلاّب!''

'وہ میرے نوجوان بھائی کی مچھپاتی لاش پر کوّوں، چیلوں کو دعوت دینے لگتیں۔ ان کی دلہن کو جو نہ جانے بے چاری اس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولہا کے عشق میں لرز رہی ہوگی، رنڈاپے کی دعائیں دیتیں۔'

یہ گالیاں مصنفہ کے نوجوان بھائی کو پھوپھی کے ذریعہ دی جارہی ہیں۔اب تک کی بحث سے قاری کی نظر میں پھوپھی صرف اور صرف ''بچھو' ہی ثابت ہو رہی ہے یعنی یہ صرف گالیاں دیتی اور کوستی ہے۔جوان کیا بچے بھی اس کی گالیوں کی زد میں آتے ہیں۔لیکن اب ذرا اسی پھوپھی کے کردار کے دوسرے پہلو کو بھی دیکھیں جہاں وہ نرم ہے، اگر وہ لوگوں کو گالیاں دیتی ہے تو وہیں وہ ان کو پیار بھی کرتی ہے۔ جہاں وہ ان چھوٹے بچوں کی لاش پر چیل اور کووں کو دعوت دیتی ہے وہیں ان بچوں کو ان کا حق بھی بڑے پیار سے بلا کر دیتی ہے۔ جب عید میں یہی بچے پھوپھی کے گھر جاتے تو:

'بھتیجوں کو وہ آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔'

اور ساتھ میں یہ بھی کہتی:

'حرام زادوں! اگر ابا اماں کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی''۔اماں ابا کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عیدی ملی۔'

دیکھا آپ نے ایک طرف بچوں کو گالیاں تو دوسری طرف بچوں کو پیار بھی۔(بچوں کے ساتھ پھوپھی کی اس محبت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح اس کا بھائی اس کو چھیڑتا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے بھائی کو چڑھاتی

ہے) ان دونوں صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو پھوپھی کے دل کا وہ گوشہ جس میں نہ صرف ان بچوں کے لیے بلکہ اپنے بھائی اور دیگر لوگوں کے لیے بھی بے پناہ پیار بھرا ہے، ظاہر ہوتا ہے۔افسانے کے عنوان کے حوالے سے پہلا خلاصہ یہاں ہوتا ہے کہ اگر پھوپھی واقعی میں ''بچھو' ہوتی تو بچوں کے لیے اس کے دل میں یہ پیار نہ جھلکتا۔آیئے اسی طرز پر پھوپھی کے ذریعہ افسانے کے تمام کرداروں کو دی جانے والی گالیاں اور ان کے لیے پھوپھی کے دل کے نرم گوشے کا جائزہ لیں۔

بھائیوں کے حوالے سے:

مصنفہ نے پھوپھی کے بھائیوں یعنی اپنے چچا کے بیان کے حوالے سے بہت ہی صاف دلی سے کام لیا ہے، خاص کر جب وہ اپنے چھوٹے چچا کا ذکر کرتی ہیں اس وقت ان کے کردار کو سچائی سے قاری کے سامنے رکھتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جہاں پھوپھی اپنے بھائیوں سے نفرت کرتی ہیں وہیں ضرورت پڑنے پر اپنے شوہر پر انھیں بھائیوں کے نام کا رعب بھی دکھاتی ہیں۔ یہ اقوال ملاحظہ کریں:

'تین بھائی تھے، مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔اور وہ غصہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے، انھیں حقارت سے فقیر اور بھیک منگا کہتیں۔ ہمارے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے۔انھیں غدار اور انگریزوں کے غلام کہتیں، کیوں کہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر ڈالی، ورنہ آج ''مرحوم'' پتلی دال کھانے والے جولاہے یعنی میرے پھوپھا کے بجائے وہ لال قلعے میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب میں غسل فرما کر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی بڑے چچا دس نمبر کے بدمعاشوں میں تھے اور سپاہی ڈرتا ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر ان کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔انھوں نے کئی قتل کیے تھے، ڈاکے ڈالے تھے۔شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے۔وہ انھیں ڈاکو کہا کرتی تھیں۔'

مگر جب کبھی اپنے زعم میں آتیں یا خاندانی خون جوش مارتا تو انھیں بھائیوں کو ایسے ڈھال بناتیں:

'مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے غصہ ہوتیں تو کہا کرتیں ''منہ جلے، نگوڑی ناہٹی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ ان کو خبر ہوگئی تو دنیا کا نہ رہے گا اور کچھ نہیں۔ اگر چھوٹا سن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کر ہاتھ میں تھما دے۔ڈاکو ہے ڈاکو! اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑا دے گا۔ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے، تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔دیکھ مغل کی بچی ہوں، تیری اماں کی طرح شیخانی فتانی نہیں۔'

یہاں ایک بہن کا نہ صرف اپنے بھائیوں پر بلکہ اسی خاندان پر جس کو وہ گالیاں دیتی نہیں تھکتیں، ناز کرنا دیکھا جاسکتا ہے۔ پھوپھی کے کردار کے حوالے سے یہاں بھی دو پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔

مصنفہ کی ماں کے حوالے سے:

پھوپھی کے غصے کا شکار مصنفہ کی ماں بھی ہوتی ہیں، اس کی ایک وجہ ان کا خاندان اور ان کا پیشہ بھی ہے، خیر پھوپھی کے ذریعہ ماں کو دی جانے والی گالیاں ملاحظہ ہوں، پھوپھی کہتیں:

"تیری اماں جادوگرنی ہے اوراس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر پیٹ گرا تھا"

جب مصنفہ کے والد یعنی پھوپھی کے بھائی پھوپھی کو چھیڑنے کے لیے بچوں سے کہلواتے:

"پھوپھی، ہماری اماں سے کشتی لڑو گی؟"

"ہاں ہاں۔ بلا اپنی اماں کو آجائے خم ٹھوک کر۔ ارے اُلّو نہ بنا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا مُلّا زادی کو"

اب ماں کے حوالے سے پھوپھی کے کردار کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کریں جس میں پیار جھلکتا ہے:

"ویسے کہیں ابا کے بغیر اماں نظر آجائیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے "نچھو نچھو" کہتیں۔" بچے تو اچھے ہیں" وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی۔"

پھوپھی کے دل کا نرم گوشہ یہاں بھی اسی طرح سے ہے جس طرح دیگر لوگوں کے لیے ہے۔ ہر جگہ پھوپھی کی شخصیت کا یہ پہلو اپنے اسی خلوص کے ساتھ جلوہ گر ہے جس طرح ایک رشتے کا اپنے دوسرے رشتے سے ہونا چاہیے۔

مصنفہ نے پھوپھی کے جس بھائی کو موضوع بنا کر یہ تحریر تخلیق کی اس بھائی سے بھی پھوپھی کو کم محبت نہ تھی، بلکہ بھائی کے لیے بھی بہن کے دل میں محبت کا وہی دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے جو ہماری ہندوستانی بہنوں میں دکھائی دیتا ہے یا جو ہماری ہندوستانی تہذیب کی اصل نشانی ہے۔ عید کے دن جب بھائی اپنی بہن یعنی پھوپھی کے گھر جاتا ہے تو وہ یعنی پھوپھی:

'فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھری میں سے میری جادوگرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔'

اپنے بھائی سے بہن کی محبت کا عالم دیکھیے:

'نوکر کو بلا کر سویاں بھجواتیں۔ مگر یہ کہتیں "پڑوسن نے بھیجی ہے"'

اور محبت کی انتہا تو دیکھیے کہ بھائی کے ذریعہ دی گئی عیدی کو سامنے تو پھینک دیتیں مگر اس کے جانے کے بعد گھنٹوں انھیں پیسوں کو آنکھوں سے لگا کر روتیں:

"سویاں کھا کر ابا عیدی جو دیتے وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں، کہ "اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں۔ اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی۔"

افسانے کے آخر میں جب بھائی اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے اور پھوپھی کو بلواتا ہے:

"بادشاہی خانم ہمارا آخری وقت ہے، دل کا ارمان پورا کرنا ہے تو آجاؤ۔"

تو بھائی کی اس خبر کا اثر بہن پر کچھ یوں ہوا:

'نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے۔ بھیا نے پھینکے اور بہنا کے دل میں ترازو ہو گئے۔ بلبلاتی، چھاتی کوٹتی سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر اتریں جہاں اب تک انھوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔'

یہ بھائی سے بہن کی محبت کی مثال نہیں تو کیا ہے، بہن بے تحاشا دوڑی چلی آرہی ہے وہ بھی ایسی جگہ جہاں اس نے کبھی نہ آنے کی قسم کھا لی ہو۔ اب ان دونوں بھائی اور بہن کے مکالمے کو دیکھیں۔ وہ مکالمے جو ان دونوں کی محبت کے تمام پہلوؤں کو عیاں کرتے ہیں، وہ بہن جو زندگی بھر اپنے بھائی کو کوستی اور گالیاں دیتی تھی آج اسی کے لیے اس کی زبان سے کون سے الفاظ نکلتے ہیں ملاحظہ کریں:

"یا اللہ۔۔۔ یا اللہ۔۔۔" انھوں نے گرجنا چاہا۔ مگر کانپ کر رہ گئیں۔ "یا۔۔۔ یا اللہ ۔۔۔ میری عمر میرے بھیا کو دیدے۔۔۔ یا مولا۔۔۔ اپنے رسول کا صدقہ۔۔۔"

جس اللہ کا نام لے کر کبھی اسی بھائی کو نالے میں گراتی تھیں، جس کی لاش کو کاندھا دینے والا نہ ملے کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھیں آج اسی اللہ کے نام سے اسے اپنی عمر دینے کی بھی بات کر رہی ہیں۔ بھائی کے حوالے سے اگر ہم دونوں پہلوؤں پر غور کریں تو یہ بات بغیر جانب داری سے کہہ سکتے ہیں کہ جس شدت سے گالی یا بددعائیں دی گئی ہیں اس سے کہیں زیادہ شدت سے اس کی لمبی عمر کی دعائیں مانگی گئی ہیں۔

ابھی تک ہم نے افسانے کے کرداروں کے حوالے سے پھوپھی کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ پھوپھی صرف زبانی طور پر برا کہتی ہے، عملی طور پر وہ کسی کا برا نہیں چاہتی۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھوپھی کی زبان ایسی ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں اسی افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے، مصنفہ کہتی ہیں:

"میری پھوپھی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا، میرے ابا میاں اور میرے چچا، بڑے دو ان سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے۔ تین بھائیوں کی ایک بہن ہمیشہ کی نخریلی اور تنک مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل لونڈوں کی طرح پلیں۔ شہ سواری، تیراندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی۔"

ایسے کردار کے لوگ تھوڑے منچلے ہوتے ہیں، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اس پر کچھ اثر آنا ہی ہے جو کہ پھوپھی پر آیا، مگر مجموعی طور پر دیکھیں تو پھوپھی کی سوچ بری نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ جس کو گالی دے رہی ہے عملی طور پر بھی اس کا برا چاہے، لوگوں کو گالیاں دینا تو اس کا تکیہ کلام تھا۔ پھوپھی کی زندگی میں ایک اور سانحے نے ان کی زبان میں مزید کڑواہٹ بھر دی۔ یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

'جس دن پھوپھا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں، پھوپھی نے بٹے سے ساری چوڑیاں چھنا چھن توڑ ڈالیں۔ رنگا دوپٹہ اتار دیا اور اس دن سے وہ انھیں "مرحوم" یا مرنے والا کہا کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد انھوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو نہ لگنے دیے۔

یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور جب سے وہ "رنڈاپا" جھیل رہی تھیں۔'

ایک عورت جو جوانی میں رنڈاپا جھیل رہی ہو یا شوہر کے رہتے ہوئے بھی بیوہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی ہو اس کے اندر تھوڑا تو چڑچڑاپن آ ہی جاتا ہے (اگر سو فیصد نہیں تو نوے فیصد لوگ خواہ وہ عورت ہو یا مرد چڑچڑے پن

کا شکار ہو ہی جاتے ہیں)۔ ظاہر ہے پھوپھی بھی اسی کا شکار ہوئی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہو رہے ہیں۔ ویسے وہ دل کی بری نہیں تھیں تبھی تو مصنفہ، پھوپھی کو ان تحسینی کلمات سے یاد کرتیں ہیں:

'ابا میاں ان سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپھی بادشاہی پھر شابیاں چھوڑنے لگتیں، ہم لوگ سب کھیل کود پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مڑ مڑ اپنی پیاری پھوپھی کے کوسنے سنا کرتے۔'

لفظ 'پیاری پھوپھی' کا استعمال پھوپھی سے مصنفہ کی محبت کا ہی عکاس ہے اس کے علاوہ یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے جب مصنفہ پھوپھی کے قدوقامت کا نقشہ کھینچتی ہیں:

'ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی تھوڑی! اور آواز تو ماشاءاللہ ابا میاں سے ایک سر نیچے ہی ہوگی۔'

اس سلسلے میں اوپر کے قول کا آخری جملہ قابل غور ہے۔ جس میں مصنفہ بھی اپنی پھوپھی کی آواز کی تعریف لفظ 'ماشاءاللہ' سے کر رہی ہیں۔

اس تجزیے میں ہم نے بچھو کی شخصیت اور حالات کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا۔ اس میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تین بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن ہونا، بچپن میں مردوں کا سا شوق رکھنا اور قدوقامت کا اس طرح ہونا وغیرہ یہ سبھی چیزیں انسان کا مزاج اور زبان دونوں کو کچھ حد تک تیز کر سکتی ہیں، مگر وہ دل کا برا ہو یہ ضروری نہیں۔ بچھو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے، وہ مزاج اور زبان کی تیز ہے مگر دل کی بری نہیں۔ وہ زبان سے سب کو گالیاں دیتی ہے مگر دل سے وہ کسی کا برا نہیں چاہتی۔ اس لیے صرف اس کی زبان کو بنیاد بنا کر اس کو بچھو کہنا اس کردار کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

آخر میں نام بچھو ہی ہے اس کو ثابت کرنے کے لیے ایک اور مثال دینا چاہوں گا، افسانے میں مصنفہ کہتی ہیں کہ جب بھی اکیلے میں پھوپھی امی سے ملتی تو انھیں گلے لگا تیں، بچوں کی خیریت پوچھتیں اور پیار سے انھیں نچھو نچھو کہتیں۔ نچھو یعنی نصرت، جو کہ ان کا نام ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پھوپھی کا نام بھی 'بادشاہی خانم' تھا، چوں کہ وہ بھی تین بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن تھیں اس لیے پیار سے ان کو بادشاہی کے بجائے 'بچھو' پکارا جاتا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تیز زبان کو موضوع بنا کر اس بچھو کو بچھو کہا جانے لگا جو کہ اس کے اور عصمت دونوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔

☆☆☆☆☆

Nazir Husain Khan
Research Scholar, Dept. of Urdu,
Aligarh Muslim Universuty, Aligarh
Mob. 8545958580,
E-Mail: nazirhusain007@gmail.com

نیّر مسعود کے افسانوں 'مار گیر' اور 'نصرت' میں عصری حسیت

مختار احمد شالہ

عصری حسیت اپنے عہد کی کلّی صورت حال سے آگاہی کا نام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ادیب اپنے گردونواح کے سماجی اور معاشرتی مسائل کے معاشی محرکات سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ ساتھ ہی جدید ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی شعور رکھتا ہو۔ ادیب جو ادب تخلیق کرتا ہے وہ اس عہد تک محدود نہیں رہتا بلکہ آنے والی نسل کے لیے اپنے ماضی سے متعلق جانکاری حاصل کرنے کا سب سے اہم وسیلہ ہوتا ہے۔ افسانہ نگار افسانوں میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی حالات و واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔

افسانہ سماجی حقیقت نگاری کا سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ اظہار ہے۔ جس عہد کا قصہ یا واقعہ افسانے میں بیان ہوتا ہے اس عہد کے حالات و واقعات، حادثات و سانحات غرض ہر چیز اپنی حقیقی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ حالانکہ اس میں شامل کردار فرضی ہو سکتے ہیں لیکن صورت حال کبھی فرضی نہیں ہوتی۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اپنے عہد کی سچی تصویر کشی کرتا ہے۔ اگر پریم چند کے زمانۂ حیات میں اس طرح کے حالات رونما نہ ہوئے ہوتے تو شاید پریم چند اپنے افسانے ''کفن'' کے ذریعے نچلے طبقے کے اس خاندان کی تصویر پیش نہیں کر پاتے اور یوں قارئین اس افسانے کے ذریعے اس عہد کے حالات سے آگاہی حاصل نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ حساس فنکار اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنے عہد کی عکس بندی کرتے رہتے ہیں۔

نیّر مسعود کے افسانوں ''مار گیر'' اور'' نصرت'' دونوں میں عصری حسیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ یہ دونوں افسانے ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''سیمیا'' میں شامل ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''سیمیا'' پہلی مرتبہ 1984ء میں نصرت پبلیشرز، دین دیال روڈ لکھنو سے شائع ہوا۔ نیّر مسعود نے اپنے عہد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں ''نصرت'' اور'' مار گیر'' میں موضوع بنا کر انسانی صورت حال کی تصویر کشی کی ہے۔ ان افسانوں کے بغور مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان دنیا میں کتنا بے بس اور مجبور ہے۔ وقت کے آگے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ وقت اپنے بطن میں حادثات و سانحات سموئے رکھتا ہے اور اچانک انسان پر ان کا نزول اس طرح ہوتا ہے کہ انسان ان حادثات و سانحات کے سامنے اپنے آپ کو بے بس اور لاچار پاتا ہے۔

نیّر مسعود نے روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر انھیں حقیقی قالب میں پیش کیا۔ دنیا میں روزانہ کتنے چھوٹے بڑے حادثات و واقعات پیش آتے ہیں جن میں بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جو دیرپا اثرات نہیں چھوڑتے، لیکن بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی کو یکسر بدل دیتے ہیں۔ ایسے حادثات کسی ایک عہد میں نہیں بلکہ ہر عہد میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ادیب جب ان حالات و واقعات اور حادثات و سانحات کو موضوع بنا کر اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے تو پڑھنے والے کو یہ اپنے عہد کے معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر یوں

کہا جائے کہ وہ ان حالات، واقعات، حادثات اور سانحات کو اپنی زندگی کے مطابق پاتے ہیں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

''نصرت'' نیّر مسعود کا ایک اہم افسانہ ہے جس میں انھوں نے نصرت کی زندگی کے ایک دردناک واقعے کو پیش کر کے اپنے عہد کے حادثات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ نصرت کی زندگی میں ایک دردناک واقعہ رونما ہونے سے اس کی ٹانگیں بے کار پڑھ جاتی ہیں۔ وہ حالات کی ماری بے بس اور لاچار ہو کر ایک ہی جگہ پڑی رہ جاتی ہے جہاں سے وہ نہ ہل پاتی ہے نہ چل پاتی ہے۔ نصرت جیسی سیدھی سادھی لڑکی اس بات سے بالکل ناواقف تھی کہ جن لوگوں کے لیے وہ راستہ صاف کر رہی ہے، حقیقت میں وہی لوگ اپنی گاڑی کے نیچے کچل کر اسے اپاہج بنادیں گے۔ افسانہ ''نصرت'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گاڑی کے سامنے رکاوٹ تھی جس کو ہٹانا ضروری تھا، نصرت نے وہ رکاوٹ ہٹادی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ خود بھی ہٹتی، گاڑی چل پڑی جس سے نصرت کے دونوں پیر کچل گئے۔

گاڑی رکے بغیر نکل گئی اور نصرت دیر تک وہیں پڑی رہی۔''1

اس اقتباس کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں خود غرضی اور انسانی فطرت، ہمدردی اور بے لوث خدمت کے جذبے پر غالب آجاتی ہے۔ نصرت یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ جن لوگوں کی مدد کر رہی ہے وہی لوگ اسے اپاہج بنا کر چھوڑ دیں گے۔ یہ لوگ اپنی گاڑی کے نیچے نصرت کے پیر کچل دیتے ہیں اور گاڑی چلا کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ نیّر مسعود نے انسانی فطرت اور خود غرضی کی جس طرح افسانہ ''نصرت'' کے ذریعہ نقاب کشائی کی ہے اس طرح کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کی کہانی عہد حاضر کی ایک المناک روحانی تجربہ بن جاتی ہے۔ اس کہانی سے کچھ ایسے دلچسپ پہلو بھی سامنے آتے ہیں جو آج کے حالات کی سچی تصویریں پیش کر رہے ہیں۔

افسانہ میں نصرت کے ساتھ ساتھ گاڑی میں سوار لوگوں کے کردار حقیقی سطح پر آج کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے دردناک حادثے سے قاری کی توجہ ملک میں رہنے والے ہزاروں لوگوں کی طرف منعطف ہوتی ہے جو آئے دن کسی حادثے کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کہانی صرف نصرت کے اپاہج ہونے پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس خود غرض سماج کی کہانی ہے جس میں انسانی قدروں کا زوال ہو چکا ہے۔ سماج عام طور پر اس صورت حال کا شکار نظر آتا ہے جہاں نہ صرف نصرت جیسی بے شمار لڑکیاں بلکہ عام لوگ بھی خود کو دوسروں کی مدد کی خاطر ہمیشہ تیار رکھتے ہیں۔ مگر سماج کے خود غرض اور مکار افراد کو ان کی جان و امان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

آج کا انسان جس دور میں سانس لے رہا ہے اسے سائنس اور ٹیکنالوجی کے عہد سے موسوم کیا جاتا ہے، جس میں سماج کا ہر فرد دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ دوسروں سے برتری حاصل کرنے اور دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کے خواب نے اس کے دل و دماغ سے چین و سکون چھین لیا ہے۔ اس کے اطراف میں کیا ہو رہا ہے اسے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے ضمیر سے انسانیت کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ افسانہ نصرت سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''لوگ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر پہلے کی طرح گھٹنوں پر اپنا چہرہ

ٹکا لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ رونا نہیں چاہتی تو میں نے گفتگو آگے بڑھائی۔''2

نیّر مسعود کے افسانوں ''نصرت'' اور ''مارگیر'' میں کردار مختلف حادثات و سانحات کے شکار ہوتے نظر آتے ہیں۔ نیّر مسعو اپنے معاشرے کے حالات سے واقف ہیں، انھوں نے زندگی کو سماجی سیاق میں جس طرح پایا اسی طرح کہیں ہو بہو اور کہیں علامتی انداز میں اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انھوں نے زندگی کے بہت سارے مسائل اور حالات و واقعات کو ایک ساتھ اپنے افسانوں ''مارگیر'' اور ''نصرت'' میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو دور حاضر کے حالات کے عکاس معلوم ہوتے ہیں۔

''مارگیر'' ایک طرح سے نیّر مسعود کی وسیع النظری اور اپنے عہد کے حالات سے متعلق گہری واقفیت کا ثبوت ہے۔ انھوں نے سماج میں ختم ہو رہی انسانی قدریں، ظلم اور قتل و غارت گری وغیرہ جیسے نمایاں پہلوؤں کی عکاسی اپنے افسانوں ''نصرت'' اور ''مارگیر'' میں مؤثر ڈھنگ سے کی ہے۔ ان کی کہانی ''مارگیر'' ایک علامتی کہانی ہے۔ افسانے کا مرکزی خیال انسانی استحصال اور ظلم و بربریت ہے، جو استحصال اور ظلم پسند قوتوں کے ذریعہ مختلف شکل و صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آج دنیا کی کوئی بھی قوم بظاہر آزاد ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طریقے پر اندرونی طور پر زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، جہاں اس قوم کے افراد اس طرح سے قتل کر دیے جاتے ہیں کہ کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے دن ان کی لاشیں جنگلوں، بیابانوں میں پڑی ملتی ہیں اور یہ افواہ پھیلائی جاتی ہے کہ فلاں جگہ پر فلاں شخص کی یا کسی نامعلوم شخص کی لاش پائی گئی۔ پوری دنیا میں خوف و ہراس اور دہشت کی فضا پھیلی ہوئی ہے۔ مارگیر جیسے افراد استحصال، قتل عام اور ظلم و تشدد کی زد میں آئے عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے کوشاں ہیں۔ افسانہ ''مارگیر'' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اچانک مارگیر میرے سامنے تھا۔ وہ اضطراب کی حالت میں تھا اور اس کے چہرے سے ایسا جوش اور تجسس ظاہر ہو رہا تھا جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آواز لگتے ہی اس کا نمودار ہو جانا بھی میرے لیے نئی بات تھی۔ میں نے زمین پر جگہ صاف کرنا شروع کی لیکن اس نے مجھے روک دیا۔

''نہیں''۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا:

''مجھے جانا ہے، کہیں سانپ نکلا ہے۔''3

سانپ اور اژدہے سماج کے خونخوار مخلوق اور استحصال پسند قوتوں کی علامت بھی ہو سکتی ہے یا پھر غیر ملکی ایجنٹ یا جمہوریت کے نام پر عوام کے استحصال کی علامت بھی ہو سکتی ہے جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، ان کا قتل اور استحصال کرتے ہیں۔ سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں، نفرت، انسانی قدروں کا زوال، اخلاقی زوال اور گراوٹ کے المناک پہلوؤں کے علاوہ سماج میں موجودہ ظلم، قتل و غارت گری، استحصال اور غیر انسانی رویے جیسے حالات و واقعات کو نیّر مسعود نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ افسانہ ''مارگیر'' اور ''نصرت'' اسی نوع کی سماجی حقیقت نگاری، ظلم و تشدد، قتل و غارت گری اور استحصال جیسے واقعات کے گرد گردش کرتے ہیں۔

''مارگیر'' کے پیچھے ایک گہری سماجی حقیقت نگاری پوشیدہ ہے۔ ہر ایک انسان کو اپنے ماحول اور معاشرے سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اس کے ہر ذرے میں اسے اپنی حفاظت دکھائی دیتی ہے۔ مگر جب کبھی اچانک اس

میں پوشیدہ مفاد پرست اور ظالم لوگ اپنے مکارانہ طریقے سے وار کر بیٹھتے ہیں تو عام لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ان کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ لوگ صرف اپنی مدد کے لیے یہی آوازیں بلند کر پاتے ہیں:

''مارگیر! مارگیر!'' رات کے سناٹے میں یہ آواز گونجتی۔ پکارنے والا کبھی بوڑھا ہوتا، کبھی جوان، کبھی کوئی عورت ہوتی اور کبھی کوئی بچہ، اس لیے ان آوازوں میں بڑا فرق ہوتا ہوگا۔''4

نیرّ مسعود کے افسانوں ''نصرت'' اور ''مارگیر'' میں تفہیم وتعبیر کی کئی سطحیں موجود ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے کے بعد دنیا میں انسانی زندگی کی حقیقت، لایعنیت، بے مقصدیت اور موت کی متوازیت اور ایسے کئی موجود پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارہ ملتا ہے۔ ساتھ ہی سیاست کے پس پردہ معاشی محرکات کے بارے میں بھی معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔ بقول یاسمین فاطمہ:

''غور کریں تو ''مارگیر'' سامراجیت کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔ نو آزاد اور ترقی پذیر ملکوں کو معاشی امداد اور خطرناک اسلحہ کی فروخت جنگل میں سانپوں کے پھیلے ہوئے جال سے مشابہت رکھتی ہے۔ ان ملکوں کے سرمایہ دار اور سامراج کے پروردہ حکمراں بھی مارگیر کا کردار ادا کر رہے ہیں، ان کی پٹاری میں زہریلے سانپ ہیں جو لوگوں کو ڈستے ہیں اور مارگیر ہی کے پاس علاج کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح مارگیر سرخ روئی کے ساتھ اپنا کاروبار جاری رکھتا ہے۔''5

''مارگیر'' میں سانپوں اور اژدہوں کی علامت میں گہری معنویت ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دنیا بھی سانپوں اور اژدہوں کے جنگل جیسی بستی معلوم ہوتی ہے جہاں مظلوم، بے بس اور لاچار لوگوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں نیرّ مسعود نے سماجی حقیقت کو باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ اس میں ٹھوس حقیقت پوشیدہ ہے اور پورا افسانہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مارگیر تخلیق کرنے کا اہم مقصد سیاسی اور سماجی ٹھیکے داروں کی کھوکھلی حقیقت اور مفاد پرستوں کی نقاب کشائی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نیرّ مسعود نے اپنے افسانوں میں پورے معاشرے کے دکھ درد کو سمیٹ لیا ہے۔ اس طرح کے واقعات آئے دن رونما ہو کر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن نیرّ مسعود کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان حالات وواقعات کو موضوع بنا کر سماج کی دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے۔ ان افسانوں میں نیرّ مسعود نے سماجی حالات کو جس دردمندی اور فنی مہارت سے پیش کیا ہے اس سے موضوع کی سماجی معنویت اور اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اقدار کا زوال اور خود غرضی کی فراوانی ہمارے معاشرے کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ ہمدردی، انسانیت، بے لوث خدمت کا جذبہ، دیانتداری سبھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر خزاں زدہ پتوں کی مانند لرزاں ہیں۔ جن کی مثال تنہا اور اداس پتوں کی سی ہے جو ہوا کے جھونکوں سے زمین پر گر جاتے ہیں۔ رو بہ زوال معاشرے میں فرد کی اخلاقی جدوجہد محال اور بے سود معلوم ہوتی ہے۔ ایسے میں جن حادثات وواقعات سے فرد کا سابقہ پڑتا ہے نیرّ مسعود نے ان واقعات کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

''نصرت'' اور ''مارگیر'' کے تمام کردار سیرت کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف اداروں

میں پائے جانے والے تضادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نیرّ مسعود کے لیے یہ بات کسی صدمے سے کم نہیں کہ مادی ترقی کے اس دور میں انسان کے روحانی فروغ، اخلاقی اقدار کو نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی صرف اور صرف ضمیر کی بیداری سے ممکن ہے۔ مادی دور میں روحانی اقدار اور اخلاقی وانسانی اقدار پر زور دے کر نیرّ مسعود اس عہد کے انسان کو بے روح ہونے سے بچانے کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں۔

''نصرت'' میں غیر متوقع انجام کا تازیانہ کھا کر قاری کا تصور گاڑی میں سوار ان افراد کی طرف جاتا ہے اور اس دردناک حادثے کی تصویر اس کے سامنے آجاتی ہے جس سے نصرت گذری ہے۔ اسی طرح قاری کا ذہن روز بروز رونما ہونے والے ان حادثات وسانحات کی طرف مڑ جاتا ہے جو مارگیر اور اس کی بستی میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ نیرّ مسعود ان حالات وواقعات کو قاری کی چشم تخیل پر چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ قارئین جب ان افسانوں کے ذریعے اپنے اردگرد کے حالات کا بغور مشاہدہ کریں گے تو انھیں ہزاروں نصرت جیسی لڑکیاں سڑکوں پر اپاہج ملیں گی، کئی لوگ سانپوں اور اژدہوں کی شکل وصورت اختیار کیے نظر آئیں گے جو سماج کے اندر لوگوں کا استحصال، ان پر ظلم وتشدد اور خون ریزی کرتے ہوں گے۔ دردناک حادثات اور خوں چکاں واقعات کو بیان کر کے ان کی ہولناکی کو ذہن پر ہمیشہ کے لیے مرتب کر دینا ایک ہنر ہے۔ اس نظریے سے دیکھا جائے تو نیرّ مسعود کے افسانوں ''نصرت'' اور ''مارگیر'' میں ایسے کئی واقعات کا بیان ملتا ہے جن میں عصری حالات کی تصویر نمایاں ہے۔

عہد حاضر کے مسائل نیرّ مسعود کے کرداروں کی طرح جوں کے توں ہیں، بلکہ اب مسائل اور زیادہ دردناک، پیچیدہ اور بے رحم ہو چکے ہیں۔ وہ ایک حساس شخص ہیں، ان کا سماجی شعور ارتقائی مدارج سے گذرتے ہوئے اپنے اردگرد کی دنیا سے آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے مسائل ومصائب سے پوری طرح واقف ہیں۔ جس کے باعث بیشتر موقعوں پر ان کے افسانے سماجی حقیقت نگاری اور عصری حالات کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔

حواشی:

(1) افسانوی مجموعہ سیمیا، نیرّ مسعود، ص48

(2) ایضاً، ص49

(3) ایضاً، ص83

(4) ایضاً، ص63

(5) جدید اردو افسانے میں عصری حسیت، یاسمین فاطمہ، ص134

☆☆☆☆☆

Mukhtar Ahmad Shallah
Research Scholar, Dept. of Urdu,
MANU University, Hyderabad,
Mob. +91- 8143145585,
E-Mail: 14mukhtar@gmail.com

مرزا عبدالرحیم خانخاناں

سید محمد میاں زیدی

مغل بادشاہ اکبر کا منظورِ نظر اور جہانگیر کا معتمد خاص مرزا عبدالرحیم خانخاناں ہشت پہلو شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ایک تجربہ کار سپہ سالار بھی تھا اور ناظم سلطنت بھی، سیاست داں بھی تھا اور فنون لطیفہ کا ماہر بھی، مذہب کا پابند بھی تھا اور انتہائی درجہ وسیع المشرب بھی، اہل علم بھی تھا اور علم دوست بھی، سخی و فیاض بھی تھا اور عدل گستر بھی۔ تاریخ و تذکرہ کی متعدد کتابیں اس کے ذکر سے بھری ہیں۔ عبدالباقی نہاوندی نے تین جلدوں پر مشتمل ''مآثر رحیمی'' میں اس کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے:

''اکثر اوقات با اہل فضل و کمال صحبت داشتی، و شعرا و ظرفا در زمان دولت و وکالت او مرفہ الحال، فارغ البال بودند۔ ہمراہ این طبقہ و طائفہ را معزز و مکرم داشتی و سیم و زر در پیش ایشان بی سنگ وزن ریختی۔''(1)

پھر خان خاناں کی شوکت و حشمت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

''در تربیت و آیین سلطنت بسیاری کوشید و طریق زیب و زینت سلطنت بسیار خوب می داشت و نیکومی ورزید و اسباب شوکت و عظمتش بسیار و بی نہایت بود۔''(2)

عبدالرحیم خان خاناں کی ولادت ۹۶۴ھ کو لاہور میں ہوئی۔ وہ بیرم خاں کا بیٹا تھا اور والدہ جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی۔ اس طرح خان خاناں ایک ہندوستانی ماں کے بطن سے پیدا ہوا۔ اخلاق فاضلہ اور حسن سیرت اسے اپنے باپ سے ورثہ میں ملے تھے۔ ۹۶۴ھ میں حج پر جاتے وقت بیرم خاں نے شہادت پائی، اس وقت مرزا عبدالرحیم خانخاناں صرف چار برس کا تھا۔(3)

جمال خان میواتی کی بڑی بیٹی ہمایوں سے منسوب تھی۔ بیرم خان کی شہادت کے بعد اس کی اہلیہ پٹن سے آگرہ میں اکبر کے سامنے حاضر ہوئی۔ چونکہ جمال خاں کی بڑی بیٹی ہمایوں سے منسوب تھی، اس نسبت سے اکبر اعظم نے خان خاناں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر اس کی پرورش شروع کر دی۔ وہ اس کو محبت میں مرزا خان کہا کرتا تھا۔ اسی محبت میں اس کی شادی اپنے رضاعی بھائی مرزا عزیز خان کی بہن ماہ بانو سے کر دی۔ اکبر خان خاناں کو اپنے فرامین میں فرزند سے مخاطب کرتا تھا۔ اس نے خان خاناں کو ہر طرح کے اعزاز سے نوازا اور زیادہ تر سفر میں ہم رکاب رکھتا تھا۔ عمر کے بیسویں سال یعنی ۹۸۴ھ میں خان خاناں کو گجرات کی صوبہ داری ملی۔ ۹۸۸ھ میں خانخاناں شہزادہ سلیم کا اتالیق مقرر ہوا۔ خان خاناں کو کئی مہم پر بھیجا گیا اسی ایک مہم میں سرنج میں جب طرفین کی طرف سے صف آرائی ہوئی تو اس کا نقشہ مآثر رحیمی کے مولف نے اس طرح پیش کیا ہے:

نمود از دو خیل قیامی شکوہ — دو سدّ سکندر دو البرز کوہ
یکی را بہ کف تیغ آئینہ رنگ — بروں بردہ از آئینہ جنگ زنگ
علم ہا چو خور زیب این کہنہ طاق — مہ سر علم از علم در محاق
ز سم ستوران گردون شکوہ — بجنبید دشت و بلرزید کوہ
بہ دست آن یک آوارہ گرز درشت — چو دستی کہ بودش نمایان ز دشت
گرفتند گردان تفنگ ہا بہ چنگ — شد از ہر طرف گرم بازار جنگ
ز پرِّ عقاب آسمان در حجاب — ہوا از خدنگ آشیان عقاب
نمودار گشت از غبار سمند — زمین دگر بر سپہر بلند
خدنگ شکاری ہمہ لالہ گون — چو مرغان بسمل نشستہ بہ خون

(4)

مرزا خانخاناں کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور جب مال غنیمت تقسیم کیا جا رہا تھا تو اکبر اعظم نے خوش ہو کر خان خاناں کو پنج ہزاری منصب عطا کیا اور ''خان خاناں'' کے لقب سے سرفراز کیا۔ خان خاناں نے اس علاقے کے نظم و نسق کو منظم کیا اور جب تخریبی کارروائیوں کا سدّ باب کر کے احمد آباد پہنچا تو اس کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے اعتراف میں اس کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔

خان خاناں نے گجرات اور کاٹھیاواڑ میں مظفر گجراتی کی باغیانہ کارروائیوں کو بہ حسن و خوبی دبایا۔ ۹۹۳ھ میں اسے آگرہ واپس بلا لیا گیا۔ آگرہ پہنچ کر اس نے اکبر اعظم کو طرح طرح کے تحائف پیش کیے۔ اکبر نے بھی اپنی نوازشوں سے سرفراز کیا۔ صاحب ''مآثر رحیمی'' لکھتا ہے:

''وقتی کہ بہ در بار بادشاہی بر فتند، انواع و اقسام لطایف و ظرایف نفیس و تحف این ولایت کہ بہ تازگی مفتوح ساختہ بود، بہ رسم پیش کش وراہ آورد بہ نظر بادشاہ در آورد۔ در حقیقت ملک گیری و ملک ستانی و دانش و بینش خود را ظاہر ساخت و بہ انواع نوازشات سرفراز گشت و این قسم فتوحات کہ این بختیار نامدار را در اندک زمانی دست داد ہیچ یک از سلاطین زمان و جہان کشایان دوران را دست ندادہ۔''(5)

خان خاناں نے اکبر کی فرمائش پر ۹۹۸ھ میں ''تزک بابری'' کا ترجمہ ترکی سے فارسی زبان میں کر کے اس کے حضور میں پیش کیا اور داد پائی۔ ابوالفضل لکھتا ہے:

''درین روز خان خانان وقایع فردوس مکانی کہ از ترکی زبان بہ فارسی آوردہ بود، بہ ہمایون نظر در آورد، و در فراوان آفرین براندوخت۔''(6)

اسی سال خان خاناں وکیل کے عہدہ پر مامور کیا گیا اور اس کو جونپور کی جاگیر عطا کی گئی۔ اکبر نامہ میں ہے:

''از سوانح باز گردیدن وکالت بہ خان خانان چون کاروانی و بی آزی از باصیۂ حال آن گزین

دودمان آ گہی پیدایی داشت سیز دہم بدین والا پایہ سربلندی گرفت وجونپورا قطاع اوشد۔''(7)

۹۹۹ھ میں خان خاناں کو سندھ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا گیا، اس وقت اکبر لاہور میں تھا۔ اس نے خان خاناں کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ رخصت کیا، خود تھوڑی دور تک لاہور سے باہر آیا۔ اس کی معیت میں بڑے بڑے فوجی سردار بھیجے گئے۔ بڑی فوج کے علاوہ بحری بیڑے بھی اس لشکر کشی میں تھے۔

ملک الشعرا فیضیؔ نے خان خاناں کی پر شکوہ روانگی پر قطعۂ تاریخ کہا۔ وہ جنگی ہاتھیوں، توپچوں، تیر اندازوں کے درمیان ملتان پہنچا جو اس کو جاگیر میں دے دیا گیا تھا۔ اس مہم میں خان خاناں نے اپنی جنگی مہارت، سپہ گری اور جاں بازی سے سیوستان (سہاہوان) نصرا پور، انر پور وغیرہ میں بحری اور بری لڑائیاں لڑ کر پورے سندھ کو شاہی قلمرو میں داخل کر لیا۔ مرزا جانی نے بھی اپنی محبت کے ثبوت میں اپنی لڑکی کو خان خاناں کے لڑکے مرزا ایرج شاہنواز خاں کے حبالۂ عقد میں دے دیا۔ اس فتح پر بڑا جشن منایا گیا۔ ملا شکیبیؔ اصفہانی، نظیریؔ نیشاپوری، عرفیؔ شیرازی، یول قلی بیگ، بقائیؔ، غیوریؔ شوشتری، مغیثؔ محوی، حیاتیؔ گیلانی اور کامیؔ خراسانی وغیرہ نے اس موقع پر خان خاناں کی شان میں قصیدے کہے۔ ملا شکیبیؔ اصفہانی نے اس کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس کا مطلع یہ ہے:

همایی کہ بر چرخ کردی خرام گرفتی و آزاد کردی ز دام
(8)

ماثر رحیمی کے مولف کا بیان ہے کہ خان خاناں نے خاندیس میں اپنی عدل پروری اور رعایا نوازی کا بہترین ثبوت پیش کیا جس سے وہاں کے خواص وعوام پر اچھا اثر مرتب ہوا:

''جمہور سکنہ و عموم متوطنہ آن دیار و اہل آن ملک را دلاسہ نمودہ بہ الطاف بادشاہی و نوازشات خان خانانی مطمئن خاطر و آسودہ حال و فارغ البال ساختند۔''(9)

اس کے بعد اکبر اعظم نے خان خاناں کو راجو منا کی شکست کے لیے احمد نگر بھیجا جس نے مرتضیٰ نظام شاہی کے چچا شاہ علی کے لڑکے کو سردار بنا کر شورش شروع کر دی تھی۔ اس باغیانہ روش کو بھی اس نے کامیابی سے فرو کیا جس کی پوری تفصیل ماثر رحیمی میں موجود ہے۔ اس کا بیان ہے کہ خان خاناں کی گجرات اور سندھ وغیرہ کی فتوحات کی شہرت ایران کے شاہ عباس صفوی کے پاس پہنچی تو اس کی ملک گیری اور جہاں ستانی کے علاوہ اس کے انعام واحسان کی خبروں سے بھی متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو بھی کوئی خان خاناں جیسا سپہ سالار مل جاتا تو میں اپنی سلطنت اس کے حوالہ کر دیتا اور عیش وعشرت میں وقت گزارتا۔ وہ بار بار کہتا:

''درسلسلہ بادشاہان ترکمان بہ تخصیص سلاطین قراقونیلو کہ از نسل قرا یوسف اند و نسب این سپہ سالار بہ اومی پیوند واہل قسم شجاع و مدبری بہ ہم نرسیدہ۔''(10)

اکبر کے بعد جہانگیر تخت پر بیٹھا تو خان خاناں نے اس کے دوسرے سال جلوس میں دکن سے چالیس زنجیر ہاتھی، مرصع آلات، قیمتی کپڑے وغیرہ بھیجے جن کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگی۔ تیسرے سال جلوس میں

خود دربار میں خراج عقیدت پیش کرنے حاضر ہوا۔ اس کا ذکر جہاں گیر اس طرح کرتا ہے:

''خان خاناں میرے اتالیق کے بلند رتبہ پر رہنے کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ برہان پور سے میرے پاس آئے، ان پر میری ملاقات کا شوق اور خوشی اس طرح غالب ہوئی تھی کہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے پاؤں یا سر کے بل آئیں۔ حالت اضطراب میں میرے پاؤں پر گر پڑے، میں نے بھی بڑی محبت اور عنایت سے ان کا سر اٹھایا اور اپنی عطوفت و شفقت کی آغوش میں لے لیا۔ ان کے چہرے پر بوسہ دیا، انھوں نے موتی کی تسبیحیں، چند قطع لعل اور زمرد بھی نذرانے میں پیش کیے۔ ان جواہرات کی قیمت تین لاکھ روپے تھی، ان کے علاوہ اور بھی ہر قسم کی چیزیں تحفہ میں پیش کیں۔''(11)

خان خاناں لاہور میں بیمار پڑا اور دہلی پہنچ کر بہتر سال کی عمر میں ۱۰۳۶ھ میں وفات پائی۔ ''خان سپہ سالار'' اس کی تاریخ وفات ہے۔(12)

اقبال نامۂ جہاں گیری کا مولف مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی نے اس کا ماتم اس طرح کیا ہے:

''اسی زمانہ میں خان خاناں ولد بیرم خاں نے بہتر سال کی عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پائی۔ وہ اس دولت ابد قرین کے عظیم امرا میں تھے۔ حضرت عرش آشیانی (یعنی اکبر) ''انار اللہ برہانہ'' کے عہد سلطنت میں بڑی خدمات انجام دیں اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، جن میں اس کے تین بڑے نمایاں کام ہیں۔ ایک تو فتح گجرات اور مظفر خاں گجراتی کی شکست ہے۔ اسی فتح کی بدولت گجرات ہاتھ سے نکل کر پھر اولیائے دولت قاہرہ کے تصرف میں آیا۔ دوسرے فتح سہیل جو تینوں دکن کے لشکر مست اور جنگی ہاتھی اور ایک بڑا توپ خانہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس نے ستر ہزار سوار جمع کر لیے تھے، اس کے مقابلہ میں خان خاناں کے پاس بیس ہزار سوار تھے، پھر بھی وہ اس کے مقابلہ میں گیا اور دو دن ایک رات جنگ کر کے فتح حاصل کی۔ اسی مرد آزما معرکہ میں راجہ علی خاں جیسا سردار قتل ہوا۔ تیسری فتح ٹھٹھ و ملک سندھ۔ مگر شاہنشاہ جہاں گیر کے زمانہ دولت میں کارہائے نمایاں انجام نہ دے سکا۔ البتہ اس کے بیٹے شاہ نواز خاں نے تھوڑی فوج کے ساتھ عنبر کی فوج کو شکست دی۔ بلا مبالغہ نہایت لائق خانہ زاد تھا، اگر اجل اماں دیتی تو اس کے نیک آثار یادگار رہ جاتے۔ خان خاناں قابلیت اور استعد میں معیاری اور اپنے زمانہ میں یکتا تھا۔ عربی، ترکی، فارسی اور ہندی زبانیں خوب جانتا تھا، فارسی اور ہندی میں اچھے شعر کہتا تھا۔ اس نے واقعات بابری کو حضرت عرش آشیانی کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، بے شبہ اچھا سخن فہم تھا اور خود بھی شعر، غزل اور رباعی کہتا تھا۔''(13)

خان خاناں خود عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبان پر بڑی مہارت رکھتا تھا، عربی کی دقیق اور مشکل عبارت کے معانی آسانی سے بیان کر دیتا تھا۔ ایک بار شریفِ مکہ نے اکبر کو خط لکھا۔ عبارت اس قدر مشکل تھی کہ ابوالفضل، حکیم ابوالفتح گیلانی اور دربار کے دوسرے فضلا کو اس کے مفہوم سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت

محسوس ہوئی۔ خان خاناں نے اسے فوراً لیا خط کی عبارت پڑھتا جاتا اور ترجمہ کرتا جاتا تھا جس کی داد اکبر کے ساتھ تمام اہل دربار نے دی۔

خان خاناں کے کچھ خطوط کے نمونے مآثر رحیمی میں درج ہیں، ان ہی میں سے ایک حسب ذیل خط ہے، جو اس نے حکیم ابوالفتح گیلانی کو لکھا تھا۔

این قالب فرسودہ کہ از کوی تو دور است　　　القلب علی بابک لیلًا و نہاراً

''بی گانگی آن قدری کہ بہ دوحروف کاف ونون، ازموطن بطون، ہیجدہ ہزار عالم بہ جلوگاہ ظہور رسانیدہ و بہ وحدانیت آن قومی کہ ذرات کائنات رامطلع آفتاب احدیت ذات ومطرح انوار تجلیات گردانیدہ کہ تعطش زلال ووصال آن منبع فضل وافضال وکمال وتشوق تقبیل اقدام آن حمیدہ خصال بہ مرتبہ ایست کہ شرح آن ممکن نیست'' (14)

برین حدیث گواہ است عالم الاسرار　　　کہ در فراق تو دیگر نماندہ جای قرار

''ازین تکلفات باید درگذشت چون سلسلہ استکام تافت درعقد یگانگی و داد تکلف مراسم میزبانی نیست کہ بزرگان فرمودہ اند کہ بدترین یاران و دوستان آنست کہ بہ جہت آن تکلف باید کشید۔'' (15)

تکلف گر نباشد خوش توان زیست

خان خاناں کی فارسی نثر نگاری کا ایک اہم کارنامہ تزک بابری کا فارسی ترجمہ ہے۔ بابر نے اپنی یہ سوانح عمری ترکی زبان میں لکھی، جو ترکی کی انشا پردازی کے لحاظ سے بے مثل سمجھی جاتی ہے۔ مآثر رحیمی کے مولف نے خان خاناں کے ایک دیوان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ دیوان اب تک دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے اس کے کلام کے محاسن کا زیادہ اندازہ انھیں نمونوں سے ہوتا ہے جو مآثر رحیمی میں درج ہیں۔ اس کی غزلوں کے کچھ اشعار یہ ہیں:

تمام مہر و محبت شدم نمی دانم　　　کہ دل کدام و محبت کدام و تار کدام
در آفرینش تو قدسیان درین غلطند　　　کہ آفریدہ کدام، آفریدگار کدام
چو عشق پردہ براند اخت می توان دانست　　　کہ شرم سار کدام است و تازہ روی کدام

☆☆☆

ہر چند نیست بزم وصال تو با رقیب　　　شرم تو با ہزار نگہبان برابر است

☆☆☆

متاع جور و جفا کز جہان جہان داری　　　بیا بیا کہ دلم می کند خریداری

☆☆☆

نسیم وصل گویا می وزد از کوی یار امشب　　　کہ دل با نا امیدی ہا نمی گیر قرار امشب

☆☆☆☆☆

حواشی وتعلیقات:

1۔ بزم تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، ج ۱، ص ۲۳۲
2۔ مآثر رحیمی، عبدالباقی نہاوندی، ج ۲، ص ۸۰۷
3۔ ایضاً، ج ۱، ص ۶۹۴
4۔ ایضاً، ج ۱، ص ۳۳۴
5۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۴
6۔ ایضاً، ص ۵۷۰
7۔ اکبرنامہ، ج ۲، ص ۱۷۳
8-9۔ مآثر رحیمی، ص ۳۵۸
10۔ تزک جہاں گیری، ص ۶۴
11۔ مآثر رحیمی، ج ۱، ص ۷۰۸۔۷۰۷
12۔ اقبال نامہ جہاں گیری، ص ۲۸۷۔۸۹
13۔ مآثر رحیمی، ص ۵۵۶
14-15 ایضاً

☆☆☆☆☆

Dr. Syed Mohmmad Miyan
Post Doc. Fellow, University of Lucknow,
Lucknow 226007, Mob. 9335950740
Email: zaidisyedmohdmiyan@gmail.com

نظیرؔ اکبر آبادی اور ان کی فارسی شاعری

ارشد جمال

میر تقی میرؔ کے معاصرین شعرا کا تذکرہ جب بھی کیا جائے تو نظیرؔ اکبر آبادی کا ذکر کیے بغیر داستان نامکمل اور ناقص ہوگی۔ میر تقی میرؔ کی طرح نظیرؔ اکبر آبادی نے بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی، اور دونوں زبانوں کی شاعری ناقدین کی نظروں میں قدر و اہمیت کی حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظیرؔ اکبر آبادی فارسی زبان و ادب کے متبحر عالم و فاضل نہیں تھے لیکن عربی دانی کے ساتھ ساتھ فارسی دانی سے بھی متصف تھے اور اس زبان سے اس حد تک واقفیت رکھتے تھے کہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی بلکہ اردو کلام کی طرح فارسی کلام نے بھی اہل ذوق سے داد و تحسین حاصل کی۔

نظیرؔ اکبر آبادی کا نام ولی محمد اور تخلص نظیرؔ تھا۔ آپ کی ولادت ۱۷۳۵ء میں دہلی میں ہوئی۔ تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ نظیرؔ اپنے والدین کے چہیتے تھے کیونکہ وہ اپنی بارہ بہنوں اور بھائیوں میں سے تنہا زندہ رہے۔ ۱۷۴۷ء میں جب دہلی میں احمد شاہ ابدالی نے دھاوا بولا اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو دوسرے شرفا کی طرح پناہ کی تلاش میں نظیرؔ بھی اپنی ماں اور نانی کے ساتھ اکبر آباد (موجودہ آگرہ) ہجرت کر گئے اور محلہ تاج گنج میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد نظیرؔ اب دہلوی نہ ہو کر اکبر آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔

نظیرؔ اکبر آبادی عربی و فارسی اور اردو زبانوں کا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ خطاطی اور خوش نویسی میں بھی ماہر تھے۔ آپ کی شخصیت سادہ، دلنواز، دلفریب اور کلام بھی نہایت ہی جاذب دل ہے۔ نظیرؔ کی ذات میں توکل اور استغنا بہت تھا۔ اسی طرح خودداری بھی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی چنانچہ جب نواب سعادت علی خاں اور راجہ بھرت پور نے آپ کو اپنے دربار میں مدعو کیا تو بکمال استغنا ان کے یہاں حاضری سے انکار کر دیا۔

ابتدائے عمر میں نظیرؔ اکبر آبادی متھرا تشریف لے گئے تھے جہاں آپ نے تعلیم و تعلم اور تدریسی خدمات انجام دینی شروع کر دی لیکن آگرہ کی کشش نے انھیں دوبارہ آگرہ لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ آگرہ واپس آنے کے بعد نظیرؔ اکبر آبادی نے رام بلاس نامی شخص کے بچے کا معلم بن کر سترہ روپئے ماہوار پر کاروان زندگی کو رواں دواں کیا۔ عمر کے آخری حصہ میں جب کہ آپ کی عمر بہت طویل ہو چکی تھی فالج کا حملہ ہوا اور یہی مرض آپ کا مرض الموت ثابت ہوا۔ بالآخر ۱۶/اگست ۱۸۳۰ء میں واصل بحق ہو گئے۔

نظیرؔ اکبر آبادی کی شاعری پر اگر اردو زبان کے حوالے سے بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی شاعری عوامی جذبات و احساسات کی حقیقی ترجمان ہے۔ آپ کا کلام ہندوستانی راگ، ملکی مواد اور قومی موضوعات کا مرقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی علم و فن یا شعر گوئی کسی مخصوص طبقہ، خاندان یا افراد کا اجارہ نہیں

ہوتی بلکہ اسے جہاں بھی اختراع، جدت آفرینی، سوز و گداز اور ندرت خیالی کا ماحول ملتا ہے وہاں وہ اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔ نظیرؔ بھی بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ نہایت قادر الکلام، مرنجاں مرنج اور ہمہ رنگ آدمی تھے۔ آپ کو ایسی چیزوں نے متاثر کیا جو بادی النظر میں کسی توجہ کے لائق نہیں جیسے کہ آم کے باغات میں کوئل کی کوک یا ہندوستان کی دھرتی کا بنجارہ، بھوک مٹانے کی روزی، ہولی کے رنگ وغیرہ، چنانچہ نظیرؔ نہ صرف ان مناظر اور اشیا سے متاثر ہوئے بلکہ اپنی شاعری میں ان کی بھرپور عکاسی بھی کی ہے۔

اردو کے مشاہیر شعرا جیسے ولیؔ دکنی، مرزا جان جاناںؔ، محمد مصحفیؔ، محمد رفیع سوداؔ وغیرہ نے فارسی شاعری میں بھی کمال حاصل کیا ہے لیکن فارسی شاعری کے اندر اگر کہیں ہندوستانی راج اور ہندوستان کا دلکش ماحول نظر آتا ہے تو صرف نظیرؔ اکبر آبادی کے کلام میں جن کی آپ نے بھرپور منظر کشی کی ہے۔

نظیرؔ اکبر آبادی فارسی زبان و ادب کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ آپ کا فارسی کلام اردو دیوان کے ساتھ ہی ۱۹۵۱ء میں مدون ہو کر منظر عام پر آیا۔ کلیات نظیرؔ کی تبویب و تدریس مولانا اشرف علی لکھنوی اور مولانا عبدالباری نے کی جو نول کشور (والد محترم جناب والی آسی) پریس لکھنو سے زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس میں غزلیں، رباعیاں، واسوخت، نظمیں، منظوم خطوط اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ فارسی غزلیات، روایتی لبادے میں ملبوس ہیں جب کہ دیگر اصناف سخن کا مواد خالص ہندوستانی ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی کا انداز اور لب و لہجہ آسان، سلیس، منفرد اور دلچسپ ہے۔ آپ کی فارسی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اردو کی طرح فارسی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور شعر گوئی پر قدرت بھی۔ مگر آپ نے فارسی شاعری کو صرف تفنن طبع، اظہار علمیت اور اپنے حلقۂ احباب خاص کی ضیافت کے لیے اختیار کیا۔ اسی وجہ سے ادھر بہت زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ آپ کی فارسی شاعری کے اندر ہندی کے ثقیل، غریب اور نامانوس الفاظ کی کثرت سے ملاوٹ ہے۔ جس سے فارسی شاعری کا حسن متاثر ہوا اور اس کی شیرینی مجروح بھی ہوئی۔

نظیرؔ اکبر آبادی عوامی شاعر تھے اور ان کے فکر و خیال پر عمومیت پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ آپ کی شاعری کو خواہ ادب عالیہ میں کوئی خاص درجہ نہ دیا جائے لیکن ان کی نظموں میں وطن پرستی اور انسان دوستی کی جلوہ سامانی بھرپور موجود ہے۔

نظیرا کبر آبادی کے فارسی اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غزلوں کا ایک معتد بہ حصہ موجود ہے گو کہ دیگر اصناف سخن بھی اس میں شامل ہیں لیکن غزلوں کا تناسب زیادہ ہے۔ نقادوں نے آپ کی غزلوں پر نقد کیا ہے اور اسے معیار سے فروتر قرار دیا ہے لیکن ان غزلوں کی روانی، شستگی، شگفتگی، سلاست اور انداز بیان کی ہر ایک نے تعریف کی اور ان خوبیوں کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی کی غزلیں قدرے کم ذائقہ ہیں۔

ای سروقد بیا کہ بہ امید دیدنت — مشتاق توبہ زیر درختی فتادہ است
خاطرم یافت از تبسم او — انبساطی کہ شرح نتواں کرد

گفتم کہ گرم بوسہ دلم دارد از لبت   گفتا بگیر تا دل تو لذتش برد

متاخرین شعرائے ایران کے زمانے میں جب غزلوں میں تنوع بہت زیادہ نہیں رہ گیا اور معاملہ بندی نے بہت زیادہ ترقی کے منازل طے کر لیے تو وحشیؔ یزدی نے ایک جدید صنف سخن واسوخت سے، جس کا وہ امام بھی تسلیم کیا جاتا ہے، ادبی دنیا کو روشناس کرایا۔ بہت کم شعرا نے اس صنف کو لائق اعتنا سمجھا لیکن نظیرؔ اکبرآبادی نے اس صنف پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اس صنف کے اندر اپنی پریشاں حالی، بے سروسامانی، محرومی اور غربت و افلاس واجنبیت کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا۔

دوستان! شرح پریشانی من گوش کنید   قصۂ بی سروسامانی من گوش کنید
گفتگوی من و جر احی من گوش کنید   داستان غم تنہائی من گوش کنید
شرح این آتش جان سوز نگفتن تا کی؟   سوختم سوختم این سوز نہفتن تا کی؟

نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری میں غزلوں اور واسوخت کے علاوہ منظوم خطوط بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ خطوط بلاعنوان، مسلسل اور مثنوی کے طرز پر لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں مکتوب الیہ کا پتہ نہیں معلوم لیکن بقول شاعر: ع

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

ان کا ماننا ہے کہ نظیرؔ اکبرآبادی بھی ایک گلبدن پردہ نشین پر جان دیتے تھے لہٰذا قرائن کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مکتوب الیہ وہی معشوق ہے جو پردہ نگاری میں مستور ہے۔ ان اشعار کی زبان سچے جذبے، واردات قلبی، عشق و محبت اور فراق و وصال جیسی کیفیات سے لبریز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چمن رو مہر سیما سرو قامت   بہار گلشن خوبی سلامت
پس از عرض سلام الفت آباد   مبرہن بر دل عشرت قرین باد
کہ دوش آمد بہ گوش این منتظر را   ز ہر سو این نوید فرحت افزا
بحمد اللہ امید الفت آمود   ہمین بود و ہمین بود و ہمین بود
اگرچہ بہر وصلش بر در آیم   کہ طائر سان بہ پرواز اندر آیم

براعظم ایشیا کے شعرا پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں کائنات اور زندگی کے عام موضوعات کو عنوان سخن نہیں بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنی کتاب شعرالعجم کے حصہ دوم میں اس رائے کی تائید کی ہے اور اظہار بھی۔ لیکن نظیرؔ اکبرآبادی نے ان عام موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کر کے وصف نگاری کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظیرؔ کے قبل حضرت امیر خسروؔ نے اس پر اپنی توجہ صرف کی تھی۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو نظیرؔ اکبرآبادی کا یہ عمل تقلیدی کاوش کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن ان کے فارسی اشعار کے مطالعے سے ان کی وسعت فکر و نظر اور عوامی زندگی و عام ماحولیات سے گہرے روابط کا

بخوبی اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ "روضۂ تاج گنج"، "دریائے جمنا"، "دسہرہ"، "صفت چراغ"، "حقہ" وغیرہ عناوین کے تحت مختلف نظمیں ہمارے دعوے کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ ان میں سے بعض نظموں کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

روضہ تاج گنج:

فضایش پر بہار و نزہت افزا   بہ ہر جا نرگس و نسرین مہیا
چنیں خوبی کہ از ہر سو عیان است   ہمہ از دولت شاہجہان است

دریائے جمنا:

زجمنا عالمی صد عیش یاب است   بہ خوبی خوش تر از کر خوش آب است
ز آبش ماند این جا مثل گلشن   چراغ خضر تا سازند روشن

دسہرہ:

صف اول تماشا زینت افزا   ہمہ اسباب خوش وقتی مہیا
برای نیلکنٹھ از یمن بہرہ   زہی فرحت فزا روز دسہرہ

مذکورہ بالا عناوین کے تحت جو اشعار پیش کیے گئے ہیں نقادوں نے انھیں اپنی اصطلاح میں وصف نگاری کا مرقع گردانا ہے۔ نظیرؔ اکبرآبادی، میر محمد تقی میرؔ کے ہم عصر ہیں، اگرچہ انھوں نے بھی میر تقی میرؔ کی طرح اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے اور غزل کے گیسو بھی سنوارے ہیں لیکن جو مشاقگی ہمیں میر تقی میرؔ کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ نظیرؔ کے یہاں عنقا ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات:

(۱)۔روح نظیر، مؤلف سید محمود رضوی/محمد اکبرآبادی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

(۲)۔شعر العجم (حصہ دوم)، علامہ شبلی نعمانی، معارف پریس، اعظم گڑھ

(۳)۔کلیات نظیر اکبرآبادی، مرتب عبدالباری واشرف علی لکھنوی، راجہ رام کمار پریس، لکھنو، ۱۹۵۱ء

(۴)۔تاریخ ادب اردو، اعجاز حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء

☆☆☆☆☆

Arshad Jamal
Research Scholar, Dept. of Persian,
Banaras Hindu Universuty, Varanasi-221005
Mob. 9918713230, 9454287181,
E-Mail: jamal.arshad229@gmail.com

حریت کا علمبردار ادیب وصحافی احمد لطفی السید

ارمان احمد

بیسویں صدی کے نصف اول میں مصر کی حریت اور معاشرے کی اصلاح کے لیے جن لوگوں نے نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں احمد لطفی السید کا نام کافی نمایاں ہے۔ احمد لطفی کی شخصیت پہلودار تھی۔ وہ بیک وقت ادیب، صحافی، قانون داں، سیاست داں اور ایک اچھے استاد تھے۔ صوبہ دقہلیہ کے ایک گاؤں برقین میں ۱۵ جنوری ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام السید پاشا ابوعلی تھا۔ وہ رئیس ہونے کے ساتھ پروقار شخصیت کے مالک بھی تھے۔ آپ کا خاندان بلند کردار اور خودداری کی وجہ سے اطراف و جوانب میں بہت معروف تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے چار سال کی عمر میں شروع ہوئی۔ چھ سال احمد لطفی نے اس مکتب میں گزارے، یہیں لکھنا پڑھنا سیکھا اور قرآن کریم حفظ کیا۔ ۱۸۸۲ء میں آپ کے والد نے منصورہ کے ابتدائی مدرسہ میں آپ کو داخل کیا، جہاں آپ نے تین سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ مدرسہ خدیویہ، قاہرہ منتقل ہو گئے اور ۱۸۸۹ء میں ثانوی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔

ثانوی درجات سے فراغت کے بعد لا کالج میں داخلہ لیا اور پانچ سال گزار کر لا کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں کے اساتذہ میں حفنی ناصف اور حسونہ نوادی قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر بعد میں شیخ الازہر بنائے گئے، وہ احمد لطفی کو بہت مانتے تھے۔ لا کالج میں احمد لطفی کی ملاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوئی، انھوں نے آپ کا لکھا مقالہ ''حق الحکومۃ فی معافیۃ الجانی'' دیکھا اور اس کی تعریف کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ احمد لطفی نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مجلہ ''التشریع'' جاری کیا اور ''المؤید'' میں لکھنا شروع کیا۔ لا کالج میں تعلیم کے دوران آپ نے استنبول کا سفر کیا اور کافی وقت وہاں گزارے۔ دوران قیام استنبول سعد زغلول، المؤید کے مالک علی یوسف اور جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی۔ اس عرصہ میں احمد لطفی نے جمال الدین افغانی سے خوب استفادہ کیا اور ان کے افکار وخیالات سے واقف ہوئے۔

۱۸۹۲ء میں قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کی تقرری بحیثیت محرر عدالت میں ہو گئی۔ اسی سال خدیو عباس نے اپنے والد کے انتقال کے بعد جب حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں لی تو انگریزی تسلط سے آزادی کے لیے دانشمند طبقے سے مدد طلب کی۔ مصطفی کامل اور شیخ فرید کے ساتھ آپ نے ''الحزب الوطنی'' کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد آپ ایک منصوبہ کے تحت سرکاری ملازمت سے علاحدگی اختیار کر کے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ یہ سفر خدیو عباس کے تعاون اور وطن کی آزادی کے لیے تھا۔ ان دنوں وہاں محمد عبدہ، قاسم امین اور سعد زغلول موجود تھے، احمد لطفی کو ان حضرات کی صحبت حاصل رہی۔

مصر واپس آ کر آپ مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے، پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۹/ مارچ ۱۹۰۷ء

کو ''الجریدۃ'' نامی اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار کے ذریعہ احمد لطفی نے ملک وقوم کی غیر معمولی خدمت انجام دی۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۰۷ء کو مصر کے کچھ باشعور اور دانشور لوگوں کے ساتھ مل کر آپ نے ''حزب الامۃ'' کی بنیاد ڈالی اور اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ یہ جماعت مصر کی مکمل آزادی کے لیے کوشاں تھی۔ ''الجریدۃ'' اس جماعت کا ترجمان بن گیا اور احمد لطفی نے سات سال تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ احمد لطفی نے اپنے مضامین میں مصر کی مکمل آزادی کی بات اٹھائی اور پارلیمانی نظام کی خواہش ظاہر کی۔ انھیں اصول و نظریات کے تحت احمد لطفی اپنے رسالہ میں سیاسی وسماجی مضامین لکھتے اور اپنی پارٹی کی سیاسی واصلاحی دعوتوں کی تصویر پیش کرتے۔ انھوں نے یہ سلسلہ سات سال تک جاری رکھا اور اسی وجہ سے ان کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جب پہلی جنگ عظیم کی ابتدا ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور انگلینڈ نے مصر میں ایمرجنسی نافذ کر دی تو احمد لطفی نے انگریزوں کے نمائندوں سے ملاقات کی لیکن انھیں مایوسی ہوئی۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان حالات میں سیاسی جدوجہد اور مصر کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا تقریباً سات سال ''الجریدۃ'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کے دوران احمد لطفی نے ''الجریدۃ'' کی ادارت سے استعفی دے دیا اور اپنے گاؤں برقین چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد احمد لطفی واپس آئے اور بنی سیوف میں رئیس النیابۃ بنائے گئے۔ اس کے بعد دار الکتب المصریہ کے ناظم بنائے گئے۔ اس دوران ارسطو کی بعض کتابوں کا ترجمہ شروع کیا۔ ۱۹۱۸ء میں دار الکتب المصریہ سے استعفی دے دیا اور اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ''الوفد المصری'' کے نام سے ایک پارٹی قائم کی۔ اس کے بینر تلے آزادی وطن کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ لیکن جب پارٹی کے ممبروں کے درمیان اختلاف ہوا تو احمد لطفی نے سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی اور دار الکتب المصریہ میں دوبارہ کام شروع کیا۔ اسی دوران آپ نے ارسطو کی کتاب ''کتاب الاخلاق'' کی پانچ فصلوں کا ترجمہ کیا۔

احمد لطفی کو ۱۹۲۵ء میں قاہرہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ اس وقت تک اس یونیورسٹی میں صرف لڑکوں کا داخلہ ہوتا تھا۔ آپ نے اس یونیورسٹی کا دروازہ لڑکیوں کے لیے بھی کھول دیا اور خواتین مصر کو حقیقی ترقی سے سرفراز کرنے کا جو خواب آپ کے دوست قاسم امین نے صدی کے آغاز میں دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔ (قاسم امین نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تحریر المراۃ'' کا کچھ حصہ، کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی آپ کو پڑھ کر سنایا تھا جسے آپ نے بہت پسند کیا تھا۔ یہ کتاب عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق پر لکھی گئی ہے۔) ۱۹۲۸ء میں محمد محمود پاشا نے جب وزارت تشکیل دی تو احمد لطفی کو وزیر تعلیم بنایا۔ ۱۹۲۹ء میں وزارت سے مستعفی ہوئے، پھر ۱۹۳۰ء میں دوبارہ وائس چانسلر بنائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں اسمٰعیل صدقی کی وزارت کے زمانے میں طہ حسین کو جب آرٹس فیکلٹی کی ڈین شپ سے احتجاجی مظاہرے کے نتیجے میں برطرف کر دیا گیا تو یونیورسٹی کی آزادی پر قدغن لگانے کو لے کر احمد لطفی بہت ناراض ہوئے اور احتجاجاً اپنا استعفی دے دیا۔ صدقی کی وزارت ختم ہونے کے بعد اپریل ۱۹۳۵ء میں پھر یونیورسٹی واپس آ گئے اور ۱۹۴۱ء تک قاہرہ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۳۲ء میں احمد لطفی نے ارسطو کی کتاب ''الکون والفساد'' شائع کی۔ ۱۹۳۵ء میں ''الطبیعۃ'' اور ۱۹۴۰ء میں ''السیاسۃ'' شائع کی۔ السیاسۃ ارسطو کی وہ آخری کتاب ہے جسے لطفی نے عربی میں منتقل کیا ہے۔ آپ نے حقوق نسواں کی علمبردار باحثہ بادیہ کی عورتوں کے حقوق پر لکھی کتاب ''النسائیات'' پر ایک طویل مقدمہ بھی تحریر کیا تھا، جس میں آپ نے ان کی حقوق نسواں کی دعوت کی تعریف و تحسین کی ہے۔

۱۹۴۱ء میں احمد لطفی کو ممبر پارلیمان منتخب کرلیا گیا۔ اس کے بعد انھیں ''المجمع اللغوی'' کا صدر بنایا گیا اور آپ تاحیات اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی فکری کوششوں اور سماجی علوم میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں ملک کے توصیفی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

احمد لطفی نے الجریدہ اور مختلف رسائل میں حصول آزادی کے لیے بے شمار مقالات تحریر کیے۔ آپ آزادی کے حد درجہ دلدادہ تھے۔ آپ نے آزادی کو ''مفتاح النجاۃ'' قرار دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ حریت کے بغیر دنیا کے تمام کام لاحاصل ہیں۔ اس کے لیے انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ ہر دور میں حریت کے لیے کشمکش رہی ہے۔ آپ کا کہنا تھا کہ آزاد قوم کی شناخت یہ ہے کہ وہ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے سے باز نہ آئے۔ کیونکہ غلامی کی زندگی بسر کرنے والی قوم ہمیشہ ذلیل و خوار رہی ہے۔ تمام فضل و کمال کی معراج آزادی ہے۔ احمد لطفی اس کے لیے ہر موقع پر برسر پیکار رہے۔ ان کے یہاں حریت کا حصول ہی ادب وصحافت کا اصل مفہوم ہے۔ آپ کے مقالات کو تین حصوں یعنی معاشرتی مقالات، سیاسی مقالات اور ادبی مقالات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

احمد لطفی کو زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ ان کے مقالات ادبی وفنی خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں جاذبیت، شگفتگی، شائستگی اور رعنائی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک طرح کا سبک پن آپ کی تحریر کا خاصہ ہے نیز اس میں جدت کی بھی آمیزش ہے۔ کیونکہ جس طرح احمد لطفی کو عربی زبان پر قدرت حاصل تھی اسی طرح مغربی ادب وثقافت پر بھی عبور حاصل تھا۔ آپ عبارت آرائی کا ہرگز اہتمام نہیں کرتے تھے، اس کے باوجود آپ کی تحریروں میں علمیت کی جھلک موجود ہے۔ احمد لطفی فلسفیانہ ذہن کے مالک تھے، آپ نے مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ آپ قانون داں، ادیب اور انشا پرداز تھے، پھر بھی آپ کا بیشتر وقت سیاسی مسائل کے غور وخوض میں گزرتا تھا۔ آپ نے مختلف موضوعات کے لحاظ سے مختلف اسالیب اختیار کئے ہیں۔ صلاح الدین عمری احمد لطفی کی تحریروں کی خصوصیتیں بتاتے ہوئے ''مصر میں مقالہ نگاری کی ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک تو ان کی تحریروں میں صداقت و دیانت پائی جاتی ہے۔ وہ ہر بات کو تحلیل و تعلیل کے بعد پیش کرتے۔ ان کی باتوں میں فلسفیانہ عنصر شامل ہوتا کیونکہ انھوں نے فلسفہ کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ تیسرے وہ اپنی فکر کو پیش کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا استعمال کرتے۔ چوتھے وہ عبارت آرائی سے عدم توجہی برتتے کیونکہ وہ مختلف افکار ونظریات کے حامل تھے اور یورپین اسلوب بیان سے متاثر بھی۔ پانچوی چیز جو ان کے یہاں ہے وہ انکا علمی انداز ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے یہاں علوم وفنون

> کی اس قدر کثرت ہے کہ اسلوب کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ یہ چیز انھیں کثرت مطالعہ سے ملی تھی۔ چھٹی چیز یہ کہ وہ اکثر مواقع پر خالص مصری تراکیب اور عوامی الفاظ استعمال کرتے جن کا فصیح عربی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ساتویں چیز یہ کہ ان کی تحریروں میں ہلکی سی ظرافت بھی ملتی ہے۔ آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں شرافت اور سنجیدگی ملتی ہے۔ وہ سطحیت سے گریز کرتے ہیں، وہ تنقید اور کسی کی تردید میں حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ نویں خصوصیت ان کی تحریروں کی یہ ہے کہ ان میں کامل اعتماد پایا جاتا ہے۔ وہ انھیں الفاظ، تراکیب وتشبیہات کو لاتے ہیں جن پر انھیں کامل اعتماد ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے افکار واسالیب کی تقلید کو ناپسند کرتے ہیں اور آخری ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اسلوب میں تنوع ہے۔ یہ ان کے ادیب ہونے اور کثیر المطالعہ ہونے کی علامت ہے۔''

طٰہ حسین نے ان کے اسالیب کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا کہ چونکہ وہ ایک مصلح اور داعی تھے، اس لیے قدامت کی تطہیر وتہذیب کی طرف انھوں نے توجہ دی اور وہ اس کے ابہام وضعف کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے ان کی تحریریں حریت اور صراحت کی نمائندہ ہیں وہ عقلیت پر زور دیتی ہیں۔ ان کے الفاظ و معانی میں ایک حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں انسانی شخصیت کا احترام واعتراف پایا جاتا ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ احمد لطفی کے اسلوب میں جو بانکپن اور تخلیقی قوت ہے وہ کسی اور ادیب کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اس میں ایک خاص قسم کی کشش اور فرحت وانبساط ہے اور وہ ان کی شخصیت کی آئینہ دار بھی ہے۔ احمد لطفی اپنے طرز تحریر کے موجد ہیں جس میں ان کی اپنی شناخت کارفرما ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ آپ اپنی تحریروں کی وجہ سے عربی زبان وادب میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

کتابیات:

(1) مصر میں مقالہ نگاری کا ارتقا، اصلاحی، ابوسفیان، لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء
(2) جدید عربی ادب، انجم، شمس کمال، الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
(3) ادب المقالۃ الصحیفۃ فی مصر، حمزہ، عبداللطیف، دار الفکر العربی، قاہرہ
(4) مصر میں آزادی نسواں کی تحریک، ریحانہ، سطوت، مکتبہ تحقیق وتصنیف، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء
(5) مصر کی ادبی صحافت ایک تنقیدی مطالعہ، ندوی، محسن عثمانی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۹ء
(6) احمد لطفی السید، ہیکل، محمد حسین، المطبعۃ المصریۃ، قاہرہ، ۱۹۵۸ء

☆☆☆☆☆

Arman Ahmad
Research Scholar, Dept. of Arabic,
Banaras Hindu University, Varanasi 221005
Mob. 9918902257,
E-Mail: armanahmad.arabic@gmail.com

امام شافعیؒ: شخصیت اور شاعری

عبیدالرحمان قاسمی

امام شافعی (ابوعبداللہ محمد بن ادریس قرشی مطلبی ہاشمی ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء- ۲۰۴ھ/ ۸۲۰ء) ائمۂ اربعہ (1) میں سے ایک ہیں۔ کنیت ابوعبداللہ ہے، نسبتاً قریشی ہیں۔ شافعی نسبت آپ کے جدامجد شافع بن سائب کی طرف ہے۔ ربیع بن سلیمان مرادی کے مطابق امام شافعیؒ کا نسب ''ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن یزید بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف قرشی مطلبی ہاشمی'' ہے(2) صحیح روایت کے مطابق فلسطین کے شہر غزہ میں پیدا ہوئے۔ آپ یتیم تھے۔ نسب ضائع ہونے کے خدشے اور بچے کی صحیح تعلیم وتربیت کے پیش نظر آپ کی والدہ فاطمہ بنت عبداللہ(3) دوسال کی عمر میں آپ کو مکہ لے آئیں۔

ان دنوں آپ کی والدہ نہایت تنگ دستی میں زندگی گزار رہی تھیں۔ مکتب میں فیس نہ ادا کر سکنے کی وجہ سے معلم کی کوئی خاص توجہ آپ پر نہیں تھی۔ مگر امام شافعی نے اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے معلم کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ معلم جو کچھ پڑھاتا اس کو زبانی یاد کر لیتے اور بعد میں دوسرے بچوں کو یاد کراتے تھے۔ تعلیم کے علاوہ انھیں تیراندازی اور گھوڑسواری کا بہت شوق تھا۔ تیراندازی کے بارے میں خودان کا بیان ہے کہ''

''اگر میں دس تیر چلاتا تو دس کے دس نشانے پر لگتے تھے۔ ان سب کے باوجود ان کو اصل لگاؤ حصول علم سے تھا۔ سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ دس سال کی عمر میں مؤطا امام مالک حفظ کر لی۔ جب امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مؤطا امام مالک زبانی سنائی اور یہی بات امام مالکؒ سے قربت کا ذریعہ بنی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد آپ قبیلہ بنی ہذیل چلے گئے۔ یہ قبیلہ فصاحت وبلاغت اور شاعری میں بہت مشہور تھا۔ اور سترہ (۱۷) سال تک سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ آپ کو قبیلۂ ہذیل کے دس ہزار اشعار یاد ہوگئے تھے۔ امام لغت اصمعی (4) نے آپ سے قبیلۂ ہذیل کے اشعار پڑھے اور محفوظ اشعار کی تصحیح کرائی۔ ابن خلکان کے الفاظ ہیں:

''

''(5)

قبیلۂ ہذیل سے واپس ہوکر مکہ تشریف لے گئے اور حصول علم میں مشغول ہوگئے۔ اس زمانہ میں ان پر شعرو شاعری اور فصاحت وبلاغت کا غلبہ رہا۔ مگر آل زبیر کے ایک بزرگ نے آپ کی فصاحت وبلاغت اور عربی زبان و اشعار پر قدرت دیکھ کر آپ کو فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کی نصیحت کی، انھیں بزرگ کی تشویق پر امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی۔

آپ مدینہ سے امام مالکؒ کے درس سے مستفید ہوکر مکہ تشریف لے آئے اور یہاں درس وتدریس کا

کام شروع کیا۔ لیکن چند دنوں بعد امیر یمن کے ساتھ یمن تشریف لے گئے اور وہاں منصب امارت پر فائز رہے؛ لیکن یہ بات آپ کے اساتذہ کو پسند نہ آئی کہ درس وتدریس چھوڑ کر منصب امارت سنبھالیں۔ لہٰذا اپنے استاد سفیان بن عیینہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے بغداد گئے اور وہاں محمد بن حسن شیبانیؒ سے فقہ کی تکمیل کی۔ آپ کہتے ہیں'' ''میں امام مالک اور امام محمد کو اپنا استاذ تسلیم کرتا ہوں۔(6) نیز کہتے ہیں:

''

''۔(7)

(یعنی لوگ اگر فقہا کے بارے میں انصاف سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے محمد بن حسن شیبانی جیسا فقیہ نہیں دیکھا۔ اور میں کبھی آپ سے زیادہ فقیہ کی مجلس میں نہیں بیٹھا، اور علم فقہ میں میری زبان اتنی نہ کھلی۔ آپ کو فقہ میں اتنی مہارت تھی کہ بڑے بڑے لوگ عاجز تھے۔)

اور وہیں بغداد میں اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ اس دور کے بڑے بڑے علما آپ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور علوم حاصل کیے۔ اُن میں سرفہرست امام احمد بن حنبلؒ ہیں، یہاں تک کہ امام احمدؒ نے آپ کے بارے میں فرمایا'' ''یعنی حدیث کے ناسخ ومنسوخ ہونے کا علم مجھے امام شافعیؒ کی مجلس سے ملا۔(8)

ان کو شروع سے تحصیل علم سے رغبت تھی۔ ذکاوت وذہانت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوب قوت حافظہ عطا فرمائی تھی۔ ذکاوت وذہانت اور حافظے کا اثر ہی تھا کہ آپ کو عربی کے تمام علوم قرآن وحدیث، بلاغت وعروض اور شاعری وغیرہ پر مکمل عبور تھا۔ آپ برجستہ اشعار بھی کہتے تھے۔ آپ کی بہت سی عبارتیں اور اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برجستگی، سلاست، الفاظ کی ندرت، خیال وفکر کی پاکیزگی، نیز سچائی اور حق گوئی آپ کی شاعری کا خاص امتیاز ہے۔ عربی زبان وادب پر اتنی قدرت کے باوجود آپ نے شاعری کو بطور تفنن نہیں اپنایا بلکہ وقتاً فوقتاً اشعار کہتے رہے جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ماضی قریب کے چند محققین کی کوششوں سے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ شعروشاعری کے سلسلے میں آپ کے نظریے کا اندازہ آپ کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

(اگر شعر علما کی شان کے منافی نہ ہوتا تو میں لبید بن ربیعہ عامری سے بڑا شاعر ہوتا)

مولانا نورعالم خلیل امینی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''امام شافعیؒ ناقدین ادب وزبان کے نزدیک بلاشبہ وفی الواقع لبید اور اُن کے ہم رتبہ شاعروں سے بڑے شاعر تھے''۔(9)

ان کی شاعری کے علاوہ عربی اقوال اور نصائح زبان زد خاص و عام ہیں۔خود انھیں کا بیان ہے کہ میں نے عربی شعروادب اور لغت کو دین میں تعاون کے لیے حاصل کیا ہے۔ان کے حکیمانہ اقوال میں عربی ادب و انشا کی حلاوت ہے۔اُن میں حکمت ودانش کے ساتھ فصاحت وبلاغت کی چاشنی بھی ہے۔کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

ایک دن کسی نے ان کی حالت دریافت کی تو آپ نے فصیح وبلیغ عربی میں جواب دیا۔

''

''۔

(یعنی اس کی کیا حالت ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ قرآن کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنت کا، فرشتے بولی ہوئی باتوں کا، شیطان گناہوں کا، زمانہ اپنے مصائب کا، نفس اپنی خواہشوں کا، اہل وعیال روزی کا اور ملک الموت قبض روح کا مطالبہ کرتا ہے۔)

امام شافعی نے ایک شخص کی خوبی اس طرح بیان کی:

''

''۔

واللہ وہ شخص آنکھوں کو حسن و جمال اور کانوں کو فصاحت و بلاغت سے بھر دیتا ہے۔

تحصیل علم کے بارے میں فرماتے ہیں:

''

''۔

یہ علم دین کوئی شخص مال داری اور عزت نفس سے حاصل کرکے کامیاب نہیں ہوسکتا ہے البتہ جو شخص نفس کی ذلت اور فقر ومحتاجی اور علم کی حرمت کے ساتھ اس کو حاصل کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔(10)

نیز قرآن کریم کی عظمت، حدیث شریف کی حجت اور فقہ کی قدر و قیمت، عربی زبان اور علم حساب کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''

''(11)

رہی امام شافعیؒ کی شاعری تو جتنے موضوع پر آپ نے اشعار کہے ہیں اُن سب کا تعلق انسانی زندگی اور معاملات سے ہے اور یہ صرف اشعار ہی نہیں ہیں جن میں عمدہ الفاظ اور شائستہ ترکیب کی آمیزش ہو؛ بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں کہے گئے وہ حکیمانہ اقوال ہیں جو جینے کا سلیقہ بتانے کے ساتھ ساتھ بہترین نصیحت کا بھی درجہ رکھتے ہیں۔انھوں نے جن موضوعات پر اشعار کہے ہیں اُن کو مولانا نور عالم خلیل امینی اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھتے ہیں:

''امام صاحبؒ نے قضاوقدر پر رضامندی، دعا کی اہمیت، کمینے کے جواب میں خاموشی، سفر کی اہمیت، خودداری، قسمت کے کھیل، ظاہر کی فریب دہی، خواہش نفس کی مخالفت، عالی ظرفی وخوش اخلاقی، پاکیزہ مذاق وخوش طبعی، بڑھاپے میں نیکی پر توجہ، صبر وقناعت، اخلاقی عظمت، سخاوت کی فضیلت، بخل کی مذمت، نیکوں سے دوستی، علم وتقویٰ کی فضیلت، مصیبت کے بعد راحت، خاموشی کی حکمت، لالچ سے پرہیز، فقہ وتصوف کے تلازم، اللہ کی رحمت کی امید، ناامیدی سے اجتناب، انسانی آرزوؤں کی بے پناہی، تسلیم ورضا کی قدر و قیمت، غم زمانہ کی ناگزیریت، ادائیگی حقوق کی ترغیب، مصیبت کے وقت غم گساروں اور مددگاروں کی کمی، علما کا وقار، انسانوں کی بے وفائی، آدابِ مناظرہ، آخرت کی تیاری، عفو الٰہی، انسان کی عظمت لباس سے نہیں بلکہ کمال سے ہے، مخلص دوستوں کی ضرورت، زندگی میں احتیاط کی اہمیت، دنوں کا الٹ پھیر، برے ہمنشیں سے اجتناب، ذلت سے احتراز، لوگوں کے لیے عذرخواہی، وفا شعار دوستوں کی قلت، آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت، آدابِ نصیحت، حاسدوں کی شر پسندی، عیب نفس پر توجہ کی ضرورت، طبائع انسانی کی بگاڑ کی وجہ، توکل علی اللہ کی اثر انگیزی، ذلت سوال سے پرہیز، انسانی محاسن، ملوک وامرا سے دوری، حصول بلندی کی راہ، بلند ہمتی، فقیہ، سردار اور مال دار کب اس لقب کا مستحق ہوتا ہے، اپنی پاک دامنی سے عورتیں بھی پاک دامن رہتی ہیں، دوسروں کی آبرو کی حفاظت، ایثار و قربانی مشیت الٰہی، انسان خود اپنی بلاؤں کا سبب ہے، احسان اٹھانے کی تلخی، زبان کی حفاظت، جیسا کرنا ویسا بھرنا، عزت نفس کا خیال، بدگوئی سے اجتناب، ایمان ونیکی کی اہمیت کے علاوہ بہت سے موضوعات پر انتہائی خوب صورت اور فصیح وبلیغ شعر کہے ہیں''(12)

ہم یہاں امام شافعیؒ کی شاعری کا نمونہ مع ترجمہ پیش کرتے ہیں۔اشعار اور ترجمہ طاہر الاسلام قاسمی کی مرتب اور ترجمہ کردہ کتاب ''دیوانِ امام شافعیؒ'' سے ماخوذ ہیں۔ایمان کے سلسلے میں امام صاحب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

(صبر جمیل سے کام لو، پھر دیکھو کشادگی کتنی قریب ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کو کاموں پر نگراں بنایا اُس نے نجات پائی، جس نے اپنے قول وعمل میں اللہ کے لیے اخلاص اختیار کیا وہ مصائب سے محفوظ رہا اور جو اللہ سے امید باندھے وہ پوری ہوکر رہے۔)

نیز فرماتے ہیں:

(بعض سانحے نوجوان کو عاجز کردیتے ہیں، حالاں کہ اس سے نکلنا مقدر ہوتا ہے، افتاد پڑتی ہے اور جب وہ اپنے پنجے جمالیتی ہے تو بلا وہم وگمان اُس سے کشادگی کی راہ نکل آتی ہے۔)

امام شافعی ان اشعار میں واضح طور پر یہ بتلا رہے ہیں کہ مصائب ومشکلات چاہے کتنے ہوں اللہ کی

ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اور امید ختم نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ ہر مشکل کے بعد آسانی مقدر ہوتی ہے۔

ان اشعار میں الفاظ وترکیب کی سلاست کے ساتھ ساتھ حکمت ونصیحت کتنی واضح اور نمایاں ہے۔

علم اللہ کی عطا کردہ ایک عظیم نعمت ہے، جس کے ذریعہ انسان نیک وبد، حلال وحرام میں امتیاز کرتا ہے اور اسی صفت کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات بنا۔ حتیٰ کہ اُس کا حاصل کرنا ایک درجہ میں فرض قرار دیا گیا اور اس عظیم صفت کو حاصل کرنے کے لیے کچھ آداب متعین ہوئے، جن کے بغیر اس علم کو حاصل کرنا فوائد سے خالی ہوتا ہے۔ انھوں نے علم اور اس کے آداب کے سلسلے میں بہت سے اشعار کہے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر علم کو تواضع اور انکساری کے ساتھ سیکھا جائے تو اس کے فوائد عام ہوتے ہیں اور صاحب علم کی عزت وقدر دانی مقدر ہوجاتی ہے اور اس کی عزت وآبرو کی ذمہ دار بھی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

(وہ شخص علم وحکمت حاصل نہیں کرسکتا جو تمام عمر اہل وعیال کی منفعت کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔ علم دین جوان مرد حاصل کرسکتا ہے جو مختلف قسم کے افکار وشغل سے خالی ہو۔ اگر حکیم لقمان کہ جن کے علم وحکمت کی داستانیں چلی آرہی ہیں۔ عیال داری اور فقر وتنگی میں مبتلا ہوتے تو وہ بھوسہ اور خرفہ (سبزی میں بھی) امتیاز نہ کرپاتے۔)

ایک جگہ اور علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(زمانے نے جب بھی مجھے سبق دیا، اس نے میری عقل کا ضعف مجھ پر واضح کیا اور میں نے جب بھی علمی ترقی کی، اپنے جہل کی زیادتی پر (بھی) اطلاع ہوئی۔)

علم حاصل کرنے میں تکبر اور بڑائی سے اجتناب کتنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

(علم اپنی فضیلت کی وجہ سے اپنے خادم (علما) کا تمام لوگوں کو خادم (تابع دار) بنا دیتا ہے، لہٰذا عالم کے لیے علم کی حفاظت (اور اس کے حقوق کی ادائیگی) ضروری ہے۔ جیسے وہ لوگوں میں اس کی جان وعزت کی حفاظت کرتا ہے۔ جو شخص علم حاصل کرے، پھر اپنی حماقت کی وجہ سے اسے ناقدروں کو سکھائے تو وہ ظالم ہے۔)

سفر کے بارے میں امام شافعیؒ کے مندرجہ ذیل اشعار بڑے مشہور ہیں۔ فرماتے ہیں:

(صاحب عقل کو ایک جگہ پڑے رہنے میں کوئی راحت نہیں ہے، سو وطن کو خیر باد کہو۔ پردیس آباد کرو۔ کوچ کرو۔ اپنوں کی جدائی کا بدلہ پالوگے۔ اور جدوجہد کرو، کیونکہ زندگی کا لطف جدوجہد ہی میں ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ٹھہرا ہوا پانی خراب ہوجاتا ہے، اگر وہ بہے تو خوش گوار ہوجاتا ہے، ورنہ نہیں۔ شیر اگر اپنی جگہ کو نہ چھوڑے تو شکار نہیں پا سکتا، اور تیر اگر کمان سے نہ نکلے تو نشانے پر نہیں لگ سکتا۔ سورج اگر آسمان پر مستقل چمکتا رہے تو عرب وعجم اس سے بیزار ہوجائیں۔ ماہ کامل اگر غروب نہ ہو تو بار بار آنکھیں اس کی راہ نہ دیکھیں۔ سونا جو اپنی جگہ ہو (نکالا نہ گیا ہو) مٹی کی طرح ہے، اور عود جب تک زمین میں ہو ایندھن کی طرح ہے، جب اپنی جگہ چھوڑے تو اس کی طلب بڑھ جاتی ہے، اور سونا اپنی جگہ چھوڑ دے تو سونے کی عزت بڑھ جاتی ہے۔)

عفت وپاکدامنی تمام اخلاقی خوبیوں کی اساس ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کو اخلاقی محاسن میں شمار کیا۔ اس کو اپنانا اور اس کی حفاظت کرنا انسان کو اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو باآبرو اور پاکدامن رکھ کر اپنے اہل وعیال کی عفت کی بھی پاس داری کرتا ہے۔ امام شافعیؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

(پاک دامن رہو، تمہاری عورتیں حرام کاری سے پاک رہیں گی اور ایسے کاموں سے دور رہو جو مسلمان کی شان کے منافی ہیں۔ خبردار! زنا ایک قرض ہے۔ اگر تم نے اس قرض کا بار اٹھایا تو ادائیگی تمہارے گھر والوں کو کرنی پڑے گی۔)

امام شافعی کی شاعری سلاست، فصاحت وبلاغت، آسان لفظوں کا انتخاب، حکمت ونصیحت کی جامع ہے۔ مندرجہ بالا مثالیں اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ان کی زندگی کے آخری ایام مصر میں گذرے، جہاں ان کے حلقہ درس سے معزز علمائے کرام مستفید ہوکر پورے مصر میں آپ کے مسلک کے ترجمان بنے اور وہیں سے امام شافعی کے مسلک کی پوری دنیا میں گونج سنی گئی۔ ۲۹ / رجب المرجب ۲۰۴ھ/ ۸۲۰ء کو ان کی روح اپنے مالک حقیقی سے جا ملی (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ)۔ قبر مبارک پر یہ اشعار کندہ ہیں:

میں نے اپنا وقت پورا کرلیا تو کچھ بے وقوف غفلت و مدہوش لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔گویا میرا یہ دن صرف میرے لیے ہی مقدر ہے اور مصیبت پر خوشیاں منانے والوں کے لیے یہ دن نہیں ہے۔(13)

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

(1) ائمہ اربعہ: امام اعظم ابوحنیفہؒ (نعمان بن ثابت تیمی کوفی ۸۰ھ/ ۶۹۹ء-۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء)، امام مالکؒ (ابوعبد اللہ مالک بن انس اصبحی ۹۵ھ/ ۷۱۲ء-۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء)، امام شافعیؒ (ابوعبداللہ محمد بن ادریس قرشی شافعی ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء-۲۰۴ھ/ ۸۲۰ء)، امام احمد بن حنبلؒ (ابوعبداللہ احمد بن حنبل ۱۶۴ھ/ ۷۶۳ء-۲۴۱ھ/ ۸۵۵ء)

(2) مبارک پوری، قاضی اطہر، سیرت ائمہ اربعہ، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۱

(3) فاطمہ بنت عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب

(4) اصمعی، ابوسعید عبدالملک بن قریب اصمعی (۱۲۳ھ/ ۷۴۰ء-۲۱۶ھ/ ۸۳۱ء) امام اللغۃ، ناقد شعر ادب اور عربی زبان کے بلند پایہ ادیب؛ زیات، احمد حسن، تاریخ الادب العربی، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء، ص ۲۶۴

(5) ابن خلکان، نخبۃ الادب، وفیات الاعیان سے ماخوذ، علی گڑھ اے، ایم، یو، پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۸۰

(6) الصیمر ی، ابوعبداللہ حسین بن علی، اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ، عالم الکتب، بیروت، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۸

(7) ایضاً

(8) ابن خلکان، نخبۃ الادب، وفیات الاعیان سے ماخوذ، علی گڑھ اے، ایم، یو، پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۸۰

(9) امینی، نور عالم خلیل، پیش لفظ دیوان امام شافعیؒ ص: ۱۶-۱۷، دیوبند، دارالمعارف، ۲۰۰۰ء

(10) مبارک پوری، قاضی اطہر، سیرت ائمہ اربعہ، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۱-۱۸۲

(11) ابن الساعی، علی بن انجب الدر الثمین فی اسماء المصنفین، دار المغرب الاسلامی، تونس، ۲۰۰۹ء

(12) امینی، نور عالم خلیل، پیش لفظ دیوان امام شافعیؒ، دارالمعارف، دیوبند، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰-۲۱

(13) قاسمی، طاہر الاسلام، دیوان امام شافعیؒ، دارالمعارف، دیوبند، ۲۰۰۸ء

☆☆☆☆☆

Obaidur Rahman
Research Scholar, Dept. of Arabic,
Banaras Hindu University, Varanasi 221005
Mob. 9935773611,
E-Mail: orqasmi@gmail.com

مئو کے عربی شعرا پر ایک نظر

عبدالمغیث

مئو صوبۂ اتر پردیش کا ایک مشہور و معروف صنعتی شہر ہے۔اس کی شمالی سرحد پر گھاگھرا ندی اور شہر کے درمیان سے دریائے ٹونس گزرتی ہے۔ترکی زبان میں لفظ مئو کے معنی چھاؤنی یا پڑاؤ کے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ پہلے کبھی یہاں ایک نٹ رہا کرتا تھا جو یہاں کے لوگوں پر ظلم ڈھاتا اور تنگ کرتا تھا۔شہر کی ایک عظیم شخصیت ملک طاہر بابا نے اس کی ظالمانہ کرتوتوں کی وجہ سے اس کو شہر چھوڑنے کو کہا لیکن نٹ اس شرط پر راضی ہوا کہ کشتی کا مقابلہ ہو، جو ہار جائے شہر چھوڑ دے۔ چنانچہ مقابلہ ہوا، ملک طاہر بابا کو کامیابی ملی اور نٹ کو شہر چھوڑنا پڑا۔اس طرح سے شہر کا نام مئو نٹ بھنجن (چھاؤنی جہاں نٹ کا بھنجن یعنی ناش ہوا) پڑا جو آگے چل کر مئو ناتھ بھنجن ہو گیا۔

مئو شہر علمی، تاریخی اور تجارتی تمام صفات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اس شہر میں جو نامور علما پیدا ہوئے انھوں نے علم دین کا فریضہ ادا کرنے کے ساتھ عربی شعر و ادب کے سلسلے میں بھی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اس شہر کا نام روشن کیا ہے۔مئو کے چند عربی شعرا کا اجمالی تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا انوارالحق مئوی:

انوارالحق بن عبدالغفار مئوی ۱۳۱۳ھ میں قصبہ مئو میں پیدا ہوئے۔آپ کی پیدائش ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔والد ماجد مولانا عبدالغفار مئوی کا شمار سر برآوردہ علما میں ہوتا تھا۔اس کا اثر مولانا انوارالحق پر بھی پڑا اور بہت جلد ابتدائی تعلیم سے فراغت ہوگئی اور مئو کی مشہور درسگاہ دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔یہاں مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند گئے، وہاں انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور دوسرے اساتذہ سے علم حدیث کی تکمیل کی۔فراغت کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار میں ادب کے استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ بالآخر مدرسہ عزیزیہ میں ہی بیماری کے شکار ہوئے اور مرض کی شدت کے سبب عین جوانی میں ہی ۱۳۴۱ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا انوارالحق مرحوم بڑے ذی صلاحیت عالم تھے۔حافظہ نہایت قوی تھا، عربی اور فارسی کے اشعار برجستہ کہتے تھے، تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ان کا ۱۸/ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ ملتا ہے جو انھوں نے اپنے والد مولانا عبدالغفار مئوی کی وفات پر کہا تھا۔اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:(1)

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی:

مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمن الاعظمی کا شمار فقہ،تفسیر اور حدیث کے عظیم علما میں ہوتا ہے۔آپ کی پیدائش یوپی کے قصبہ مئو میں ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور فقہ وحدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں علوم اسلامیہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انور شاہ کشمیری،شبیر احمد عثمانی،مولانا کریم بخش سنبھلی جیسے عظیم علما سے حدیث اور تفسیر میں اجازت حاصل کی۔انھوں نے اپنی تدریسی خدمات کی شروعات دارالعلوم مئو سے کی پھر جامعہ مظہرالعلوم بنارس چلے گئے۔ ۱۹۴۹ھ میں مفتاح العلوم مئو میں استاذ حدیث وتفسیر کے لیے بلائے گئے اور ۲۲ سال تک حدیث کا درس دیا۔لیکن کچھ نامساعد حالات کی بنا پر مفتاح العلوم چھوڑ دیا اور 'المعہد العالی' کے نام سے حدیث کی تحقیق کے لیے ریسرچ سینٹر قائم کیا۔ایک مدرسہ بھی مرقاۃ العلوم کے نام سے قائم کیا اور آخری عمر تک اس مدرسہ میں معلم حدیث کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔آج بھی یہ مدرسہ اپنی علمی روشنی بکھیر رہا ہے۔آپ کی وفات ۱۹۹۲ء میں ہوئی۔

مولانا عربی،اردو، فارسی تینوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔ ان کی بہت سی تخلیقات موجود ہیں۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے سے ہی عربی اشعار کہنے شروع کر دیے تھے۔ جب وہ پہلی مرتبہ دیوبند تشریف لے گئے اس وقت انھوں نے اپنے ایک استاد مولانا فیض الحسن فیضی کو عربی میں ایک مکتوب لکھا اور اس میں یہ تین اشعار ذکر فرمائے:

(کاش ملاقات کے دن میرے اوپر پھر لوٹ کر آتے اور پیاروں کو میں اپنے پہلو میں پاتا۔)

(اور خاص کر وہ ایام جن میں میری ایسے محبوب سے ملاقات ہوتی جس کا عہد شکنی کے سوا کوئی گناہ نہیں۔)

(میرے محبوب کی گفتگو دل کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور اس کی دید بہتر زندگی کی خبر دیتی ہے۔)

یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب ان کی عمر ۱۹ سال تھی۔اس وقت مولانا نے ۱۳ اشعار پر مشتمل ایک اور نظم لکھی تھی جس کا عنوان '' '' ہے۔جو ممکن ہے کہ درج بالا اشعار سے بھی پہلے کہی ہو۔اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

تم کو عید کی آمد مبارک ہو! تم کو سعد کے طلوع ہونے والے ستارے مبارک ہوں!

عید اپنے ساتھ خوشی اور نفس کی تازگی لائی، جو میرے محبوب سے غموں کو دور کرتی ہے۔

اس نظم کے خاتمہ پر لکھا ہے''

یعنی 'یہ نظم میں نے اپنے دوست مولوی فیض الحسن کو اس وقت لکھی جب میں دارالعلوم دیوبند میں متعلم تھا اور میرا سن ۱۹ برس تھا' اس کے علاوہ بھی مولانا نے بہت سے مرثیے اپنے اساتذہ اور دیگر اصحاب کی وفات پر کہے ہیں۔

مولانا عبداللہ شائقؒ:

عبداللہ شائق بن محمد اسماعیل بن حاجی عبدالقادر بن عبداللہ مئوی ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علوم عربیہ کی متداولہ تحصیل مختلف اساتذہ سے کی، جن میں مولانا عبدالرشید کانپوری، مولانا شاہ عین الحق پھلواری، مولانا حافظ عبدالمنان اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی بڑی مقبولیت کے حامل ہیں۔مولانا نے مسجد چنیاں والی لاہور کے مدرسے سے تدریسی سلسلے کا آغاز کیا۔ ۱۳۳۳ھ میں اپنے آبائی وطن قصبہ مئو کے مدرسہ فیض عام میں استاد مقرر ہوئے اور یہاں تقریبا ۱۳۵۶ھ تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔مولانا نے ۱۳۴۷ھ میں دارالحدیث کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک اس مدرسے کی تنظیم وترقی میں لگے رہے، چنانچہ مدرسہ بہت جلد ہی ترقی پر پہنچ گیا اور ممتاز مدرسوں کی فہرست میں شمار ہونے لگا۔مولانا کی وفات ۱۳۹۴ھ میں ہوئی۔

مولانا اچھے شاعر تھے اور نظم کی جملہ اصناف پر قادر تھے۔آپ کا تخلص 'شائق' تھا۔اردو،عربی، فارسی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔مولانا نے ایک قصیدہ ابوالقاسم سیف بنارسی کی وفات پر کہا تھا جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

مولانا کا ۱۱۵ اشعار پر مشتمل ایک اور قصیدہ ملتا ہے جو انھوں نے سامرودی نام کے شخص کی ہجو میں لکھا تھا۔ سامرودی نے ثناءاللہ نامی شخص کو برا بھلا کہا تھا۔اس قصیدے کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

مولانا عبدالرحمن آزادؒ:

والد کا نام عبدالرزاق ہے۔آپ کی ولادت قصبہ مئو میں ۱۲۹۵ھ میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی۔اس کے بعد چشمہ رحمت غازیپور میں داخل ہوئے اور مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا عبداللہ غازیپوری اور مولانا عبدالرحمن غازیپوری سے درس نظامیہ کے اکثر حصہ کی تحصیل کی۔بعدازاں جامع العلوم کانپور چلے گئے اور وہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد حسن کانپوری وغیرہ سے نصاب کی بقیہ کتابیں پڑھیں۔حدیث کی سند اپنے زمانہ کے مشہور محدث مولانا سید نظیر حسین دہلوی سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۳۱۴ھ میں دربھنگہ کے کسی مدرسہ میں استاذ مقرر ہوئے۔اس کے بعد آسنسول اور کلکتہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔۱۳۵۷ھ میں مئو میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا کو شعر وادب میں کامل درک حاصل تھا اور شعر گوئی کا ملکہ آپ میں بطریق احسن موجود تھا۔آپ کے قصیدہ بانت سعاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔آپ نے ۱۳۴۳ھ میں ایک قصیدہ حافظ عبدالمنان کی وفات پر لکھا تھا جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

مولانا محمد علی ابوالمکارم:

آپ کے والد کا نام فیض اللہ تھا اور ولادت ۱۳۰۸ھ میں قصبہ مئو میں ہوئی۔ابتدائی کتب ملا حسام الدین مئوی سے پڑھیں، بعدازاں چشمہ رحمت میں داخلہ لیا اور مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری اور دیگر اساتذہ سے درس نظامی کی تکمیل کی۔حدیث کی تعلیم مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے حاصل کی۔علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد حکیم سید عبدالحفیظ دہلوی سے طب وحکمت کی تحصیل کی۔۷ رجب ۱۳۵۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔آپ کے مختلف موضوع پر بہت سے رسالے ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔

۲۔

۳۔

۴۔

۵۔

۶۔

۷۔

مولانا اپنے زمانے کے معتبر عربی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔آپ میں شعر کہنے کی صلاحیت بدرجہ

اتم موجود تھی۔مولانا نے سبع معلقات پر اپنی لغوی ومعنوی تحقیقی تعلیقات بھی لگائی ہیں۔آپ کی شاعری کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

☆☆☆☆☆

کتابیات:

۱۔ اعظمی، حبیب الرحمن، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، سہارنپور، مرکز دعوت وتحقیق، ۲۰۱۲ء

۲۔ الاعظمی، نثار احمد، ریحانۃ الشعر والشعراء، لکھنو، کاکوری آفس پریس، ۲۰۱۰ء

۳۔ ابوالحسن، ضیاء الایمان، کانپور، دار التعلیم والصنعت، سنہ ندارد

۴۔ الاعظمی، ڈاکٹر مسعود احمد، حیات ابوالماثر، مئو، المجمع العلمی، ۲۰۰۰ء

☆☆☆☆☆

Abdul Moghis
Research Scholar, Dept. of Arabic,
Banaras Hindu University, Varanasi 221005
Mob. 8188807656,
E-Mail: almughees92@gmail.com

افسانہ

جنازہ

(1) **حجاب امتیاز علی**

جنوری کی ایک سرد رات باہر آسمان پر بادل ایک خاموش استقلال سے مسلط تھے۔چمن کے سوکھے پتے دریچے کے باہر خنک ہوا سے رہ رہ کر بےقرار رہتے اور شور مچا رہے تھے۔ایسے وقت میں میں اپنی حسین نشست گاہ میں ایک اونچے برقی لمپ کے نارنجی رنگ کے نیچے ایک مخملی آرام دہ کرسی پر بیٹھی تھی اور ''بغداد ٹائمز'' کے بڑے بڑے صفحے کھولے مختلف عنوانوں پر نظر ڈال رہی اور بیرونی دنیا کے وحشت خیز اثر کو مطالعے کی دلچسپی میں محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔سامنے آتشدان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔

اتنے میں میری بوڑھی قدیم حبشن زوناش اندر آئی اور میری رفاقت کے لیے ایک چھوٹی سی میز پر قہوہ کا سامان رکھ کر آہستہ سے باہر چلی گئی۔رفتہ رفتہ برآمدے سے اس کی نقرئی چوڑیوں کی جھنجھناہٹ اور عمر خیام کے اشعار کی گنگناہٹ بند ہوگئی۔خاموشی جس میں عناصر کی بےچینی کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی، دمبدم ایک بوجھ کی طرح روح پر بیٹھی جا رہی تھی اور دل میں طرح طرح کے اوہام و وسواس پیدا کر رہی تھی۔

یک لخت دروازے پر ایک محتاط دستک نے مجھے چونکا دیا۔آپ جانتے ہیں میں بہت کم زور دل عورت ہوں اور عام مشرقی لڑکیوں کی طرح بےحد اوہام پرست۔یہی وجہ ہے کہ میں اخبار ہاتھ سے پھینک کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔اس ویران اور وحشت ناک رات میں ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کیا شے دروازے کے کواڑ کو ڈھکیل سکتی تھی۔میں گھبرا کر نشست گاہ سے باہر آئی اور دروازے کی طرف نظر اٹھائی۔اس کے شیشوں میں سے ایک دہکتے ہوئے سگار کو دیکھ کر میرا تردد رفع ہوگیا۔کسی انوکھے وقت محتاط دستک کے ساتھ سگار کا نظر آجانا سب کا سب صرف بوڑھے ڈاکٹر گار کی آمد کی علامات ہیں۔میں ایک روحانی اطمینان کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی اور چٹخنی کھول دی۔

''سلامِ شوق ڈاکٹر!'' میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔''کیا شہر میں امراض کی بہت کثرت ہے جو آپ عید کا چاند بن گئے ہیں۔''

ڈاکٹر اپنے چسٹر پر سے مفلر اتارتا ہوا بولا''ڈاکٹر کبھی اپنے وقت کا مختار نہیں ہوتا بیٹی روحی!''

''روحی'' میرا افسانوی نام ہے۔میں اس کے ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی۔''آپ کی اس بے اختیاری نے اس وقت بڑا فائدہ پہنچایا۔اس طوفانی رات کی تنہائی سے گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی۔آیئے اندر آیئے، آگ دہک رہی ہے۔قہوہ تیار ہے۔سگاروں کا ذخیرہ آپ کی جیب میں موجود ہی ہوگا۔بس اس کے سوا اور کس بات کی کسر رہ گئی؟ کہ آپ اطمینان سے بیٹھ کر مجھے اپنے قصے سنائیں کہ آپ کی ان دنوں کی ساری غیر حاضری کی کسر نکل جائے''۔

ڈاکٹر گار ایک لذت اندوزی کی آہ کے ساتھ آتشدان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ آگ کی طرف بڑھا کر بولا۔''میں کیا قصے سناؤں بیٹی، ڈاکٹر۔۔۔پھر بوڑھا۔۔۔تم سناؤ اپنی سیاحت کے افسانے''۔

میں ہنس پڑی۔''کئی دنوں سے میرے سر میں درد ہے ڈاکٹر۔میرے صنوبری (ہوائی جہاز کا نام) کی تباہی کا حال تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔اس حادثے نے میرے دماغ پر برا اثر ڈالا، طبیعت متوحش سی رہنے لگی ہے۔مہینوں سے کوئی چیز نہیں لکھی۔کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی''۔یہ کہہ کر میں نے قہوہ دان اٹھا لیا اور ڈاکٹر کے لیے قہوہ پیالی میں ڈالتے ہوئے بولی۔''آپ کے پاس قصے کہانیوں کی کمی ہے؟ یوں کہیے کہ ان دنوں انھیں بیان کرنے کے لیے آپ کو وقت نہیں ملتا ہے''۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے پاس قصے کہانیوں کی کمی نہیں۔انسان کی عمر جب بڑھ جاتی ہے تو مختلف تجربات اس کی زندگی کو بجائے خود ایک طویل داستان بنا دیتے ہیں، مگر مجھے تامل ہمیشہ اس لیے ہوتا ہے کہ یہ قصے تم جوانوں کے دل کو کیا لبھا سکتے ہیں، کہ ان واقعات میں محبت اور افسانے کی رنگینیاں ہوتی ہیں نہ حسن اور شوخی کی دلفریبیاں۔''

میں بولی۔''بس انھیں کو بیان کیجیے۔''

بھاپ سے اڑتی ہوئی قہوہ کی پیالیاں ہاتھ میں لے کر ہم نے سر کرسیوں کی پشت سے لگا دیئے۔

آتشدان میں لکڑیاں چیخ چیخ کر شرارے نکال رہی تھیں۔باہر چھت پر بارش کی دھیمی دھیمی ٹپ ٹپ شروع ہو چکی تھی۔کبھی کبھی سمندر پر بادلوں کے گرجنے کی خوفناک آواز آتی تھی۔

ڈاکٹر شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔''تم پسند کرو تو میں اپنے ایک تازہ مریض کی کہانی سناؤں جو پرسوں شام میرے پاس لایا گیا اور آج صبح......''

''ضرور''......میں اشتیاق سے اس کا منہ تکنے لگی۔

(2)

ڈاکٹر گار نے قہوے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔''پرسوں ایک عجیب کیس میرے پاس آیا روحی!۔ بوڑھے احمد کو جانتی ہو؟......گاؤں کی مسجد کا مجاور تھا۔اس مسجد کے احاطے میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے۔وہ اس کا بھی نگراں تھا۔''

''میں نے تو کبھی اس شخص کا نام نہیں سنا......''

ڈاکٹر کہنے لگا کہ اس کی موت کی وجہ نہایت عجیب ہے۔پرسوں صبح وہ میرے پاس بےہوش لایا گیا اور آج صبح اس غریب کا انتقال ہوگیا۔

''خدا غریق رحمت کرے'' میں نے کہا۔''کیا ہوا تھا ڈاکٹر اسے؟''

''تم جانتی ہو کہ آج کل دیہات میں وبا بہت شدت سے پھیلی ہوئی ہے۔دن کے وقت سڑکوں پر میت برداروں کے ہجوم گزرتے نظر آتے ہیں۔بازار میں جدھر نظر ڈالو اُدھر دو چار آدمی ایک جنازہ اٹھائے ہوئے نظر

آتے ہیں۔ رات آتی ہے تو دن سے زیادہ خوفناک مناظر پیش کرتی ہے۔ لوگوں کی خاموش ٹولیاں لالٹین لیے ہوئے قبرستان کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بوڑھا مجاور پرسوں رات کی سرگزشت اس طرح بیان کرر ہا تھا۔

دن بھر لوگوں کی تجہیز و تکفین میں لگا رہا تھا۔ پرسوں رات تھک کے مسجد کے ایک کونے میں پڑ رہا۔ دفعتاً کچھ آواز آئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ لالٹین لیے ہوئے مسجد کے صحن میں داخل ہورہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جنازہ ہوگا۔ رات اندھیری تھی۔ دور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جنازے کی نماز ختم بھی نہیں کی تھی کہ بوندا باندی ہونی شروع ہوئی۔ تب میں نے ان سے کہا کہ اب دفنانے کا انتظام کرنا بڑا مشکل ہے۔ میت کو یہاں رکھ دیجیے۔ میں سرہانے کلام مجید پڑھوں گا، صبح جب مینھ تھم جائے تو واپس آکر لاش کو دفنا دیجیے گا۔ یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں کہ رات بھر میں تنہا لاش کے سرہانے کتاب مقدس پڑھنے میں صرف کر دیتا۔ کبھی کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جو مجھے خوف زدہ کرتا۔

غرض ان لوگوں نے جنازہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا اور مجھے کلام مجید پڑھنے کی تاکید کر کے مسجد کے صحن کے دروازے باہر سے لگا کر چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ دروازہ ان لوگوں نے باہر سے لگا دیا ہے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں کتاب کھول کر جنازے کے سرہانے بیٹھ گیا۔ رات بھیانک تھی۔ باہر بارش ہورہی تھی۔ ہر طرف کاجل کی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی دور سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خوف کے مارے میں دیوانہ ہورہا تھا۔ کیونکہ مجھ پر اب تک کوئی ایسا حادثہ نہیں گزرا تھا جیسا اس شب گزرا۔ ہولناک اور جان لیوا۔

تھوڑی دیر تو میں کتاب مقدس پڑھتا رہا، پھر یکا یک میری نظر سامنے کو اٹھی اور میری روح کانپ گئی...... میں نے دیکھا کہ جنازے پر جو سفید چادر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ دل کو سمجھایا...... ممکن ہے ہوا کا جھونکا ہو۔ یہ کہتا ہوا پھر میں کتاب مقدس پڑھنے لگا مگر قدرتی طور پر میری نگاہ بار بار اٹھتی تھی۔ چادر برابر متحرک تھی۔ میں نے سمجھا ضرور کوئی بلی جنازے میں گھس گئی ہے۔ باوجود اس یقین کے میں جنازے کے قریب نہ جاسکا۔ ایک نامعلوم خوف دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں اپنی عمر میں کبھی نہیں ڈرا، یہ پہلا موقع تھا اور پہلا ہی حادثہ!...... کچھ دیر بعد یہ حالت ہوگئی کہ چادر کا کونا زور زور سے ہلنے لگا جیسے کوئی جھنجوڑ رہا ہو۔ اب تو میرے ہوش و حواس غائب ہوگئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا اٹھنا ہی تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لاش پر پڑی ہوئی چادر سرک گئی اور پھر...... ایک کفن پوش سر آہستہ آہستہ جنازے میں سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ میں ابھی کچھ سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ یک لخت لاش جنازے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل دو لمحے کھڑے رہے...... میں اس کے کفن آلود چہرے کو تک رہا تھا...... وہ میرے لرزتے ہوئے مجسمے کو...... پھر وہ جنازے سے زمین پر کود پڑا۔

یہ دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں...... میں دروازے کی طرف بھاگا تاکہ سڑک پر نکل بھاگوں، مگر وہاں پر جا کر دیکھا تو دروازہ بند پایا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اندر صرف ہم دونوں مقید ہیں۔ قدموں کی آہٹ پا کر میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔

صحن میں امرود کا ایک درخت تھا، میں اس کی طرف بھاگا۔ مگر اب شاید اس میں بھی تیزی آگئی تھی، وہ میرے تعاقب میں تیزی سے کودتا ہوا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ حالت تھی کہ ہم دونوں مسجد کے صحن کا چکر لگا رہے تھے۔ میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے۔ خوف نے میری تمام طاقتیں سلب کر لی تھیں۔ میں نہ چیخ سکتا تھا اور نہ درخت پر چڑھ سکتا تھا! ڈاکٹر صاحب! میری حالت مردے سے بدتر تھی۔ میں پاگل ہورہا تھا۔ مسجد کے صحن کی ہر دیوار کے قریب جا کر اسے پھاندنے کی کوشش کرتا اور جب لاش میرے قریب آجاتی تو میں چیخ مار کر وہاں سے بھاگ نکلتا!

اسی وقت دفعتاً مجھے خیال آیا کہ پیچھے کنویں کے قریب کی دیوار کچھ گر پڑی ہے، اس کو پھاندنا نسبتاً آسان ہوگا۔ میں پچھلے حصے میں جہاں دیوار کی چند اینٹیں گر پڑی ہیں بھاگ آیا اور اپنی پوری قوت اور کوشش سے دیوار پر سے پھاند گیا۔ میں ہانپ رہا تھا۔ اسی عالم میں پلٹ کر دیکھا تو لاش میرے تعاقب میں نہایت تیزی سے چلی آرہی تھی۔ آخر اس نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی، مگر اینٹوں میں کفن الجھ گیا اور مردہ جسم دیوار پر نصف ادھر اور نصف ادھر لٹکنے لگا۔ اب وہ بے جان معلوم ہورہا تھا...... میں باہر سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا پہنچا......''

بس بیٹی صبح آنے جانے والوں نے مسجد کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر ایک لاش کو لٹکتا ہوا دیکھا اور مجاور کو انھوں نے دیوار کے نیچے بے ہوش پایا۔

مجاور کا بھائی اسے اٹھا کر میرے پاس لایا۔ وہ تیز بخار میں پھُنکا جارہا تھا اور بے ہوش تھا۔ کل رات کے تین بجے اس نے مجھے اپنی داستان سنائی اور آج صبح چل بسا۔ صبح دس بجے کے قریب وہ لاش دفن کی گئی اور دوسرے دن صبح دس بجے مجاور کی لاش بھی سپرد خاک کر دی گئی۔

میں دم بخود ہو کر سن رہی تھی، باہر آندھی زوروں پر تھی۔ آتشدان کی لکڑیاں ختم ہوچکی تھیں۔ مینٹل پیس پر رکھا ہوا کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔

جب ڈاکٹر قصہ ختم کر چکا تو میں لرزتی ہوئی اٹھی اور اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔

☆☆☆☆☆

طنز و مزاح

لاغر رومالی: ایک تعارف

ناہید عباس سنبل

نزاکت بیگ عرف نزلہ میاں جن کا تخلص لاغر رومالی تھا، کی ولادتِ بانزاکت عالم نزلہ میں شاید ۱/ اپریل کو اپنے والد عبدل میاں کی چوتھی بیگم سے پچاسویں سال میں ہوئی۔ ان کے دادائے بزرگوار گھٹن خاں جن کا تخلص گھٹیا تھا، محمد گرفتار آزاد مصنفِ 'زہر حیات' کے گھٹیا ترین دوست تھے۔ 'زہر حیات' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گھٹیا کی گھٹیا شاعری کی شہرت متحدہ ہند کے کسی بھی گھٹیا شاعر سے بڑھ کر تھی۔ ان کی استادی سے متعلق مشہور ہے کہ بڑے بڑے استاد فن ان کے سامنے گھٹنۂ ادب ٹیک دیتے تھے۔ مرزا غالبؔ نے ایک مشاعرے میں گھٹیا کی آمد کی خبر سن کر کہا تھا:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے

پھر بھی وہ اس مشاعرے میں گئے تھے، لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ گھٹیا سخت بیمار ہیں اور مشاعرے میں نہیں آسکے تو انھوں نے فی البدیہہ مذکورہ مصرع پر درج ذیل مصرع لگا کر اپنا مقطع پورا کیا۔ لیکن انھیں داد نہ ملی:

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

آخر میں چند روز درِ دگھیا میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۶/ جنوری کو اس عالم فانی سے کوچ کر گئے۔ اس دن ان کی یاد میں لافٹرز ڈے منایا جاتا ہے۔

لاغر رومالی اسی گھٹیائے روزگار کے گرانڈ سن تھے۔ رسم زمانہ کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ صاحب پیروز اللغات سے انھوں نے عربی اور فارسی کا درس لیا۔ اس قدر تیز اور روشن ذہن تھے کہ غالبؔ کہہ اٹھے:

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ 'رفت: گیا' اور 'بود: تھا'

لاغر دس برس کی عمر میں اسکول بھیجے گئے، ان کے باپ چاہتے تھے کہ بیٹا بیرسٹر بنے۔ باپ کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے آٹھویں میں پانچ سال اور نویں میں تین سال جم کر پڑھائی کی۔ لیکن بورڈ تک پہنچتے پہنچتے چار بچوں کے باپ ہو چکے تھے۔ جب بچے ان کے ہم جماعت ہو گئے تب لاغر نے بیرسٹر بننے سے توبہ کر کے پڑھائی ترک کر دی اور سرسید کے اسکول کی Dinning میں بیرا بن گئے۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ کم سے کم انھوں نے باپ کا نصف خواب پورا کر دیا اور 'بیرا' بن گئے۔ اس بات سے مزید خوش تھے کہ نصف ان کے بچے پورا کریں گے۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

۶۵ سال کی عمر میں ہیڈ بیرا ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وقت گزاری کے لیے شاعری

کرنے لگے۔ حالانکہ 'زہر حیات' میں لکھا ہے کہ موصوف دس برس کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں، لیکن اس بات کو درست نہیں مانا جاسکتا کیونکہ مصنفِ 'زہر حیات' لاغر کے دادا کے دوستوں میں تھے اور لاغر کی ولادت یعنی یکم اپریل سے ایک منٹ قبل (رات کے گیارہ بج کر انسٹھ منٹ پر) ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ممکن ہے یہ بات انھوں نے لاغرؔ شیر مالی کے لیے لکھی ہو اور کاتب نے اسے لاغر رومالی کر دیا ہو۔

شروع میں ڈومنؔ دہلوی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، بعد میں طوق دہلوی کے شاگرد ہوئے، اور جب تک حضرت طوق دہلوی زندہ رہے، ان سے جونک کی طرح چپکے رہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی سے ان کو بہت امید تھی لیکن ان کی نظر میں جناح اور نہرو نے پورے ملک کو صرف دو حصوں میں بانٹ کر اکّھڑ بے ایمانی کی اور انھیں صاف بے دخل کر دیا۔ اس کی تاب نہ لا کر ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو بادل ناخواستہ ملک عدم کو روانہ ہوئے۔

بے ہوش ہوش پوری نے 'لاغر رومالی کا رومال ہے' سے اور کھونٹ کان پوری نے 'لاغر رومالی بے رومال شد' اور جونک ہوشیار پوری نے 'لاغر رومالی با رومال رفت' سے تاریخ وفات نکالی۔

شاعری

ماہر لاغریات علامہ نیٹا ناک پوری اپنے مضمون 'لاغری شاعری' میں جو رسالہ 'رومال' کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا، تحریر فرماتے ہیں:

''لاغر رومالی کا شمار ملک کے ان شعرا میں کرنا چاہیے جنھوں نے شاعری میں لاغری شاعری کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا''

چنانچہ علامہ ناک پوری کے مذکورہ بیان سے لاغر کی عظمت فن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لاغر نے بے شک ایسے ایسے لاغر اشعار کہے ہیں جو یقیناً 'لاغریات' میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

آپ نے ہاتھ میں انڈے جو لیے ہیں لاغر　　کسی مرغے کے نہیں ہیں، مری مرغی کے ہیں
ہیں پروڈکٹ ایک کپڑے کے　　میرا رومال آپ کی ساڑی

لاغر کی شاعری کے فکری عناصر ملاحظہ ہوں:

سر پہ گوبر نہیں ہے مہندی ہے　　آپ چشمہ اتار کر دیکھیں
میری باجی کے چار بھائی ہیں　　اے خدا میرے تین ہی کیسے

لاغر ایک حساس دل کے مالک تھے۔ چنانچہ ان کی حساسیت کا اندازہ درج ذیل شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

ہائے وہ پان کہ جسے لاغر　　ہم چباتے ہیں تھوک دیتے ہیں

لاغر کی شخصیت اور شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جو بھی کہتے ہیں بے دھڑک کہتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ لاغر کی اسی صفت سے متاثر ہو کر پنڈت جی نے انھیں 'شاعر بے

دھڑک‘ کے خطاب سے نوازا تھا۔لاغر کی ادبی خدمات سے متعلق ’دیوان چغلیات‘ اور ’شعر لاغر‘ کا ذکر ملتا ہے، لیکن افسوس یہ تصانیف دستبُر دزمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں، جو آج کے جدید اور بے راہ روشعرا کے لیے ’تنبیہ الغافلین‘ تھیں۔لاغر کی شخصیت سے بے شک آج کل کے شعرا کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو زبردستی شاعری کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

Naheed Abbas (Sumbul)
12/15, Hydarabad Colony,
BHU Campus Varanasi-221005

اپنی صلاحیتوں کو آزمایئے

قیصر جہاں

حسن اتفاق سے چند دنوں کے لیے میرے پڑوس میں ملیٹری کا ایک وظیفہ یاب افسر آکر رہا جو میرے خیال میں بہت عقلمند انسان تھا۔’’لوگ اس لیے آپس میں نہیں لڑتے کہ وہ اپنے آپ کو طاقتور سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے لڑتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے کمزور وناتواں پاتے ہیں‘‘۔

جس وقت میں نے یہ الفاظ اس کی زبان سے سنے، اسی وقت سامنے سے ایک بڑا کتا اطمینان سے گزرتا ہوا نظر آیا۔افسر موصوف کا چھوٹا کتا بھی برآمدے میں بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔افسر کہنے لگا’’دیکھو اب کیا ہوتا ہے؟ بڑے کتے کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہے اس لیے اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے‘‘۔

جیسے ہی بڑا کتا قدرے قریب ہوا، چھوٹے کتے نے بھوکنا شروع کیا۔ بڑا کتا اطمینان سے آگے چلا جا رہا تھا اور چھوٹا کتا آہستہ آہستہ بڑھ کر بھونکتا جا رہا تھا۔لیکن اس کے باوجود بڑے کتے نے اس کے بھوکنے کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ کی۔اس نے صرف ایک حقارت آمیز نظر چھوٹے کتے پر ڈالی اور اطمینان سے بڑھتا گیا۔

’’اگر بڑے کتے کو اپنی طاقت پر بھروسہ نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کتے سے لڑ پڑتا‘‘افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’کاش وہ وقت آجائے جب لوگ اپنے آپ کو طاقت ور وتوانا سمجھیں اور انھیں اپنی طاقت کو منوانے کی ضرورت محسوس نہ ہو،تو جنگ وجدل اور تباہیوں سے چھٹکارا نصیب ہو‘‘

ماہرین نفسیات کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ افسر کی رائے بالکل صحیح ہے۔ ڈاکٹر ادور اسٹریٹ کا خیال ہے کہ اپنی حیثیت کو منوانے کا تصور انسان کے ہر جذباتی اقدام کا محرک ہوتا ہے۔ڈاکٹر باربی بھی اپنی تحقیقات میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آپس کے تعلقات میں سب سے اہم مسئلہ انسان کو اپنی حیثیت کو منوانے کا ہوتا ہے۔ایک ایسا شخص جو احساس کمتری رکھتا ہے اکثر حسد،نفرت اور اس قسم کے برے جذبات کا شکار رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جب اسے اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے تو وہ دوسروں کی برتری کو برداشت نہیں کرسکتا۔

اصل مصیبت تو یہ ہے کہ ہم نے’’احترام ذات‘‘ کو انا،خودی اور تفاخر کے ہم معنی سمجھ رکھا ہے۔حالانکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔اپنی توانائی اور صلاحیت پر اعتماد رکھنے والا شخص خود اپنی قدر کرتا ہے اور اسے ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔افسر موصوف نے ایک بار نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا:

’’سچی خاکساری میں ہی’’احترام ذات‘‘پوشیدہ ہوتا ہے۔کیونکہ جب کسی شخص کو اپنی قوت وصلاحیت پر اعتماد ہوتا ہے تو وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ عطیہ خداوندی ہے۔اس لیے دوسروں پر اپنی توانائی، ذہانت اور صلاحیت کی دھونس جمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا‘‘۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

خاکساران جہان را بہ حقارت منگر — تو چہ دانی کہ در این راہ سواری باشد

اگر ہم یہ محسوس کرلیں کہ اپنی کمتری کا لاشعوری تصور نئے اور انوکھے روپ میں جلوہ گر ہوکر ہمیں افعال واعمال پر اکساتا ہے تو ہم دوسروں کے دلوں میں بآسانی اپنی عزت واحترام پیدا کر سکتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص ہے جو بات بات پر بگڑ جاتا ہے۔اس کے بگڑنے سے کیا یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذاتی صلاحیت کا قائل نہیں ہے۔اور اسی لیے وہ سیدھے سادے جملوں میں بھی ایک پیچ پاتا ہے۔اس کے برخلاف ایک مضبوط کردار کے آدمی کو لیجیے جو اپنی صلاحیت کو خود محسوس کرتا ہے،اس کے خلاف آپ کچھ بھی کہتے چلے جائیے وہ کبھی دھیان نہ دے گا،اطمینان سے اپنا فرض انجام دیتا رہے گا۔پس اس سے ثابت ہوا کہ دوسروں کو اپنے سے کمتر ثابت کرنے کے لیے خود کو خاکساری برتنے کی ضرورت ہے۔خاکساری سے مراد اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل وخوار کرنا یا گرادینا نہیں ہے،بے جا فخر وغرور کو ترک کرنا ہے۔ظاہری شان وشوکت سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی ذہنیت کو بدلنا ہے۔دوسروں کے بے جا طنز اور ریمارک کو خندہ پیشانی سے ٹال دینا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ دوسروں کی نظروں میں اپنی عزت کو پیدا کرنے کے لیے آپ اپنی عزت کیجیے اور اکثر لوگ "آپ اپنی عزت" کرو کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔وہ بے جا فخر وتعلّی سے کام لیتے ہیں،دوسروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کہ جیسے وہ ان کے سامنے کچھ نہیں۔اس غلط تصور کو ذہن سے نکال دینا چاہیے۔اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے اشخاص اصل میں نہ آپ اپنی عزت کرتے ہیں اور نہ اپنی صلاحیت کے قائل ہیں۔اس لیے کہ عدم صلاحیت کا لاشعوری احساس انسان کو پاگل بنا دیتا ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے ایسی عجیب وغریب حرکت کرتا ہے جو بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔اگر آپ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس سے اس کی حرکات کی وجہ پوچھیں تو وہ خود بتانے سے قاصر رہے گا۔اس لیے کہ وہ خود نہیں سمجھتا کہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔اس قسم کے لوگوں میں بعض دنیاوی شہرت حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں،بعض دولت کے دیوانے ہوتے ہیں۔بعض اپنے زیردستوں پر رعب وداب سے اپنی برتری منوانا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی عجیب وغریب حرکات کرنے یا زبان سے نقارہ پیٹنے کے بجائے خاموشی سے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اور اگر کسی شخص میں مخصوص صلاحیت موجود ہے تو اس پر بے جا فخر کرنا بے معنی سی بات ہے۔

ایک شہزادے کو اپنا شہزادہ پن منوانے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ایک افسر کو ماتحتوں سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ افسر ہے۔اگر کوئی افسر ہے اور افسرانہ شان بگھارتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ خود اسے اپنے افسر ہونے میں شک ہے۔وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اسے افسر نہیں سمجھتا۔

اگر آپ کسی صلاحیت کے مالک ہیں تو آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے خدا کا شکر بجالائیں،نہ کہ اس پر گھمنڈ کریں اس لیے کہ بے جا فخر وتعلّی کے معنی خود اپنی صلاحیت پر اعتماد نہ کرنا ہے۔اگر کوئی شخص ودیعت کردہ صلاحیت ذاتی پر اعتماد نہیں کرتا تو وہ خدا کی ناشکری کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نظم

کمل بہاری کمل سیتاپوری

(ولادت:1922ء)

ہمارا وطن

کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن
کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن

کوہساروں کے دامن میں ہیں وادیاں
جیسے محلوں میں بیباک شہزادیاں
دست قدرت لگائے اسے ڈالیاں
اس پہ قربان جنت کی رعنائیاں
نور و نکہت سے اس کا بھرا بانکپن
کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن

تاج زریں ہمالہ کا ہے زیب سر
اس کے قدموں میں ساگر بحد نظر
اس کی باہوں میں ہریالیاں بیشتر
اس کے سینے میں بیتاب لعل و گہر
گود میں مسکراتی ہیں گنگ و جمن
کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن

اس کی صبح بنارس، تو شام اودھ
قدسیوں کا ہے مسکن، مقام اودھ
اس کی تہذیب روشن بہ نام اودھ
عرش ان کا مکاں ہے تو بام اودھ
ہے معنبر معطر چمن در چمن
کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن

مسجدوں میں یہاں روز ہوتی اذاں
مندروں میں عبادت بہ صد جسم و جاں
اس کے گردواروں میں ہے بھجن کا سماں
اس کے گرجا گھروں میں ہیں خوشیاں جواں
اس میں چلتی ہے سب ملتوں کی پون
کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن

دیوتا عرش سے پھول برسائیں گے
کتنے پرچم مسرت کے لہرائیں گے
ہم کملؔ اک زمانے پہ چھاجائیں گے
اپنے بھارت میں جنت اٹھا لائیں گے
دور ہوں گے یہ آلام و رنج و محن
کتنا پیارا وطن ہے ہمارا وطن

غزلیں

(1)

ناگہانی کوئی آفت ہے ارے جلدی کرو
ایک ہونے کی ضرورت ہے ارے جلدی کرو

راستے معدوم ہیں ملتی نہیں جائے پناہ
سامنے صحرائے وحشت ہے ارے جلدی کرو

ان کی بزم ناز میں مدعو ہزاروں لوگ ہیں
سرفروشوں کو بھی دعوت ہے ارے جلدی کرو

کھل رہا ہے باب راحت قلعۂ آلام میں
اک ذرا تھوڑی مشقت ہے ارے جلدی کرو

چند آنسو کائنات غم ہیں ان کو روک لو
بس یہی تھوڑی سی دولت ہے ارے جلدی کرو

فیصلہ حق میں ہوا ہے بڑھ کے لو اپنا حساب
ان کی آنکھوں میں مروت ہے ارے جلدی کرو

ہو رہا ہے جو ستم ہم پر غنیمت ہے کملؔ
یہ بھی اک ان کی عنایت ہے ارے جلدی کرو

(2)

جب خود پرستیاں ہیں وفاؤں کے گاؤں میں
کیسے خدا ملے گا خداؤں کے گاؤں میں

اک شور مشتعل کو دبایا بصد شعور
میری خموشیوں نے صداؤں کے گاؤں میں

اتنی گھٹن کہ سانس بھی لینا محال ہے
آنسو نکل پڑے ہیں ہواؤں کے گاؤں میں

یہ اپنا اپنا بھاگ ہے اپنا نصیب ہے
سر پر ہمارے دھوپ ہے چھاؤں کے گاؤں میں

ہر سمت آہ و نالہ ہے ہر سمت ہے فغاں
ہم رو پڑے ہیں نغمہ سراؤں کے گاؤں میں

ڈھونڈا بہت نہ اہل کرم کوئی مل سکا
ہم آگئے ہوں جیسے گداؤں کے گاؤں میں

ہم آنکھ بند کرکے گزر تو گئے مگر
احساس تلملا اٹھا گھاؤں کے گاؤں میں

سرزد نہ آج تک ہوئی جس سے کوئی خطا
ٹھہرا کملؔ ہے وہ بھی خطاؤں کے گاؤں میں

(3)

ہم جستجو نہ کیوں کریں عصیاں کے باب کی
رکھنی ہمیں کو لاج ہے روز حساب کی

شدت نہ پوچھ گرمئ حسن شباب کی
کرنیں ہوں جس طرح سے جواں آفتاب کی

صحن چمن میں کس نے الٹ دی نقاب رخ
شرما کے لال ہوگئی رنگت گلاب کی

گیسو بہ دوش، جام بہ کف آگئے ہیں وہ
تعبیر ہے یہی میرے پر کیف خواب کی

خواب حسیں کی موج تخیل نہ ٹوٹ جائے
پل بھر کی زندگی ہے ابھرتے حباب کی

مرجھاکے رہ گئی ہیں مرے دل کی حسرتیں
مٹی خراب ہے دل خانہ خراب کی

اٹھ کر وہیں سے ابر گھرے اور برس پڑے
چھینٹیں جہاں بھی ہم نے گرادیں شراب کی

کرنے بھی ہم نہ پائے کملؔ عرض مدعا
خاموش دیکھتے رہے صورت عتاب کی

(4)

جب عروس سحر نکلتی ہے
تیرگی شب کی ہاتھ ملتی ہے

آہ سینے سے جب نکلتی ہے
سرخ آندھی جہاں میں چلتی ہے

تند ثروت کے گرم خورشیدو!
دھوپ آخر کبھی تو ڈھلتی ہے

آنکھ سے اشک ہیں رواں اب بھی
دل میں حسرت کوئی مچلتی ہے

جس کو تکتی ہو چشم زاغ و زغن
شاخ وہ پھولتی نہ پھلتی ہے

یاد سے دل کے زخم رستے ہیں
ہاں طبیعت مگر بہلتی ہے

ڈوب جانے کا ڈر بھلا کس کو
ناؤ کاغذ کی خوب چلتی ہے

دل میں طوفان اٹھ رہا ہے کملؔ
آنسوؤں کی ندی ابلتی ہے

(5)

سنگ دل والوں پہ الفت کا اثر کب تک نہیں
تیرگئ شب کی مٹانے کو سحر کب تک نہیں

اٹھ رہی ہیں آگ کی لپٹیں در و دیوار سے
جانے کس منزل پہ آکر رک گئی ہے زندگی

جل کلوں کے دیوتاؤں کو خبر کب تک نہیں
دیکھنا ہے اب میری شام وسحر کب تک نہیں

خونچکاں ہر جسم ہے، ہر منہ اگلتا ہے لہو
قاتلان شہر کے دل پر اثر کب تک نہیں

مطمئن ہوکر نہ بیٹھیں طائران خوش نوا
آشیاں پر برق و باراں کی نظر کب تک نہیں

منزل مقصود تک جاکر پلٹ آتا ہوں میں
دیکھتا ہوں ذوق منزل معتبر کب تک نہیں

ان کو اپنی داستان غم سناؤ تو کملؔ
مہرباں ہوں گے تمہارے حال پر کب تک نہیں

☆☆☆☆☆

Kamal Bihari Tiwari Kmal
Nabi Nagar, Dist. Sitapur,U.P-261135

غزلیں

نوحؔ ناروی

(1879-1962ء)

(1)

آماجگاہ تیر ستم کون ہم کہ آپ
پھر پوچھتے ہیں آپ سے ہم، کون ہم کہ آپ

دل حسن پر نثار تو کردوں بجا درست
جھیلے گا اس کے بعد ستم کون ہم کہ آپ

دنیا سے اٹھ چکا تھا محبت کا اعتبار
قائم کیے ہوئے ہے بھرم کون ہم کہ آپ

دونوں نے اتحاد کی کوشش ضرور کی
لیکن رہا نباہ میں کم، کون ہم کہ آپ

روز جزا جو داد طلب ہوں گے داد خواہ
اس دن کرے گا عذر ستم کون ہم کہ آپ

طوفان اشک نوحؔ کا رکنا محال ہے
انجام دے یہ کار اہم، کون ہم کہ آپ

(2)

ابھی کم سن ہیں معلومات کتنی
وہ کتنے اور ان کی بات کتنی

یہ میرے واسطے ہے بات کتنی
وہ کہتے ہیں تری اوقات کتنی

سحر تک حال کیا ہوگا ہمارا
خدا جانے ابھی ہے رات کتنی

یہ سر ہے، یہ کلیجہ ہے، یہ دل ہے
وہ لیں گے خیر سے سوغات کتنی

توجہ سے کبھی سن لو مری بات
جو تم چاہو تو یہ ہے بات کتنی

گلستاں فصل گل میں لٹ رہا ہے
حنا آئی تمھارے ہاتھ کتنی

ہمارے دل نہ دینے پر خفا ہو
لٹاتے ہو تمھیں خیرات کتنی

کرو شکر ستم ان کے ستم پر
کہ اتنی بات بھی ہے بات کتنی

جفا و قہر سے واقف نہ تھا میں
بڑھی الفت میں معلومات کتنی

جفا والے حساب اس کا لگالیں
وفا کرتا ہوں میں دن رات کتنی

نہیں رکتے ہمارے اشک اے نوحؔ
یہ طوفاں خیز ہے برسات کتنی

(3)

اہل الفت سے تنے جاتے ہیں
روز روز آپ بنے جاتے ہیں

ذبح تو کرتے ہو کچھ دھیان بھی ہے
خون میں ہاتھ سنے جاتے ہیں

روٹھنا ان کا غضب ڈھائے گا
اب وہ کیا جلد منے جاتے ہیں

کچھ ادھر دل بھی کھنچا جاتا ہے
کچھ ادھر وہ بھی تنے جاتے ہیں

کیوں نہ غم ہو مجھے رسوائی کا
وہ مرے ساتھ سنے جاتے ہیں

دل نہ گھبرائے کہ وہ روٹھ گئے
چار فقروں میں منے جاتے ہیں

ہے یہ مطلب نہیں چھیڑے گا کوئی
بیٹھے بیٹھے وہ تنے جاتے ہیں

بے وفاؤں سے وفا کی امید
نوحؔ نادان بنے جاتے ہیں

(4)

بلبل کا آڑایا دل ناحق یہ خام خیالی پھولوں کی
لیتی ہے تلاشی باد صبا اب ڈالی ڈالی پھولوں کی

یہ حسن و لطافت یہ خوشبو، یہ رنگ فضا یہ جوش نمو
عالم ہے انوکھا کلیوں کا دنیا ہے نرالی پھولوں کی

مثل بلبل نکہت سے چھٹے دم بھر کو چمن ممکن ہی نہیں
ہوتی ہے تصدق پھولوں پر خود رہنے والی پھولوں کی

مانا کہ لٹائے راتوں کو گلزار میں موتی شبنم نے
جب صبح ہوئی سورج نکلا تو جیب تھی خالی پھولوں کی

گلچیں کی بھی نظریں اٹھتی ہیں صرصر کے بھی جھونکے آتے ہیں
ہوا ایسے میں کس سے، کیوں کر، کب تک یہ رکھوالی پھولوں کی

آتی ہے خزاں اب رخصت کر زندہ جو رہے پھر آئیں گے
ہم سے تو نہ دیکھی جائے گی مالی پامالی پھولوں کی

ہر برگ شجر پر خوش ہو کر گلشن میں نچھاور کرنے کو
نکہت نے خزانہ کھول دیا ہمت ہے یہ عالی پھولوں کی

پھر رُت بدلی پھر ابر اٹھا پھر سرد ہوائیں چلنے لگیں
ہوجائے پری بن جائے دلہن اب ڈالی ڈالی پھولوں کی

ہاروں میں گندھے، جکڑے بھی گئے، گلشن بھی چھٹا، سینہ بھی چھدا
پہنچے مگر ان کی گردن تک، یہ خوش اقبالی پھولوں کی

صیاد کے گھر سے گلشن تک اللہ کبھی پہنچائے مجھے
امید نہیں میں خوش ہو کر دیکھوں خوشحالی پھولوں کی

گل گشت میں بھی چلتے پھرتے کام اس نے کیا عیاری کا
اخلاص بڑھا کر پھولوں کا ہر بات اڑالی پھولوں کی

معشوقوں کے دہنے بائیں، عشاق کا مجمع رہتا ہے
دیکھی نہ عنادل سے ہم نے محفل کبھی خالی پھولوں کی

ہم اپنے دل میں داغوں کو یوں دیکھتے ہیں یوں دیکھتے ہیں
کرتا ہے نگہبانی جیسے گلزار میں مالی پھولوں کی

جو لطف کبھی حاصل تھا ہمیں وہ لطف چمن کے ساتھ گیا
اب کنج قفس میں کھینچتے ہیں تصویر خیالی پھولوں کی

شبنم کے بھی قطرے گلشن میں بدمست کیے دیتے ہیں مجھے
لبریز مئے عشرت سے ہوئی ایک ایک پیالی پھولوں کی

ہر مصرعۂ تر سے ہے پیدا گلہائے مضامیں کا جلوہ
اے نوحؔ کہوں میں اس کو غزل یا سمجھوں ڈالی پھولوں کی

☆☆☆☆☆

نظم

عامر عثمانی

(ولادت: ۱۹۲۰ء دیوبند یوپی - وفات: ۱۹۷۵ء پونہ)

خواب جو بکھر گئے

جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب، ڈھونڈتا ہوں میں
مجھے نمک کی کان میں، مٹھاس کی تلاش ہے
برہنگی کے شہر میں، لباس کی تلاش ہے
وہ برف باریاں ہوئیں، کہ پیاس خود ہی بجھ گئی
میں ساغروں کو کیا کروں، کہ پیاس کی تلاش ہے
گھرا ہوا ہے ابر، ماہتاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی، شراب ڈھونڈتا ہوں میں
جو رک سکے تو روک دو، یہ سیل رنگ و نور کا
مری نظر کو چاہیے، وہی چراغ دور کا
کھٹک رہی ہے ہر کرن، نظر میں خار کی طرح
چھپا دیا ہے تابشوں نے آئینہ شعور کا
نگاہ شوق جل اٹھی حجاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
یہ دھوپ زرد زرد سی، یہ چاندنی دھواں دھواں
یہ طلعتیں بجھی بجھی، یہ داغ داغ کہکشاں
یہ سرخ سرخ پھول ہیں، کہ زخم ہیں بہار کے
یہ اوس کی پھوار ہیں، کہ رو رہا ہے آسماں
دل ونظر کے موتیوں کی، آب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
یہ تلخ تلخ راحتیں، جراحتیں لیے ہوئے

یہ خونچکاں لطافتیں، کثافتیں لیے ہوئے
یہ تار تار پیرہن، عروسۂ بہار کا
یہ خندہ زن صداقتیں، قیامتیں لیے ہوئے
زمین کی تہوں میں، آفتاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
جو مرحلوں میں ساتھ تھے، وہ منزلوں پہ چھٹ گئے
جو رات میں لٹے نہ تھے، وہ دوپہر میں لٹ گئے
مگن تھا میں کہ پیار کے، بہت سے گیت گاؤں گا
زبان گنگ ہو گئی، گلے میں گیت گھٹ گئے
کٹی ہوئی ہیں انگلیاں، رباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
یہ کتنے پھول ٹوٹ کر، بکھر گئے یہ کیا ہوا
یہ کتنے پھول شاخچوں پہ، مرگئے یہ کیا ہوا
بڑھی جو تیز روشنی، چمک اٹھی روش روش
مگر لہو کے داغ بھی، ابھر گئے یہ کیا ہوا
انھیں چھپاؤں کس طرح، نقاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
خوشا وہ دور بے خودی، کہ جستجوئے یار تھی
جو درد میں سرور تھا، تو بے کلی قرار تھی
کسی نے زہر غم دیا، تو مسکرا کے پی گئے
تڑپ میں بھی سکوں نہ تھا، خلش بھی سازگار تھی
حیات شوق کا وہی، سراب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں
خلوص بے شعور کی، وہ زود اعتباریاں
وہ شوق سادہ لوح کی، حسین خامکاریاں

نئی سحر کے خال و خد، نگاہ میں بسے ہوئے
خیال ہی خیال میں، وہ حاشیہ نگاریاں
جو دے گیا فریب، وہ شباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

وہ لعل ولب کے تذکرے، وہ زلف ورخ کے زمزمے
وہ کاروبار آرزو، وہ ولولے وہ ہمہمے
دل و نظر کی جان تھا، وہ دور جو گزر گیا
نہ اب کسی سے دل لگے، نہ اب کہیں نظر جمے
سمند وقت جاچکا، رباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

نہ عشق با ادب رہا، نہ حسن میں حیا رہی
ہوس کی دھوم دھام ہے، نگر نگر گلی گلی
قدم قدم کھلے ہوئے ہیں، مکر و فن کے مدرسے
مگر یہ میری سادگی، تو دیکھیے کہ آج بھی
وفا کی درسگاہوں کا، نصاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

بہت دنوں میں راستہ، حریم ناز کا ملا
مگر حریم ناز تک، پہنچ گئے تو کیا ملا
مرے سفر کے ساتھیو! تمھیں سے پوچھتا ہوں میں
بتاؤ کیا صنم ملے، بتاؤ کیا خدا ملا
جواب چاہیے مجھے، جواب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی، وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

☆☆☆☆☆

نوٹ: ۱۲/اپریل ۱۹۷۵ء کو پونہ کے ایک مشاعرے میں یہ نظم پڑھنے کے دس منٹ بعد مولانا عامر عثمانی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

غزلیں

عبدالقادر بیدلؔ دہلوی

ولادت: 1054ھ، عظیم آباد- وفات: 4 صفر المظفر 1133ھ، دہلی

(1)

محبت بسک× پرکرد از وفا جان وتن ما را
کند یوسف صدا گر بوکنی پیرا×ن ما را
چو صحرا مشرب ما ننگ وحشت، برنمی تابد
نگ×دارد خدا از تنگی چین دامن ما را
چنان مطلق عنان تازست شمع ما ازین محفل
ک× رنگ رفت× دارد پاس ازخودرفتن ما را
خرامش در دل▪ رذر× صد طوفان جنون دارد
عنان گیرید این آتش ب× عالم افکن ما را
گ×ر دارد حصار آبرو در ضبط امواجش
میندازید ز آغوش ادب پیرا×ن ما را
فلک در خاک می غلتید از شرم سرافرازی
اگر می دید معراج ز پا افتادن ما را
ب× اشک افتاد کار آ× ما از پیش پا دیدن
ز شبنم بال ترگردید صبح گلشن ما را
▪ وس▪ رسو بساط ناز دیگر پ×ن می چیند
ندید این بی خبر مژگان ب× م آوردن ما را
ازین خاشاک او×امی ک× دارد مزر▪ ستی
ب×و چرخ نتوان پاک کردن خرمن ما را
چوما×ی خارخار طبع درکار است و ما غافل
ک×براموا جوشاند× ست گردون جوشن ما را
ز آب زندگی تا بگذرد تشویش رعنایی
خم وضع ادب پل کرد دوش وگردن ما را
ب×ف وصوت تا کی تیر× سازی وقت ما بیدلؔ
چراغ چارسو مپسند طبع روشن ما را

(2)

اوسپ×رومن کف خاک، او کجا و من کجا
داغم از سودای خام غفلت و و×م رسا
عجز را گر در جناب بی نیازی××ی ست
این قدر×ا بس ک× تا کویت رسد فریاد ما
نیست برق جانگدازی چون تغافل×ای ناز
بیش از این آتش مزن در خان× آیین×▪ ا
▪ رک× را الفت ش×ید چشم مخمورت کند
نشه انگیزد ز خاکش گرد تا روز جزا
از نمود خاکسار عشق نتوان داد عرض
رنگ تمثالی مگر آیین× گردد توتیا
نیست در بنیاد آتش خان× نیرنگ د×ر
آن قدر خاکستر کابین× ای گیرد جلا
زندگی محمل کش و×م دو عالم آرزو ست
می تپد در▪ رنفس صد کاروان بانگ درا
آرزو خون گشت× نیرنگ وضع ناز کیست
غمز× درد دور باش و جلو× می گوید بیا
▪ رچ×ی بینم تپش آماد× صد جستجو ست
زبن بیابان نقش پا▪ م نیست بی آواز پا
قامت او▪ رکجا سرکوب رعنایان شود
سرو را خجلت مگر درسای× اش دارد ب× پا

▪رنفس صد رنگ می گیرد عنان جلو※ اش　　تا کند شوخی عرق آیین※ می ریزد حیا
بال و پر بر※م زدن بیدلؔ کف افسوس بود　　خاک نومیدی ب※ فرق سعی▪ ای نارسا

(3)

من نمی گویم زیان کن یا ب※ فکر سود باش　　ای ز فرصت بی خبر در▪ ر چ※ باشی زود باش
در طلب تشنیع کوتا※ی مکش از▪ یچ کس　　شعل※م گر بال بی آبی گشاید دود باش
زیب▪ ستی چیست غیر از شور عشق و ساز حسن　　نک※ گلی گرن※ ای دود دماغ عود باش
از خموشی گر بچینی دستگا※ عافیت　　گفتگو▪م عالمی دارد نفس فرسود باش
راحتی گر▪ ست در آغوش سعی بی خودیست　　یک قلم لغزش چو مژگان※ ای خواب آلود باش
مومیایی▪م شکستن خالی از تعمیر نیست　　ای زیانت▪ یچ ب※ر دردمندی سود باش
خاک آدم، آتش ابلیس دارد در کمین　　از تعین▪م برآیی حاسد و محسود باش
چیست دل تا روکش دیدار باید ساختن　　حسن بی پرواخوشست آیین※ گو مر دود باش
زین▪م※ سعی طلب جز عافیت مطلوب نیست　　گر▪م※ داغست▪ رجا شعل※ آب آسود باش
نقد حیرتخان※ٔ▪ ستی صدایی بیش نیست　　ای عدم نامی ب※دست آورد※ ای موجود باش
بر مقیمان سرای عاریت بیدلؔ مپیچ　　چون تو این جا نیستی گو※ رک※حوا※ دبو باش

(4)

در جگر صد رنگ طوفان کرد※ ایم　　تا سرشکی نذر مژگان کرد※ ایم
حیرت از طاووس ما پر می زند　　وحشتی را نرگستان کرد※ ایم
اخگر ما پرد※ٔ خاکستر ست　　بیض※ٔ قمری نمایان کرد※ ایم
تا نفس بر خود تپید آیین※ نیست　　چون حباب این جلو※ سامان کرد※ ایم
شبنم ما جیب خجلت می درد　　یک عرق آیین※ عریان کرد※ ایم
نال※ حسرتخان※ٔ دیدار اوست　　در نفس آیین※ پن※ان کرد※ ایم
عشق از محرومی ما داغ شد　　بی جنون سیر بیابان کرد※ ایم
دست بر▪م سودنی داریم و بس　　خدمت طبع پشیمان کرد※ ایم
ما و شمع کشت※ نتوان فرق کرد　　این قدر سر در گریبان کرد※ ایم
ماتم فرصت ز حیرت روشن است　　جای مو مژگان پریشان کرد※ ایم
ای توانایی ب※ زور خود مناز　　ما ضعیفان آنچ※ نتوان کرد※ ایم
از▪جوم اشک ما بیدلؔ مپرس　　یار می آید چراغان کرد※ ایم

☆☆☆☆☆

قصیده

مولانا محمد بن خواج※ زین الدین علی بن جمال الدین شیرازی
ملقب ب※ جمال الدین متخلص ب※ عرفی

ولادت: 963ھ- وفات: 999ھ

ای متاع درد در بازار جان انداخت※　　گو※ر▪ر سود در جیب زیان انداخت※
نور حیرت در شب اوصاف تو　　بس▪ مایون مرغ عقل از آشیان انداخت※
از کمان تا جست※ در چشم تحیر کرد※ جا　　معرفت کو تیر حکمی بر نشان انداخت※
ای ب※ طبع باغ کون از ب※ رب※ان حدوث　　طرح رنگ آمیزی از فصل خزان انداخت※
سرعت اندیش※ را افکند※ در دامان تیر　　عادب خمیاز※ در جیب کمان انداخت※
در چمن▪ ای محبت▪ر قدم چون کربلا　　از نسیم عشو※ فرش ارغوان انداخت※
مرغ طبع اندر▪ وای معصیت نگشود※ بال　　عفو تو شا※ین رحمت را بر آن انداخت※
سای※ پرورد غمت در آفتاب رستخیز　　فرش استبرق ب※ زیر سایبان انداخت※
طعمۂ عشق تو را از مغز جان آورد※ ام　　آن▪ ما تا سای※ بر این استخوان انداخت※
ای مذلت را روایی داد※ در بازار عشق　　عزت و شان را از اوج عز و شان انداخت※
▪ر کجا تاثیر غم را داد※ ای اذن عموم　　شادی راحت فشان را ناتوان انداخت※
زین خجالت چون برون آیم ک※ دل در موج خون　　نو عروسان غمت را مو کشان انداخت※
فیض را نازم ک※ رکس پلب※ را※ت ماند※ است　　دل ب※ دست آورد و جان را از میان انداخت※
صید دل را ب※ر آگا※ی ز صیاد ازل　　در کمند طرۂ عنبر فشان انداخت※
کرد※ از عرفان لباس عجز را دامن دراز　　کوت※ی در جیب عقل نکت※دان انداخت※
طعم※ ای کز خوان عشق افکند※ ام در کام دل　　ریزۂ آن را جحیم اندر د※ان انداخت※
شرع گوید منع لب کن، عشق گوید نعر※ زن　　کای تو▪م در ر※ عشق خود عنان انداخت※
دولت وصلت ک※ در یابد ک※ با آن محرمی　　جو※ر اول علم بر آستان انداخت※
حیرت حسن تو را نازم ک※ در بزم وصال　　جام آب زندگی از دست جان انداخت※
وصف صنعت کز لب▪ر ذر※ می ریزد برون　　نطق را در معرض عقداللسان انداخت※
در ثنایت چون گشایم لب ک※ برق ناکسی　　منطقم را آتش اندر خان و مان انداخت※
من ک※ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب　　مرغ اوصاف تو از اوج بیان انداخت※
مست ذوق عرفیؔ ام کز نغمۂ توحید تو　　لذت آواز※ در کام ج※ان انداخت※

☆☆☆☆☆

نام کتاب: نقوش افکار (مجموعۂ مقالات)
مصنف: وارث ریاضی
صفحات: 275 قیمت: 300روپے
مقام اشاعت وسال اشاعت: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2016ء
مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی-6

تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

وارث ریاضی کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جو ایک لمبے عرصے سے زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ وہ ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ اچھے ادیب، ناقد، محقق اور دانشور بھی ہیں جنھوں نے اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔مختلف موضاعات پر ان کے مضامین ملک کے معتبر رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں حرف آرزو (شعری مجموعہ)، نقوش افکار (مجموعۂ مقالات)، نقوش آگہی (مجموعۂ مقالات)، پیام شوق (مشاہیر کے خطوط)، نقش آرزو (مجموعۂ کلام) قابل ذکر ہیں۔ان میں سے کچھ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں اور کچھ ابھی اشاعت کی منتظر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''نقوش افکار'' ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت انیس مضامین شامل ہیں۔کتاب کے آغاز میں ''پیش نامہ'' کے عنوان سے پروفیسر سید حسن عباس نے ان کی شخصیت اور علمی وادبی کارناموں پر مختصر روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی کتاب کے محتویات پر بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے۔اس میں انھوں نے ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کو سراہا ہے۔

اس کے بعد'' حرفے چند'' کے تحت مولانا عمیر الصدیق ندوی نے صوبۂ بہار کے حوالے سے چند تاریخی باتیں پیش کی ہیں۔اس ضمن میں انھوں نے وارث ریاضی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ریاضی صاحب کی نظر جستجو کی نظر ہے جو صرف خوب اور ناخوب کے فرق کو سمجھتی ہی نہیں بلکہ خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔زیر نظر کتاب کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو بھی پہنچتی ہے کہ وارث ریاضی کی فکر ونظر اور مطالعہ کافی وسیع ہے۔ وہ ادب کے ساتھ اسلامیات اور تاریخ کی بھی گہری بصیرت رکھتے ہیں۔

کتاب پانچ عنوانات بالترتیب تعلیم، اسلامیات، اقبالیات، شخصیات اور ادبیات پر مشتمل ہے۔ ''تعلیم'' کے تحت چار مضامین کا ذکر ہے جن میں ''تسلط ہے دنیا پہ دانشوری کا''، ''پروفیسر نثار احمد فاروقی: ایک بالغ نظر صاحب علم وقلم''، ''علی گڑھ کے سفر کی جسمانی وعلمی فتوحات''، ''استدراک: پروفیسر ریاض الرحمان خان شروانی'' شامل ہیں۔ان مضامین میں ''تسلط ہے دنیا پہ دانشوری کا'' غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔جس میں

انھوں نے علم اور اس کی اہمیت پر قرآن وحدیث کے ساتھ مختلف اکابر کے اقوال کی مدد سے مدلل گفتگو کی ہے اور علم کو ایک ایسا زینہ بتایا ہے کہ جس کے بغیر انسان کی ترقی ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے بغیر تو ذات خدا کا کامل عرفان بھی ممکن نہیں ہے۔اس باب میں انھوں نے دینی اور دنیاوی علوم کے سلسلے میں بھی بڑی علمی گفتگو کی ہے۔

''اسلامیات'' کے تحت بھی چار مضامین بہ ترتیب ''ہندوستانی مسلم معاشرے میں طہارت اور پاکیزگی کا مسئلہ''، ''حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور سجدۂ تحیت''، ''تصوف: ائمۂ مجتہدین اور علمائے اسلام کی نظر میں''، ''فتح مکہ: غیر مسلم دانشوروں کی نگاہ میں ہیں''، جن میں دو مضامین ''ہندوستانی مسلم معاشرے میں طہارت اور پاکیزگی کا مسئلہ'' اور'' تصوف: ائمہ مجتہدین اور علمائے اسلام کی نظر میں'' اپنی نوعیت کے منفرد مضامین ہیں۔ پہلے مضمون میں طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے انبیائے عظام کے ذکر سے اپنی تحریر کو مزید توانائی اور قوت بخشی ہے۔دوسرے مضمون میں تصوف کے سلسلے میں ائمہ اور علما کے افکار ونظریات پیش کیے ہیں۔اسلامیات کے تحت ''حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور سجدۂ تحیت'' بھی ایک علمی مضمون ہے۔

''اقبالیات'' کے ذیل میں بھی چار مضامین ہیں جن کی ترتیب یہ ہے: ''علامہ اقبال اور احمدیت''، ''ڈاکٹر اقبال کے چند محل نظر افکار ونظریات''، استدراک (ڈاکٹر سید عبد الباری کے مضمون کے سلسلے میں)''، استدراک (ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی ندوی کے مضمون کے سلسلے میں)''۔ان میں ''ڈاکٹر اقبال کے چند محل نظر افکار و نظریات'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اس مضمون میں انھوں نے علامہ کی شخصیت کے متعلق کئی انکشافات کیے ہیں اور بعض مقامات میں ان کے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ علامہ اقبال اگرچہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی تھے اور اسلام سے گہری وابستگی رکھتے تھے لیکن انھوں نے براہ راست کسی سے کتاب وسنت کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی ۔اگرچہ انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کو جہد مسلسل اور عمل پیہم کی دعوت دی اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا لیکن ان کے نظریات اہل تسنن کے عقائد سے مطابقت نہیں رکھتے۔مثال کے طور پر علامہ اقبال کے اس نظریے کو وہ درست نہیں مانتے کہ نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو ابھی تک انسان نہیں سمجھ سکا ہے۔اس پر انھوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث کی ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نبوت محمدیہ کے فہم وادراک کے بغیر اسلام کی بقا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔لیکن مصنف کے اس خیال سے شاید بہت سے لوگوں کو اتفاق نہ ہو کیونکہ پیغمبر اکرم کی نبوت کی معنویت کا ادراک ہر کس وناکس کے بس سے باہر ہے۔

شخصیات'' کے ضمن میں چھ مضامین ہیں جن میں پانچ مشاہیر بہ ترتیب مولانا حسرت موہانی، پروفیسر مختار الدین آرزو، پروفیسر نذیر احمد، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں سے بعض افراد سے اپنی ملاقات اور ان کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار بڑی سادگی سے کیا گیا ہے جس سے ان کی علمی اور ادبی شخصیت کے خدوخال بحسن وخوبی نمایاں ہوتے ہیں۔

''ادبیات'' کے ضمن میں صرف ایک مضمون ''بیاض تقابلی مطالعے کے آئینے میں'' ہے۔ یہ مضمون

عطا عابدی کی غزلوں کے مجموعے ''بیاض'' پر تعارف وتبصرہ ہے۔ اس میں انھوں نے عطا عابدی کی شاعری پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

تمام مضامین میں مصنف کی وسعت مطالعہ کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، جس سے ان کی علمی ذہانت اور تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ ارباب علم وادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: بکھرے موتی (شعری مجموعہ)

شاعر: شادؔ عباسی

صفحات: 231 قیمت: 100روپے

مقام اشاعت وسال اشاعت: زرنگار کمپوزنگ سینٹر، مدن پورہ، وارانسی، 2014ء

مطبع: زرنگار کمپوزنگ سینٹر، مدن پورہ، وارانسی

تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

اردو کے علمی اور ادبی حلقے میں شاد عباسی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ اب تک ان کی شاعری کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جس سے ان کی ذہانت اور ادبی ذوق وشوق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی منظوم تخلیقات میں لفظ بہ لفظ (نظموں کا مجموعہ)، سفینۂ غزل (غزلوں کا مجموعہ)، بات غزل کی (غزلوں کا مجموعہ)، نوائے فاراں (نعت ومنقبت) شائع ہوکر عوام وخواص میں مقبولیت کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ ''بکھرے موتی'' ان کی شاعری کا پانچواں مجموعہ ہے جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات اور فارسی کلام شامل ہے۔

موصوف ایک شاعر ہونے ساتھ ساتھ اچھے ادیب، محقق، تاریخ نگار، سماجی کارکن اور دانشور بھی ہیں اور شعرگوئی کے ساتھ ساتھ بہترین نثر لکھنے پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مدن پورہ کی انصاری برادری۔ سماجی پس منظر (دوجلدیں اور تیسری جلد زیر ترتیب) کو کافی شہرت نصیب ہوئی۔ یہ کتاب یہاں کی انصاری برادری کا ایک تاریخی دستاویز ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''بکھرے موتی'' جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ غزلوں، نظموں، قطعات اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کے شروع میں ''اقتباس تاثر'' کے عنوان سے شادؔ عباسی کے سلسلے میں مولانا مقتدیٰ حسن ازہری کے تاثرات شامل ہیں، جس میں انھوں نے ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ اس کے بعد ''اعتراف'' کے عنوان سے ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کی تحریر بھی قابل مطالعہ ہے۔ جس میں موصوف نے شادؔ عباسی کی شاعری پر مختصر مگر جامع بحث کی ہے، اس ضمن میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ شادؔ عباسی کی شاعری کسی

خاص تصور، ازم اور فلسفے کی تابع نہیں ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات سے متاثر ہونے کے باوجود آزاد ہوکر اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد ''بکھرے موتی میری نظر میں'' کے عنوان سے پروفیسر سید حسن عباس نے شاد عباسی کی شاعری کے حوالے سے چند اہم نکات بیان کیے ہیں اور اس مجموعے کا کلی جائزہ پیش کیا ہے۔

شعری سلسلے کے آغاز سے پہلے ''گہر شناسوں سے'' کے تحت شاد عباسی نے اس مجموعے کی ترتیب وتنظیم کے سلسلے میں کچھ باتیں ذکر کی ہیں اور شاعری کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اصناف کے تعلق سے بات کی جائے تو میں پابند شاعری کا قائل ہوں، اس میں بھی اولیت اوزان کو دیتا ہوں'' ص 27

زیر نظر مجموعہ مناجات سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں غزلیات، رباعی، ثلاثی، قطعات اور نظمیں جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اپنی اثر آفرینی اور دل پذیری کی وجہ سے دلوں میں اپنی جگہ بنالیتی ہیں۔ لہجہ نہایت لطیف اور نازک ہے، انھیں الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں بھی مہارت حاصل ہے اور اپنے مافی الضمیر کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھیں ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار وروایات دل وجان سے عزیز ہیں، اس سلسلے میں وہ بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی میں پائی جانے والی بے چینی، بدامنی اور عدم مساوات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک قلم بہ کف مجاہد کی حیثیت سے آزادی فکر وخیال کا علم بلند کررکھا ہے اور جبر واستبداد کو للکارا ہے کہ سفاک، ظالم وجابر موذی اور استحصالی قوتیں اپنے انجام سے غافل ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ آنے والی نسل ہماری روایت کی پاسدار بھی ہوگی اور حامی بھی۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

یہ جانتا ہوں کہ اس رہ میں جان دینا ہے — مگر تجھے میرے حق میں بیان دینا ہے
جو بے زبان ہیں ان کو زبان دینا ہے — کچھ اپنے بعد کی نسلوں کو جان دینا ہے
الٰہی حرف و نوا کا شعور دے مجھ کو — عجم کو نغمۂ اردو زبان دینا ہے

ان کے قطعات، رباعیات اور نظمیں بھی زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کرتی ہیں۔ زبان وبیان پر بھی خلاقانہ قدرت رکھتے ہیں اور عروض پر دسترس بھی۔ غرض انھوں نے اپنی شاعری میں جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات کو جس فنی مہارت اور خلوص سے الفاظ کے پیکر میں ڈھالا ہے وہ انھیں ایک نہ ایک دن ادب میں مقام ضرور دلائے گا۔

کتاب دیدہ زیب ہے۔ زرنگار کمپوزنگ سینٹر، باگڑ بلی، مدن پورہ، وارانسی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ امید ہے کہ شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں
مرتب: ڈاکٹر شمس بدایونی
صفحات: 300 قیمت: 300روپے
مقام اشاعت وسال اشاعت: مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، سیوان/ 2016ء
مطبع: ڈائمنڈ پرنٹرز، نئی دہلی

تبصرہ نگار: سید حسن سردار، جے این یو، نئی دہلی

زمانے کا دستور ہے کہ لوگ کسی شہرت یافتہ شخصیت کو دیکھ کر اس کے آثار کو جمع کرتے، جانچتے اور پرکھتے ہیں اور ان کے دوستوں سے آنکھیں موند کر رہ جاتے ہیں جس کی بدولت ایک شخصیت منزل عروج تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح جہان علم و دانش میں بھی یہ شاذ و نادر ملتا ہے کہ ایک تجربہ کار محقق کسی محقق یا ادیب کی ابتدائی تحریروں کو جمع کر کے زیور ترتیب سے آراستہ کرے۔ شمس بدایونی کا شمار ایسے ہی ممتاز محققین میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شمس بدایونی اردو ادب کی ایک مایہ ناز شخصیت اور آفاقی شہرت کے حامل ہیں۔ موصوف اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کی وجہ سے اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کی دیگر ادبی مصروفیات کے علاوہ احیائے زبان وادب کی کاوش بھی لائق تحسین ہے۔ ان ہی علمی اور ادبی کوششوں میں سے ایک بے نظیر کوشش ''حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں'' کی شکل میں سامنے آئی۔

ڈاکٹر شمس بدایونی کی محنت و مشقت درود وستائش کی مستحق ہے کہ انھوں نے بڑی لگن سے اس کتاب کو ترتیب دے کر اس کے خط کو عصر حاضر کے علمی تقاضوں کے مطابق سنوارا اور تحقیقی حواشی سے اس کی سند کو مزید مستحکم بنایا ہے۔ مرتب نے جدید رسم الخط میں متن، ترتیب الفاظ، ہجری سنوں کو عیسوی سنوں سے مطابقت، حوالے، قلابین اور ویرگول وغیرہ کو شامل کتاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو شمس صاحب نے کتاب کو تحقیقی حواشی، اصلاح نثر اور تصحیح اغلاط جیسے تحقیقی زیورات سے مزین کیا ہے۔ مرتب کے اہم کاموں میں سے ایک کام حاشیہ لکھنا بھی ہے، کیونکہ متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں کبھی مصنف تردد کا شکار نظر آتا ہے تو کبھی اختلاف نسخ کی وجہ سے بات بدرجہ کمال کو نہیں پہنچ پاتی، تو کبھی مصنف کی جانب سے کوئی شے ادھوری رہ جاتی ہے جس کو مکمل کرنا مرتب کا ادبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شمس بدایونی نے نہ فقط ان نکات کو ملحوظ خاطر رکھ کر حواشی لکھے بلکہ مفہوم اور مضمون مقالہ کو بھی بدرجہ کمال تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے کہ کتاب کے پہلے مضمون ''نسیم اور ان کی مثنوی'' میں مصنف اس مثنوی کی سب سے پہلی طباعت کے بارے میں تردد کے شکار نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں ''گلزار نسیم پہلی مرتبہ کس مطبع سے شائع ہوئی اس سلسلے میں کوئی قابل وثوق رائے نہیں ملتی، میں نے اس مثنوی کے قدیم ترین ایڈیشن کی بہت تلاش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی، البتہ سال گزشتہ ردی کے ایک ذخیرے

میں ایک قدیم نسخے کے چند آخری اوراق میری نظر سے گزرے جو نہایت بوسیدہ حالت میں تھے۔ غالباً یہ دوسرا یا تیسرا ایڈیشن ہوگا جو مطبع حسنی واقع محمود نگر لکھنو سے ۱۲۶۰ھ میں مصنف کی تصحیح کے بعد شائع ہوا۔'' ص ۳۵

یہاں مصنف کو ایک دریافت شدہ نسخہ مطبوعہ میں دو چیزوں میں تردد نظر آتا ہے ایک نوبت طباعت اور دوسرا اسم مطبع جو کہ واقعاً قارئین کے لیے مرحلہ غور وخوض ہے۔ لہٰذا اس کمی کو مرتب نے اپنی تحقیق سے واضح کیا جیسا کہ وہ گلزار نسیم پر لکھے گئے رشید حسن خان کے مقدمے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''یہ دراصل طبع اول ہی تھا جو مطبع حسنی لکھنو میں چھپ کر شائع ہوا تھا، مادہ تاریخ درست لکھا تھا''۔ ص ۴۷

اسی طرح نسخوں کے اختلاف کی وجہ سے چند اشعار کے کچھ الفاظ میں اختلاف رونما ہوا مثلاً کسی نسخے میں 'کی' ہے۔ تو کسی میں 'کے' وغیرہ، تو مرتب نے بہت باریک بینی کے ساتھ ان نسخوں کے اختلاف کا تجزیہ کیا اور پھر ان پر انجام شدہ تحقیقات کو بھی ملحوظ خاطر رکھ کر اصل مضمون میں واقع ہونے والی اغلاط کی تصحیح فرمائی ہے۔ مثلاً پہلے مضمون 'نسیم اور ان کی مثنوی' میں چند نمونے موجود ہیں۔ ص ۸۳ پر یہ شعر حنیف نقوی نے اس طرح لکھا:

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ نظارہ کیا پیر کا ناگاہ

اس کی تصحیح میں مرتب رشید حسن خان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ 'نظارہ کیا پدر نے ناگاہ' یہاں وہ 'کا' کی جگہ 'نے' کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی مضمون میں ایک مثال اس طرح ہے:

صادر آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی بینائی کے چہرے پر نظر کی

حنیف نقوی نے اس شعر کے مصرع اولی میں 'کی' استعمال کیا ہے۔ مگر مرتب نے حاشیہ گزاری کرتے ہوئے 'کے' کے بجائے 'کی' کو ترجیح دیا ہے جو کہ رشید حسن خان کی تحقیق پر منحصر ہے۔ شعری تفاوت اور مصنف کے شبہات وتردد کے علاوہ کچھ دیگر اغلاط بھی مضمون میں پائی جاتی ہیں جن کو مرتب نے بہت ہی خوبصورتی سے درست کیا ہے مثلاً حنیف نقوی مثنوی گلزار نسیم کو لے کر معرکہ عبدالحلیم شرر اور چکبست کے نتیجے میں جو مضامین کا مجموعہ وجود میں آیا۔ اس کا نام حنیف نقوی نے ''معرکہ شرر و چکبست'' لکھا ہے۔ (ص ۴۵) مگر مرتب نے اس کتاب کا مکمل اور صحیح نام "مباحثہ گلزار نسیم یعنی معرکہ چکبست وشرر" تحریر کیا ہے۔

شمس بدایونی حنیف نقوی کو کافی سراہتے ہیں نہ فقط اس وجہ سے کہ وہ دوسروں کے لیے سادہ نثر میں لکھتے تھے بلکہ حنیف نقوی کی 'احتیاط پسندی' بھی قارئین کے لیے ایک جدید باب تفکر کھول دیتی ہے۔ ویسے تو یہ ایک ظریف نقطہ ہے مگر مرتب کی دوربین آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکا، لہٰذا وہ حنیف نقوی کے تعارف حالی والے مضمون میں اسی نقطہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں حنیف نقوی لکھتے ہیں۔ 'عزت بخش نامی ایک بزرگ کے یہاں ۱۸۳۷ء میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا'۔ (ص ۵۷) یہاں شمس بدایونی حنیف نقوی کی اس طرز پر اس طرح لکھتے ہیں 'قاضی عبدالودود کے مضمون 'اصول تحقیق' کا مشہور جملہ یاد آ گیا۔ مرزا غالبؔ ۸/رجب کو پیدا ہوئے۔ ۸/رجب کو پیدا ہونے والا غالبؔ نہیں ایک بچہ تھا جو بغیر تخلص کے دنیا میں وارد ہوا تھا'۔ گویا حنیف نقوی ادبی سفر کے ابتدائی دور میں ہی

زبان و بیان کے استعمال میں احتیاط پسندی کا مظاہرہ قاضی صاحب کے اختیار کردہ اصول تحقیق کے عین مطابق نظر آتا ہے۔(ص ۶۸)

۱۔نقوی صاحب نے غالبؔ کے خطوط کا زمانہ آغاز ۱۸۵۰ء لکھا ہے۔(ص ۴۸) مگر شمس بدایونی کے نزدیک یہ سلسلہ ۱۸۵۰ء سے دو تین سال قبل شروع ہو چکا تھا۔اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ترتیب کے فرائض پر عمل کرتے ہوئے ہر چیز کو من وعن قارئین کے حوالے نہیں کیا بلکہ ان کو پیمانہ تحقیق پر پرکھ کر صحیح چیز کو آگے بڑھایا۔البتہ غالبؔ کے خطوط کے حوالے سے وہ بھی صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں کہ بعد میں حنیف نقوی بھی آغاز خطوط کے سلسلے میں اپنے نظریہ سے اختلاف رکھتے ہوں گے البتہ میں ان کی تحریر سے فی الوقت ثبوت فراہم کرنے سے قاصر ہوں۔جب وہ ثبوت فراہم نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ اپنے نظریہ کو کسی دوسرے پر نافذ بھی نہ کرتے۔

۲۔حنیف نقوی صبا کے بیٹے نکہت کے احوال میں یہ شعر نقل کرتے ہیں:

تاسحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادصبا   یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک

(ص ۱۱۳)

اس مصرع کی تصحیح کرتے ہوئے مرتب اس طرح لکھتے ہیں:

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے،او باد صبا

(ص ۱۱۹)

اغلاط کی تصحیح کے علاوہ کچھ مقامات پر مصنف نے اپنے نظریے کو پیش کیا ہے،مگر وہاں وہ دلیل پختہ لانے سے قاصر رہے ہیں۔مگر مرتب کی تحقیق میں اگر مصنف کا گمان محقق پایا ہے تو اس کو مزید دلیل سے مستحکم کر دیا ہے مثلاً حنیف نقوی اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

آخر گل اپنی صرف در میکدہ ہوئی   پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

حنیف نقوی کہتے ہیں کہ گمان غالب یہ ہے کہ یہ شعر جہاندار شاہ کا ہے۔مرتب اس گمان کو تقویت دیتے ہوئے لکھتے ہیں 'حنیف نقوی کا گمان درست ہے یہ شعر جہاندار شاہ جہاندارؔ (ف ۱۷۸۸ء)ہی کا ہے۔' (دیکھیے دیوان جہاندار،مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی،مجلس ترقی ادب،لاہور،ص ۱۲۴)مصرعہ دوم کے متن میں فرق ہے۔اس کی صحیح صورت یہ ہے:

پہنچی وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر تھا

شمس بدایونی کا حلقہ عاشقان ادب ہمیشہ شکر گزار رہے گا کہ انھوں نے اس ادبی سرمایے کو زندگی بخشی اور اسے تشنگان علوم کے لیے مایہ تسکین قرار دیا۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: ترقی پسند اردو افسانہ میں عورت کی عکاسی

مصنف: اشرف لون

صفحات: 216 قیمت: 200روپے

مقام اشاعت وسال اشاعت: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6/2013

مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی-6

تبصرہ نگار: مشہود رضا، جے این یو، نئی دہلی

عورت سماج کا آئینہ ہے جس کے توسط سے نسل انسانی آگے بڑھتی ہے۔عورت تین مراحل سے گزرتی ہے بیٹی،زوجہ اور ماں۔ان مراحل میں سماج پرست افراد کی بے جا تنقیدوں اور غیر منصفانہ رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔عورتوں کے مسائل فقط ہندوستان تک محدود نہیں ہیں بلکہ عالمی پیمانے پر رونما ہونے والی عورت کی چیخ و پکار نے لوگوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ مسائل نسواں کے لیے اپنی آواز بلند کریں۔لہٰذا دنیائے ادب نے اپنے ادبی شہ پاروں میں عورت کی داستان چھیڑی۔

جب کبھی سماج یا معاشرے نے حقوق کی پائمالی کی یا غلط راستہ اختیار کیا تو ادبا اور شعرا نے اپنے قلم کے ذریعہ سے افسانوں،ناولوں،ڈراموں اور نظموں میں بہت ہی نپے تلے انداز میں نصیحت آمیز اور منصفانہ گفتگو کی۔ہندوستان میں سرسید کی علی گڑھ تحریک نے ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم سے روشناش کرایا اور اس نے تعلیم کے حوالے سے بھی کافی بیداری پیدا کی حالانکہ سرسید کی بڑی شدت سے مخالفت ہوئی۔اس کے بعد ہندوستان میں ایک بڑی تحریک ابھر کر سامنے آئی جسے ترقی پسند تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے جن مسائل سے بحث کی ان میں سے ایک مسئلہ عورت کا بھی ہے۔زیر نظر کتاب ''ترقی پسند اردو افسانہ میں عورت کی عکاسی'' جناب اشرف لون کی تخلیق ہے۔ان کا تعلق کشمیر کی وادی سے ہے جسے دورۂ قدیم میں ایران صغیر کے نام سے جانا جاتا تھا۔یہ کتاب ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور پانچ ابواب پر تقسیم کی گئی ہے۔اس تقسیم میں ذیلی ابواب بھی شامل ہیں۔

باب اول ''جدید ہندوستانی سماج میں عورت'' کو تین ذیلی عنوانات میں مقرر کر کے ہندوستان میں عورت کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے اور قدیم ہندوستان میں عورت کے مقام و مرتبہ کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔۱۸۵۷ سے لے کر اب تک عورت کے بدلتے ہوئے حالات پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے عورتوں کے حالات میں کافی سدھار ہوا،عورتوں کو اپنے حقوق کا احساس ہوا اور اس کے حصول کے لیے باقاعدہ انجمنوں کا قیام عمل میں آیا اور ان کو مردوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔تقسیم ہند کے

بعد عورتوں کو جن مسائل سے دو چار ہونا پڑا، اس کا بھی اس باب میں اشارہ ہے۔تحریک آزادی میں عورتوں کی شمولیت نے انھیں مردوں کے برابر حقوق دلایا، نیز مصنف نے اس باب میں ہندوستان میں موجودہ دور میں عورتوں کے لیے جو ایکٹ بنائے گئے ہیں ان پر بھی تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔دوسرا باب ’’ماقبل ترقی پسند اردو افسانہ میں عورت‘‘ کے عنوان سے ہے۔اس باب کے ضمنی عنوانات کے تحت ترقی پسند افسانہ سے پہلے ادب لطیف کے افسانے میں عورت کی عکاسی اور نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

باب سوم ’’اردو ادب میں ترقی پسند تحریک‘‘ ہے۔اس میں ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے رجحانات کا تجزیہ اور اس کے آغاز کے اسباب کا ذکر ہے۔مصنف کا ماننا ہے کہ غدر کے بعد اردو ادب میں سرسید، حالی اور آزاد وغیرہ کے رجحانات ترقی پسندی کی علامت ہیں۔ساتھ ہی اس میں ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز اور اس کی مختصر تاریخ نیز ترقی پسند نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔

باب چہارم میں ترقی پسند افسانہ میں عورت کے مختلف روپ اور تحریک کے نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ اور دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں عورت کی عکاسی، مردوں کے بدلتے ہوئے روپ کو بھی دکھایا گیا ہے۔

باب پنجم میں افسانے کے اجزائے ترکیبی اور اس کے فن پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔کردار نگاری افسانے کا ایک اہم جز ہے جس کا افسانہ کے فن کو متحرک کرنے میں اہم حصہ ہوتا ہے۔اگر کردار بے جان ہوں تو افسانہ قاری کو متاثر نہیں کر سکے گا۔اس باب میں ترقی پسند افسانہ میں عورت کو بحیثیت مرکزی کردار پیش کیا گیا ہے اور نمائندہ افسانہ نگاروں کی کردار نگاری، انداز بیان اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اختتامیہ میں افسانوں میں عورتوں کے مسائل کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔مصنف کا ماننا ہے کہ اردو ادب میں عورتوں کے حقیقی مسائل کو سب سے پہلے مولوی نذیر احمد نے اپنے ناول میں پیش کیا۔ادب لطیف کے توسط سے ہندوستانی افسانہ نگاروں نے عورتوں کے مسائل کو جگہ دی۔عورتوں کو جن مسائل کا سامنا قدیم دور میں تھا آج بھی وہ ان سے دو چار ہیں۔خواہ جنسی ہوں یا سیاسی یا دیگر حصہ داری کے معاملات۔

مصنف اس بات کے قائل ہیں کہ عہد حاضر کے افسانہ نگاروں نے بھی عورت کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن ان کے افسانے ترقی پسندوں کے ہم پلہ نہیں ہیں اور یہ مصنف کی منصفانہ تنقید ہے۔ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس فن کو شہرت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔مصنف نے اپنے افکار ونظریات کو بیان کرنے میں نہایت سلیس اور سادہ زبان استعمال کی ہے جو تنقید کے لیے نہایت موزوں ہے۔امید ہے کہ حلقۂ ادب میں یہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: کلاسیکی نثر کے اسالیب

مصنف: ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

صفحات: 224 قیمت: 200روپے

مقام اشاعت وسال اشاعت: کتابی دنیا، دہلی-6/2010

مطبع: ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

تبصرہ نگار: سراج احمد، دیوڑھی، داؤد پور، زمانیہ، غازی پور، یوپی

پیشِ نظر کتاب اردو کی قدیم نثر پر ایک مبسوط اور مدلل تصنیف ہے۔اس میں کل گیارہ مضامین ہیں، جن کے عناوین ہیں: نثر کا فن، اسلوب: تعریف وتوضیح، داستان: تہذیبی ومعاشرتی اہمیت، سب رس کا ماخذ وتہذیبی پس منظر، نوطرزِ مرصع کا اسلوب، فورٹ ولیم کالج اور میر امن کی باغ و بہار، فسانۂ عجائب: تہذیبی ومعاشرتی مطالعہ، اٹھارہویں صدی کے نثری اسالیب، اردو کا قدیم تنقیدی سرمایہ، سرسید اور علما کے اختلافات اور حالی کی اولین نثری تصنیف۔علاوہ ازیں کتاب میں پروفیسر عتیق اللہ کا ایک مختصر مضمون اور مصنف کا اعتراف نامہ بھی شامل ہے۔

قدیم ورثے پر قلم فرسائی کرنے والے ادبا عموماً محقق کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کی جن کاوشوں کو دنیائے ادب میں شرفِ قبولیت حاصل ہے ان میں بعض تحقیقی ہیں۔ان کی پہلی تصنیف ’’مولود شریف (حالؔی) تعریف وتحشیہ‘‘ ہے۔زیر نظر کتاب کلاسکی نثر کے اسالیب پر مبنی ہے۔موصوف کی تلاش وجستجو کی بنا پر پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مختصر مضمون میں ان کا شجرہ اردو کی پیش رو نسل کے محققین سے ملایا ہے۔

اسلوبیات ایک مشکل اور محنت طلب موضوع ہے۔جدید نثری اصناف کے اسالیب پر بھی بہت کم مضامین یا کتابیں دستیاب ہو پاتی ہیں۔لیکن جس باریک بینی اور تجزیاتی روِش پر کلاسیکی ادب کے حوالے سے نثر کا فن اور اسلوب کی تعریف وتوضیح کی گئی ہے، قابلِ تعریف ہے۔کتاب کے پہلے مضمون ’’نثر کا فن‘‘ میں نثر کی اقسام کے متعلق مواد طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔کتاب میں مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے مفکرین کی آرا درآئی ہیں جن سے بات میں وزن اور تحریر میں خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے۔

جس صنف یا موضوع پر مضامین تحریر کیے گئے ہیں ان سے اردو کے ہر طلبہ وطالبات کا سابقہ ایم۔اے۔کی کلاس میں پڑتا ہے۔داستان کے پرچے میں زیرِ نظر کتاب کافی مددگار ثابت ہوسکتی ہے، کیوں کہ جن داستانوں کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے ان میں باغ وبہار، فسانۂ عجائب اور سب رس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔سرسید اور ان کے رفقا کے کارنامے اکثر وبیشتر طلبہ کی زبان پر ہوتے ہیں لیکن مصنف نے سرسید اور علما کے جن اختلافات کو اپنی تصنیف میں شامل کیا ہے دیگر کتابوں میں یکجا نہیں ملتے۔اٹھارہویں صدی کے نثری اسالیب، حالؔی کی اولین نثری تصنیف اور اردو کے قدیم تنقیدی سرمایے پر مضامین تحریر کر کے ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے اساتذہ اور طلبہ دونوں کی مشکلات کو آسان کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆